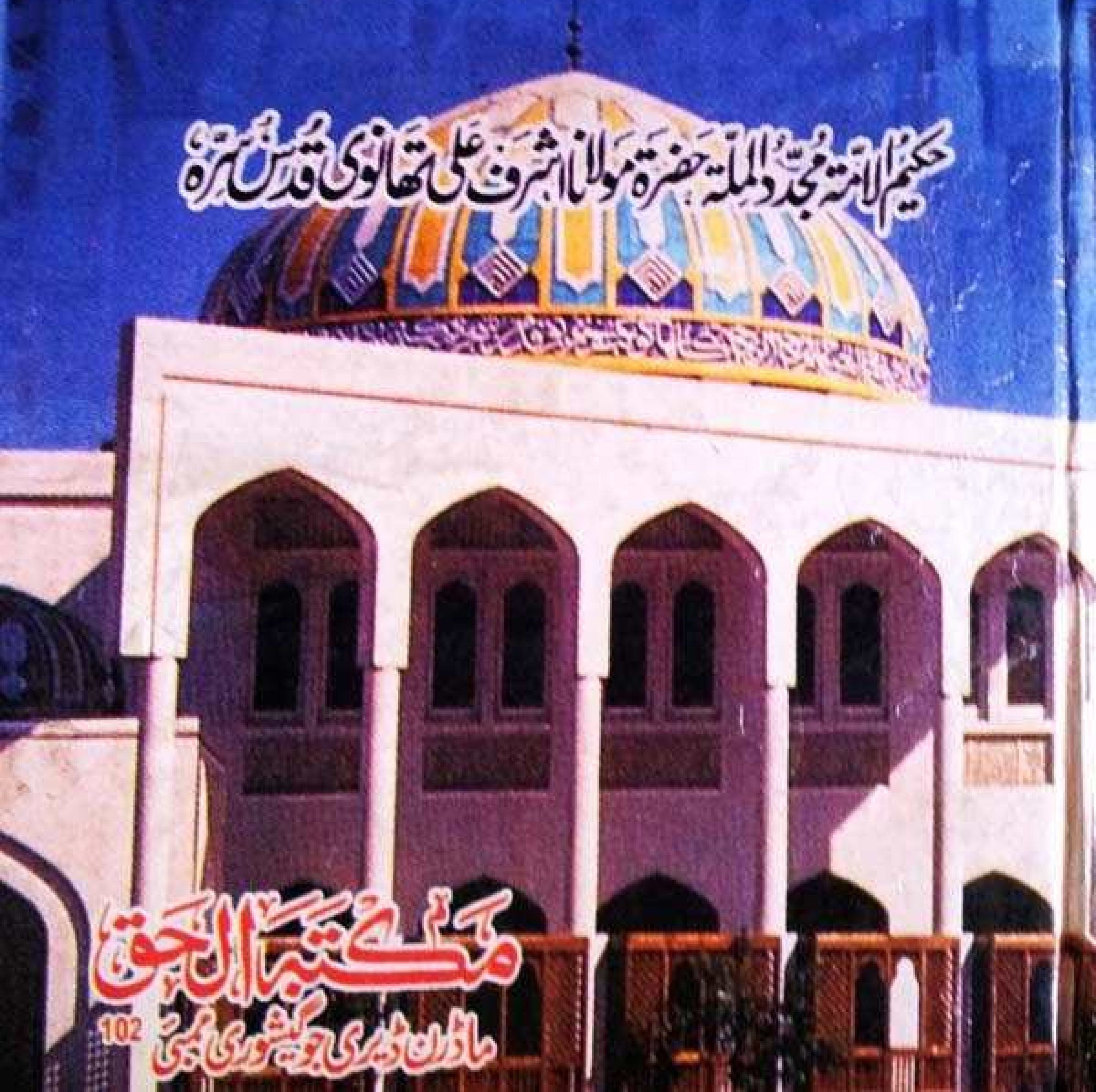
شریعت و طریقت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ



مکتبۃ الحق
102 ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئی

ایک ضروری گزارش

اس کتاب کو ای بُک بنانے میں ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ کوئی اللہ کا مخلص بندہ اس کو پڑھ کر ہدایت پا جائے اور ہمارے لئے مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔

جن پبلشرز حضرات کی کتاب کو بغیر اُنکی اجازت کے ہم نے یہ کیا ہے ان سے عاجزانہ گزارش ہے کہ اللہ کے لئے ہم کو معاف کر دیں، اللہ سے قوی امید ہے کہ انشاءاللہ قیامت میں آپ کو اس کا بدلہ آپ کی توقع سے زیادہ دیکر آپ کو خوش کر دے گا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ خلفاء کرام کی پسندیدہ کتاب

أشرف الطریقة في الشریعة والحقیقة

شریعت و طریقت

مجدد الملۃ حکیم الامۃ حضرۃ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ

ترتیب: جناب مولانا محمد دین صاحب چشتی اشرفی مدظلہم

اپنی اصلاح کی فکر رکھنے والوں کے لیے ایک اہم دستور العمل
شریعت اور طریقت سے متعلق حضرت حکیم الامت کی
مجددانہ تعلیمات پر مشتمل شاہکار کتاب

مکتبۃ الحق
ماڈرن ڈیری، جوگیشوری، ممبئی ۱۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلات

نام کتاب : شریعت وطریقت

تالیف : حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

ترتیب : جناب مولانا محمد دین صاحب چشتی اشرفی مدظلہم

صفحات : ۴۴۸

قیمت :

باہتمام : محمد ارشد قاسمی

ناشر : مکتبہ الحق ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئ ۱۰۲

ملنے کے پتے

● دارالکتاب دیوبند ● سنابل کتاب گھر دیوبند

● مکتبہ عکاذ دیوبند

انتساب:

اس کتاب کو میں حکیم الامّت، مجدد الملّت جامع الشریعت والحقیقت امامِ اہلِ سنت والجماعت حضرت مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رح قدس سرہ کے اسمِ گرامی سے معنون کرتا ہوں کہ جن کی برصغیر میں، سویہ اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے سنہری خدمات، تا بہ ابد، چہار دانگِ عالم کو لافانی روشنی بخشتی رہیں گی۔

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

ہمارے لیے یہ انتہائی سعادت کی بات ہے کہ علمائے حق کی مقبول عام تصانیف کی دوبارہ نشرواشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق عطا فرمائی۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی یہ کتاب ہے جو شریعت اور طریقت کے نام سے آپ کے سامنے پیشِ خدمت ہے۔ یہ کتاب اس سے قبل اگرچہ کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ مگر سابقہ سائز اور اندازِ کتابت کے ناموزوں ہونے کی وجہ سے ضرورت تھی کہ اس کا جدید ایڈیشن نئے انداز سے طبع کرایا جائے۔ جس میں سابقہ غلطیوں کی بھی حتی الامکان تصحیح کی جائے۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت مصنف مدظلہم کی خصوصی اجازت کے ساتھ یہ نیا ایڈیشن پیش خدمت ہے امید ہے اس طباعت سے اس کا نفعِ عام اور مزید عام ہوگا۔

کتاب کی تعریف سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے کیونکہ حضرت تھانوی قدس سرہ کے تمام خلفاء اس کتاب کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ جیسا کہ تقریظات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے واللہ نسأل السداد والتوفیق

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

خواستگارانِ دعا : شکیلِ انجم، جمیلِ انجم

فہرست مضامین

تقریظات

اور

اکابر اہلسنّت والجماعت کے تاثرات

(۱)

شیخ وقت حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس اللہ سرّہ

(۲)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہ

(۳)

حضرۃ الشیخ حضرت مولانا خیر محمد صاحب ۔ برّد اللہ مضجعہٗ

(۴)

استاذ الشیوخ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی قدس سرّہ

(۵)

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیمبلپوری طاب ثراہ

(۶)

حضرت علامہ محمد یوسف شاہ میرواعظ کشمیر رحمۃ اللہ علیہ

(۷)

جناب ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی

(۸)

جناب مولانا عبد الماجد دریا آبادی (صدق جدید لکھنؤ)

(۹)

جناب مولانا سید انظر شاہ صاحب کاشمیری (دار العلوم دیوبند)

اکابر اہلسنّت والجماعت کے تاثّرات

(۱)

از عالیجناب قدوۃ السالکین، عارف باللہ، جامع الشریعت والطریقت برہانِ حقیقت و معرفت، مخدوم العلماء والفضلاء، شیخ المشائخ سیدنا و مرشدنا مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور خلیفہ ارشد حضرت مجدد الملت حکیم الامت الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہدیہ مبارکہ اشرف الطریقت (المعروف بہ شریعت اور طریقت) کے چند صفحات دیکھے۔ دل بہت خوش ہوا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ کسی تقریظ کا محتاج نہیں بلکہ اس کتاب پر تقریظ خلافِ ادب ہے۔ آفتاب کو تائید کی ضرورت نہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرمائیں اور اہلِ اسلام کے لیے ذریعۂ قرب فرمائیں اور آپ کے لیے ذریعہ قرب اور صدقہ جاریہ فرمائیں۔ یہ کتاب ہر مولوی و سجادہ نشین تک پہنچ جائے تو انشاء اللہ مفید ہو گی۔"

(۲)

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہٗ

عزیز م محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"آپ کی مرسلہ کتاب مجھے وصول ہو گئی تھی دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی مگر سرسری دیکھ سکا خیال تھا کہ ذرا تفصیلی مطالعہ کے بعد آپ کو خط لکھوں گا لیکن میں اس تمام عرصہ میں کچھ پریشانیوں میں مبتلا رہا میری بڑی لڑکی سخت بیمار تھی وہ ۲۸ شعبان ۷۵ھ کو سات بچے چھوڑ کر انتقال کر گئی۔ ان حوادث کی وجہ سے معمولی ڈاک کا جواب بھی نہیں لکھ سکا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا

فرمائے کہ آپ نے حضرت کے مواعظ اور خاص مضامین کا عطر نکال کر رکھ دیا
اللہ تعالیٰ قبول فرمائے" ۔ آمین

۸/۱۰/۷۵ والسلام
محمد شفیع عفی عنہ

(۳)

از عالیجناب امام العارفین، قدوۃ السالکین، حامی سنت ماحی بدعت خلیفہ ارشد حضرت مجدد الملت التھانویؒ سیدنا و مولانا خیر محمد صاحب جالندھری دام فیوضہم مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان، و حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مفتی خیر المدارس ملتان۔

"شریعت اور طریقت" علم تصوف میں بے نظیر کتاب ہے اس کے تمام مضامین حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کی تصانیف اور ملفوظات سے ماخوذ ہیں۔ مولانا محمد دین صاحب نے اس مبارک کتاب میں پہلے شریعت پھر طریقت و معرفت پھر ان کا باہمی فرق بتلا دیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے جو عام طور پر مشہور ہے کہ شریعت اور طریقت دو متضاد امر ہیں۔

اس کے بعد تصوف کی ضرورت (سلوک اور طریقت کی اقسام) وغیرہ بڑی تفصیل سے ذکر فرمائی ہے۔ تیسرے نمبر پر بیعت کی ضرورت اور اس کا ثبوت احادیث سے اور دلائل عقلیہ سے شیخ کامل کی پہچان، شیخ اور مرید کے درمیان مناسبت اور صحبت شیخ کی ضرورت اور اس کا طریق کار بیان فرمایا ہے۔ "چوتھا حصہ" کتاب کا نہایت اہم ابواب پر مشتمل ہے اس میں تین ابواب ہیں۔ باب اول میں ریاضت و مجاہدہ کی حقیقت اور متعلقات کا ذکر ہے۔ باب دوم میں اخلاق حمیدہ کی تفاصیل اور ان کے حاصل کرنے کے لیے عمدہ عمدہ طریق اور آسان تدابیر بیان فرمائی ہیں۔ تیسرے باب میں اخلاق ذمیمہ (کبر، حسد، عجب وغیرہ) کی حقیقت اور ان سے بچنے اور علاج کے طریق بیان کیے گئے ہیں۔ پانچویں حصے میں ثمرات اعمال اور اس کے متعلقات چھٹے حصے میں ذرائع اعمال مفیدہ بلا خطر و مع خطر پوری تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد احوال و معارف و حقائق۔ اصطلاحات تصوف اور سب سے آخر میں بہت ہی ضروری

مسائل تصوف اور وصایا، جامعۂ بزرگان پر اس کتاب کو ختم کر دیا ہے۔ یہ درۂ نادرہ اہل علم اور اہل سلوک کے لیے بہترین ذخیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ افادات حضرت تھانویؒ کے فیوض کو تاقیامت جاری وساری رکھے اور مولانا محمد دین صاحب ظلہٗ کو جزائے خیر دے جنہوں نے یہ خدمت انجام دی ہے۔ عبداللہ غفراللہ لہٗ

"کتاب شریعت اور طریقت کے متعلق جو کچھ حضرت مولانا عبداللہ صاحب مفتی خیر المدارس ملتان نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ مشتے از خروارے اظہار واقعہ ہے۔ اصل لطف مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ کہنے پر ضمیر مجبور ہو گا "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" میرے نزدیک ہر عالم و عامی کو چاہیئے کہ اس کو حرزِ جاں بنائے اور فہم و عمل کے ذریعہ نورِ باطن میں ترقی دے۔ حق تعالیٰ اس کے مرتب و ناشر مولانا محمد دین صاحب سلمہ کو جزائے خیر دے آمین۔ احقر خیر محمد عفی اللہ عنہ

(۴)

از عالیجناب اکمل الکاملین، حامل لواء الشریعت والطریقت۔ استاذ العلماء والفضلاء حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی شیخ الحدیث دار العلوم اسلامیہ اشرف آباد (ٹنڈو اللہ یار) سندھ۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا ہدیہ "شریعت اور طریقت" موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ ابھی تک پوری کتاب کا مطالعہ تو نہیں ہو سکا۔ مگر جابجا دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ ماشاء اللہ کتاب بہت جامع اور نافع ہے۔ آپ نے بڑی محنت سے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی تصانیف و مواعظ سے بہترین انتخاب فرمایا اور مسلمانوں کو قیمتی خزانہ تلاش کر کے بہم پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور امت اسلامیہ کو اس کی قدردانی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق ارزانی ہو۔ والسلام مکرر مبارکباد قبول فرمائیں۔

ظفر احمد عفا عنہ (عثمانی تھانوی)

دار العلوم الاسلامیہ اشرف آباد۔ ٹنڈو اللہ یار، سندھ ۱۳ رجب ۸۵ھ

(۵)

تقریظ لطیف از عالیجناب عارف باللہ رہبر کامل، جامع الشریعت والطریقت خلیفہ ارشد مجدد الملت حکیم الامت التھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ جناب مخدومنا و مولانا عبد الرحمن صاحب کیمبلپوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور حال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ہدیہ متبرکہ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے دین کا بہت بڑا کام کیا ہے۔ بہت سے متفرق یاقوت اور جواہر جمع فرما دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائیں۔ بعض بعض مقامات سے میں نے اس مجموعۃ الجواہر کو دیکھا نہایت مفید پایا۔ احقر کے نزدیک کیا بلکہ ہر متدین انسان کے نزدیک یہ علمی ذخیرہ نہایت ہی مفید اور قابلِ قدر ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین پر خصوصیت کے ساتھ بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول اور مفید فرمائیں"۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

دعاگو و دعاجو عبد الرحمن غفرلہ
از بہودی ۱۸/ رجب ۷۵ھ

(۶)

تقریظ لطیف از عالیجناب فخر کشمیر حضرت العلامہ مولانا محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر راولپنڈی "بعد الحمد والصلوٰۃ" میں نے کتاب اشرف الطریقت فی الشریعت والحقیقت (المعروف بہ شریعت اور طریقت) کا مطالعہ کیا۔ یہ کتاب واقعی اسلامی تصوف وسلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے جس کے مطالعہ سے تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس موقع پر لم یکتحل عین الزمان بمثلہ (آج تک اس جیسی کتاب زمانے کی نگاہ میں نہیں آئی) کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ خداوند کریم اس کتاب کے فیوض و برکات کو مسلمانوں میں عموماً و خصوصاً شائع و ذائع فرما کر اس کے مرتب و ناشر کو جزائے خیر عطا فرما دیں"۔

محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر

ے

تقریظ دلپذیر از فاضل اجل، عالم بے بدل عالی جناب ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (عربی) پرنسپل گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی ذاتِ بابرکات اور ان کے علمی تبحر سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے جہاں اپنے روحانی فیض سے لوگوں کو دین مستقیم کی راہ دکھائی وہاں اپنی تصانیف سے بھی ہزاروں گمشدگان راہ کو حق پر لا کھڑا کیا۔ انھوں نے تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں۔ مولوی محمد دین صاحب نے طالبانِ راہ طریقت کے لیے ان تمام مضامین کو جو حضرت مولاناؒ کی مختلف تصانیف میں بکھرے پڑے تھے یکجا کر دیا ہے اور اس طرح قارئین کو متعدد کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ کتاب کی عبارت دراصل حضرت مولاناؒ ہی کی عبارت ہے، لیکن مولوی صاحب نے کہیں کہیں عبارت میں ربط قائم کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ الفاظ بڑھا دیئے ہیں، جنہیں انھوں نے قوسین میں لکھ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کتاب کو حضرت مولاناؒ ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے۔

اس کتاب کے ترتیب دینے میں مولوی صاحب کے پیشِ نظر دو غرضیں تھیں، ایک اپنے شیخ سے اظہار عقیدت اور دوسرے یہ کہ شائقین تصوف زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب میں تصوف کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں بحث نہ کی گئی ہو۔ آج تک جس قدر کتابیں عربی اور فارسی میں تصوف پر لکھی جا چکی ہیں ان میں بہت سے مسائل پر جن کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔ بحث نہیں کی گئی۔ مزید برآں حضرت مولاناؒ کی بعض تصوف کی تصانیف ایک بار چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپیں جس سے یہ خطرہ تھا کہ تصوف کے وہ مسائل جن کی تشریح انہوں نے ان کتابوں میں کی ہیں کہیں معرض خفا میں نہ چلے جائیں۔ چنانچہ مولوی محمد دین صاحب نے حضرت مولاناؒ کے بیان کو بغرض افادۂ عوام اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ ان کا مقصد نہ اظہار علم ہے اور نہ صاحب تصانیف کہلانا۔

مجھے امید ہے کہ شائقین تصوف بالعموم اور مولوی صاحب کے برادران طریقت بالخصوص اس کتاب کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

وانا الراجی لرحمۃ اللہ العبد الفقیر

محمد حسن غفر اللہ لہ ۱۹۷۵/۱۲/۸ھ

تبصرہ

ماہنامہ "صدقِ جدید لکھنؤ" ۱۷ اگست ۱۹۵۶ء

حضرت تھانویؒ فن طریقت پر اتنا کچھ لکھ گئے ہیں کہ اس سے الماریوں کی الماریاں کتب خانوں کی بھری جاسکتی ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ سلیم المذاق شاگردوں یا مسترشدوں میں سے کوئی ہزار ہاہزار صفحات کے اس ضخیم دفتر کو سمیٹ کر حسن ترتیب کے ساتھ چند سو صفحات کے اندر لے آئے۔ خوشی کی بات ہے اور مبارکباد کا مقام ہے کہ اس اہم فرض کو محمد دین صاحب بڑی خوش اسلوبی اور بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ پورا کرگزرے اور ساڑھے پانسو صفحہ کے اندر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ شریعت وطریقت، معرفت و بیعت کی حقیقت، ضرورتِ بیعت، شناختِ شیخ، مناسبتِ شیخ و مرید، ضرورت صحبتِ شیخ، ریاضت و مجاہدہ، ایک طرف فضائل وتواضع، توکل، خشوع، تفویض، تقویٰ وغیرہا، اور دوسری طرف رذائل (حرص، حسد، تکبر، حب جاہ، غصہ وغیرہا) کی تحقیق اوران سب کا طریق کار اور پھر طریقِ تحصیل یا طریقِ علاج، مرقبات اذکار واشغال کی تفصیل۔ اسی طرح تصوف اصطلاحی سے متعلق چھوٹی بڑی بیسیوں بحثیں اور پچاسوں اصطلاحات کی تشریحات غرض کہ ہر ایک متوسط ضخامت کی کتاب گویا تصوّف کے سلسلہ میں معلومات وحقائق کا پورا قاموس ہے جس سے ایک طرف تو واقفیت کامل حاصل ہوتی ہے۔ دوسری طرف شریعت اور طریقت کا تضاد نظر سے دور ہوجاتا ہے اور تیسری طرف طریقت اوران دشواریوں کا مجموعہ نہیں رہ جاتی جو عوام نے اس کے لیے لازمی سمجھ رکھی ہیں۔

مرتب کا شمار مشاہیر اہلِ قلم میں نہیں ان کا نام پہلی ہی بار سننے میں آیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کام اتنا بڑا کر گئے ہیں کہ ان کے حلقہ کے اکابر و مشاہیر کو بھی اگران پر رشک آجائے تو کچھ بے جا نہیں ــــــ کتاب تصوّف کے منکر و معتقد دونوں کے مطالعہ کے قابل ہے۔

(عبدالماجد دریابادی)

تبصــرہ

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند دسمبر ۱۹۵۶ء

احسان وسلوک کے چشم صافی پر بدعات ومحدثات کے ساتھ غلط فہمی اور بدگمانی کی ایک ایسی دبیز اور گرد آلود تہہ بیٹھ گئی ہے کہ صدیوں سے ''دینِ حنیف'' کا یہ شعبہ بحث وتمحیص، مناظرہ ومجادلہ کا میدان کارزار بنا ہوا ہے، جاہل صوفیاء نے اسی کو دین کا مخ اور مغز قرار دیا ہے اور اس کے بالمقابل خشک علماء نے طریقت کو سرے سے بے بنیاد اور بے اصل ٹھہرانے کی جدوجہد کی، حالاں کہ دونوں نظریئے از سر تا پاء غلط اور گمراہ کن ہیں، واقعہ یہ ہے کہ شریعت وطریقت کا ''چولی دامن'' کا ساتھ ہے کہ ہر ایک دوسرے کے بغیر قشر و پوست کے درجہ میں رہ جاتا ہے۔ متاخرین علماء میں صوفی و درویش، اسرارِ شریعت کے واقف کار احسان وسلوک کے راز داں حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا پوری امت پر احسان ہے کہ حقایق کو اُچھال کر، شریعت وطریقت یا صوفی و ملاّ کی باہمی آویزشوں کو ختم کر ڈالا، اور نیتجتاً دونوں ایک دوسرے کے ہم آہنگ وہم نوا ہو گئے۔ آپ ہی کی متعدد تصانیف سے یہ ضخیم مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ سلوک کے مسائل اور مضامین کو قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کرنے کی کامیاب کوشش۔ مصطلحاتِ تصوف پر دلپذیر بحثیں، اخلاق فاضلانہ ورذیلہ کے معرکۃ الآراء مضامین اس مجموعہ کے دل آویز عنوانات ہیں۔ تصوف سے متعلق ذخیرہ کو اس کتاب پر بے تکلف قربان کیا جاسکتا ہے۔ تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ اس مجموعہ کا مطالعہ قطع نظر منازل طریقت کی واقفیت سے، عام انسانی و اخلاقی زندگی کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا، چوں کہ متعدد تصانیف سے التقاط و اقتباس کیا گیا ہے، اس لیے مباحث میں کچھ بے ربطی پیدا ہونا ناگزیر ہے، تاہم ''عیب و نقص کے درجہ تک بات ہرگز نہیں پہنچی۔ بہر حال مجموعہ ہر حیثیت سے لائق مطالعہ اور قابل قدر ہے۔

(سید محمّد انظر شاہ کشمیری)

ابن علامہ انور شاہ کشمیریؒ، دارالعلوم۔ دیوبند

عرضِ حال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین

اما بعد! اس پرفتن زمانہ میں منجملہ دوسری غلطیوں کے ایک اہم اور بڑی غلطی علم تصوف کے فہم میں ہوئی کسی نے قول وفعل کی بے قیدی کا نام تصوف رکھ لیا۔ کسی نے چند ظاہری رسوم کو تصوف کا نام دیدیا۔ اور کسی نے صرف کثرت اوراد و وظائف کو تصوف سمجھ لیا علیٰ ہذا تصوف کے مسائل سمجھنے میں صدہا غلطیاں کیں۔ جن سے ایک طرف تو ان کے عقائد درست نہ رہے بلکہ بعض تو شرک تک میں مبتلا ہو گئے اور دوسری طرف بعض حضرات نے یہاں تک تجاوز کیا کہ اصل تصوف کا انکار کر بیٹھے اور حضرات اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی شان میں بے ادبی وگستاخی کے خوگر ہو گئے تیرہ صدیوں کے مسلمہ مسائلِ تصوف کو کتاب وسنت سے خارج اور شریعت کے خلاف سمجھ کر تصوف کے نام سے کوسوں دور بھاگنے لگے یہ لوگ نہ صرف بزرگانِ دین کے برکات وفیوضات سے محروم ہی رہے بلکہ ان کے قلوب میں قساوۃ پیدا ہو گئی ان کے علاوہ بعض حضرات تصوف کے منکر تو نہیں ہیں۔ حضرات اولیاء اللہ کے معتقد بھی ہیں لیکن علم تصوف کو شریعت کے علاوہ ایک علیحدہ علم سمجھتے ہیں اور مسائل تصوف کو غیر ثابت بالسنۃ جانتے ہیں ان جملہ امور کے پیشِ نظر کتاب شریعت اور طریقت مرتب کی گئی ہے جس کے جملہ مضامین حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں اور حضرت شیخ المشائخ مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے اس کا نام اشرف الطریقت فی الشریعت والحقیقت تجویز فرمایا ہے۔ حضرت مفتی موصوف کے علاوہ حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علیگڑھیؒ خلیفہ مجاز حضرت مجدد تھانویؒ اور مولانا محمد نجم الحسن صاحب تھانوی نواسہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے گرامی قدر مشوروں اور ارشاد کی تعمیل میں حلیۂ طبع سے آراستہ کر کے منظر عام پر

لائی گئی ہے۔ اس میں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجہیات، تعلیمات و مسائل مع دلائل وحقائق سلوک کیلئے طریق عمل اور ان کے متعلق ضروری تفصیلات مندرج ہیں جو قرآن کریم، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیائے کرام کی روشنی میں کتب فقہ کی طرز پر ابواب و فصول کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے۔ شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اس کے مطالعہ سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی تضاد نہیں۔

جملہ برادران طریقت اور شائقین تصوف کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً اس کتاب کا مطالعہ کرنا بلکہ سبقاً سبقاً پڑھنا بہت ضروری ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر کسی جگہ مضمون میں غلطی ہو یا خامی ہو تو وہ احقر مؤلف کی نقل یا عقل کا قصور اور خطا ہوگی حق تعالیٰ معاف فرمائیں اور اس کو حضرت مجدد الملت حکیم الامت قدس سرہٗ کی ذات گرامی کی طرف منسوب نہ فرمائیں ؎ کہ .... عنقا را بلند است آشیانہ

نیز دعا کی بھی درخواست کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ عجب اور کبر سے محفوظ فرمائیں۔

دعاجو

مولوی محمد دین اشرفی چشتی

مرتب، کتاب ہٰذا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

شریعت

شریعت کی حقیقت اور اس کی ضرورت

اللہ[1] تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں :۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِيْعَةٍ مِّنَ	پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ
الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ	یعنی شریعت پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ هٰذَا بَصَآئِرُ	چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ
لِلنَّاسِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ	چلیے۔ یہ شریعت عام لوگوں کے لیے دانشمندیوں
لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝	کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین کرنے
(سورۃ الجاثیہ پ ۲۵)	والوں کے لیے رحمت ہے۔

"بصائر" بصیرت کی جمع ہے اور بصیرت باطنی روشنی کو کہتے ہیں جیسے بصر، نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو کہتے ہیں۔ تو شریعت، بصائر یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے اور سراپا ہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے اور راہ رو (یعنی مسافر) کو ان ہی تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آدمی (منزلِ) مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کیلئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے راستہ نظر آوے۔ حق تعالیٰ کے قربان جائیے کہ بتلاتے ہیں کہ یہ شریعت ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کیے ہوئے ہے ھٰذَا بَصَآئِرُ یہ آنکھیں بھی ہیں وَهُدًی راستہ بھی اسی کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ اور

[1] الشریعت صد ۳، ۴

رَحۡمَةً رحمت ہے کہ مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے یہ شریعت رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لیے نہیں بلکہ یقین کرنے والوں کے لیے ہے۔ (لہذا یقین کا حاصل کرنا ضروری ہوا)۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت میں لفظ شریعت کا موجود ہونا اور اللہ تعالےٰ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طریقہ پر چلنے کا حکم فرمانا اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف شریعتِ اسلامیہ ہی پسندیدہ نظامِ حیات ہے اس کے خلاف معاشرت اور زندگی گزارنے کے جتنے بھی طریقے انسان نے اختیار کر رکھے ہیں وہ جہلا اور بددین لوگوں کے خود ساختہ ہیں جو محض نفسانی خواہشات کے مطابق مختلف عنوانات سے پیش کیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مردود قرار دے دیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ (الآیہ)	جو شخص شریعتِ اسلامی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا اس کے طریق کار کو خدا تعالےٰ ہرگز قبول نہیں کرے گا۔

شریعت خدا تعالیٰ کا قانون ہے[1] اور سب جانتے ہیں کہ قانون کسی شخص کی رائے اور خواہش سے نہیں بدل سکتا۔ البتہ قانون بنانے والا خود ہی بدل دے تو دوسری بات ہے اور اسی طرح اگر لوگ قانون پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو ان کے عمل چھوڑ دینے سے قانون نہیں بدل سکتا۔ خاص کر خدا تعالیٰ کا قانون۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی حکومت کا دارومدار بندوں کی فرمانبرداری اور اطاعت پر نہیں اور فرمانبرداری کوئی کرے یا نہ کرے۔ ہر حال میں وہ سب کا بادشاہ ہے تو پھر اس کا قانون کس طرح بدلا جاسکتا ہے (لہذا فرماتے ہیں):۔

وَمَنۡ[2] لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ	جو شخص خدا کے اتارے ہوئے یعنی بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق فیصلہ نہ کرے ایسے ہی لوگ دراصل کافر ہیں۔

---

[1] نجات کا طریقہ صہ ، [2] الشریعت ص۳۰

غور سے سن لیجیے[1] کہ دین (شریعت) کے پانچ اجزا ہیں۔ ایک جزو تو عقائد کا ہے کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے (اس کی تفصیل کتب عقائد سے معلوم ہوگی) دوسرا جزو عبادات ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ تیسرا جزو معاملات ہیں یعنی احکام نکاح وطلاق و حدود و کفارات و بیع و شراء (خرید و فروخت) و اجارہ و زراعت وغیرہ۔ اور ان کے جزو دین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت یہ سکھاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں فلاں چیز کی کرو، بلکہ ان میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع (اور جھگڑے) کا اندیشہ ہو۔ غرض جواز اور عدم جواز بیان کیا جاتا ہے۔ چوتھا جزو معاشرت ہے۔ یعنی اٹھنا، بیٹھنا، ملنا جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیونکر چاہیے۔ اور اس کے آداب کیا ہیں؟ بیوی بچوں، عزیزوں، اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیونکر برتاؤ کرنا چاہیے۔ پانچواں جزو تصوف ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں۔ آجکل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لیے بیوی بچوں (اور دوسرے دنیاوی اور معاشرتی امور) کو چھوڑنا پڑتا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ غرض دین کے پانچ اجزا ہیں ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو تو وہ ناقص دین ہے جیسے کسی کے ایک ہاتھ نہ ہو تو وہ ناقص الخلقت ہے۔

(چاہیے یہ کہ آدمی صرف خدا کا بندہ ہو اور اسی کے احکام کی اتباع کرے)[2] اس لیے کہ خدا تعالیٰ کا کلام سب سے زیادہ کامل ہے کیونکہ حالات کا سب سے زیادہ علم اسی کو ہے پھر وہ باختیار مالک ہے اور تمام اشیاء میں خود مؤثر ہے۔ کوئی کیفیت اس پر غالب نہیں۔ اس لیے جو حکم اس کی طرف سے صادر ہوگا وہ کامل ہوگا۔ نہ اس کے احکام بہت سخت ہو سکتے ہیں کیونکہ اس پر صفت غضب غالب نہیں۔ نہ بہت نرم ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ صفت رحمت سے مغلوب نہیں بلکہ وہ باختیار خود قہار ہے اور باختیار خود رحیم و کریم ہے۔ کسی صفت

---

[1] : تفصیل الدین ص۵۹ ، [2] کمالات اشرفیہ ص۱۰۵

میں مجبور یا مغلوب نہیں پس معلوم ہوا کہ جو کلامِ الٰہی ہے اس کے تمام احکام افراط و تفریط سے پاک ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا پابند ہونا ہر بشر پر لازم ہے کیونکہ وہ احکام سب کے مصالح کو جامع ہیں۔ نیز ہماری یہ حالت مشاہد (یعنی نظر آتی) ہے کہ جو کیفیت شدید ہوتی ہے وہ ہم کو مغلوب کر دیتی ہے اس لیے ہم کو شریعتِ الٰہی کی پابندی ضروری ہے تاکہ ہم اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ واقعی شریعت کی تعلیم میں غایت تعدیل (یعنی بہت میانہ روی) ہے۔ سو تعدیل ہر چیز میں وہی ہے جو اس میں شریعت کا حکم ہے۔ مثلاً ہمدردی اچھی چیز ہے مگر اسکا اس قدر افراط کہ اللہ تعالےٰ پر اعتراض کا وسوسہ پیدا ہونے لگے مناسب نہیں۔ جیسے کوئی بچہ بیمار ہے سخت روتا اور چلاتا ہے اس پر رحم کھا کر دعا کرے اور تاخیر صحت سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض پیدا ہونے لگے کہ حق تعالیٰ میری دعا کو اس بچہ کے حق میں قبول کیوں نہیں فرماتے۔ یا قبول میں دیر کیوں کرتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ اس میں بھی حکمت ہے۔ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ والدین تدبیر کو استعمال میں نہیں لاتے اور حق تعالیٰ کو غیظ آتا ہے کہ میری سُنّت عادیہ میں یہ خلل ڈالنا چاہتا ہے (کیونکہ حق تعالیٰ کی سنّت عادیہ یہی ہے کہ اختیار اسباب سے مسبّب کو مرتب فرماتے ہیں) اور ایسے وقت شریعت کا حکم یہی ہے کہ تدبیر کی جائے اور تدبیر کو مؤثر بنانے کے لیے دعا بھی کی جائے۔

خدا تعالیٰ[1] نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور فطرت بھی۔ اس لیے اگر دونوں کے مقتضا میں تزاحم ہو تو اس وقت اس کو شریعت کی تعلیم پر عمل کرنا چاہیئے کیونکہ شریعت کی تعلیم میں دونوں کی رعایت ہے۔ مثلاً کسی چیز کے فوت ہونے سے رنج پہنچے۔ تو عقل اس وقت رنج کرنے سے منع کرتی ہے کہ رنج کرنے سے وہ شے واپس نہیں آسکتی اس لیے رنج فضول ہے اور طبیعت رنج کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ چیز ہم سے جدا کیوں ہوئی مگر شریعت میں دونوں کی رعایت کی گئی ہے کہ رنج بھی ہو مگر اس کو غالب نہ کرو۔ شریعت نے عقل کی بھی رعایت کی اور طبیعت کی بھی۔ اسی طرح فنائے دنیا سے غفلت، عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے۔ کیونکہ فنائے دنیا کو بار بار دیکھتے دیکھتے مساوات سی

---

[1] : انسانی صہ ۴

ہوجاتی ہے اور جس چیز کی مساوات سی ہوجائے اس سے طبیعت کو غفلت ہوجاتی ہے۔ شریعت نے یہاں بھی دونوں کی رعایت فرمائی کہ غفلت کا تو مضائقہ نہیں مگر نہ اتنی غفلت کہ احکامِ عقلیہ بالکل برباد ہوجائیں۔

الغرض شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال، اخلاق کی فرع ہیں (یعنی اعمال اخلاق سے پیدا ہوتے ہیں اور) اصل محلِ اعتدال کا اخلاق ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ اخلاق کے تین اصول ہیں یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں جن سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ قوتِ[۱] عقلیہ، قوتِ[۲] شہویہ، قوتِ[۳] غضبیہ۔ حاصل یہ ہے کہ اپنے منافع کے حصول اور مضار کے دفع کے لیے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ، دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ قوت کہ جس سے منفعت و مضرت کو سمجھے وہ "قوتِ مدرکہ عقلیہ" ہے اور ایک یہ کہ منفعت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے۔ یہ "قوتِ شہویہ" کا کام ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوتِ دافعہ "قوتِ غضبیہ" ہے پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں پھر ان اعمال کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، اعتدال، چنانچہ قوتِ عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ حق کو بھی نہ مانے۔ جیسے یونانیوں نے کیا۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفہ تک اتر آئے اسی طرح قوتِ شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہے بیوی، اجنبیہ سب برابر ہوجائیں۔ اور ایک درجہ تفریط یعنی ایسا پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے یا مال کے ایسے حریص ہوئے کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں۔ اسی طرح قوتِ غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا ہی بن جائے اور تفریط یہ ہے کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے بھی مارلے، دین کو برا کہہ لے، تب بھی غصہ نہ آئے۔ یہ تو افراط تفریط تھا۔ ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال ہے یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کو استعمال کرے اور جہاں اجازت نہ دی ہو وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے تو ہر قوت کے تین درجے ہوئے۔ افراط، تفریط، اعتدال۔ ان سب درجوں کے نام الگ الگ ہیں جو قوتِ عقلیہ کے افراط کا درجہ ہے اس کا نام "جربزہ" ہے۔ جو تفریط کا درجہ ہے اس کو "سفاہت" کہتے ہیں۔ جو اعتدال کا درجہ ہے اس کا لقب "حکمت" ہے۔ اسی طرح

قوتِ شہویہ کے افراط کا درجہ "فجور" ہے، تفریط کا درجہ "جمود" ہے۔ اعتدال کا درجہ "عفت" ہے اور قوتِ غضبیہ کا درجۂ افراط "تہور" ہے اور گھٹا ہوا درجہ "جبن" ہے۔ اعتدال کا درجہ "شجاعت" ہے تو یہ نو چیزیں ہوئیں جو تمام اخلاق حسنہ وسیئہ کو حاوی ہیں۔ اور مطلوب ان نو درجوں[1] میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں، یعنی حکمت[1]، عفت[2]، شجاعت[3]۔ باقی سب رذائل ہیں تو اصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہیں اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام "عدالت" ہے۔ اسی لیے اس امت کا لقب "امتِ وسط" یعنی "امتِ عادلہ" ہے۔ غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں لیکن انسان بہت کم ہیں چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند
ایں جملہ شدی و لیکن انسان نشدی

(یعنی تم زاہد، شیخ اور عقلمند اور سب کچھ تو بن گئے لیکن انسان نہ بنے)

(حاصل کلام یہ کہ) شریعت نے ہم کو ایسی تعلیم دی ہے جس میں تمام مصلحتوں اور مضرتوں کی رعایت ہے اس لیے ہمیں تجربہ کر کے ٹھوکریں کھا کے مصلحتیں اور مضرتیں معلوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ شریعت کی تعلیم حاصل کر لیں پھر ہمیں تہذیب و تمدن میں کسی قوم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری سب مصلحتوں اور مضرتوں کی رعایت فرما کر ایسی جامع اور مانع تعلیم ہم کو فرمائی ہے جس میں مضرت کا نام و نشان نہیں بلکہ راحت ہی راحت ہے پس مسلمان اگر شریعت کی تعلیم پر کما حقہٗ چلیں تو ہمہ تن راحت میں رہیں۔ روحانی راحت بھی (میسر ہو) اور جسمانی راحت بھی (حاصل ہو)۔

طریقِ کار

دین[2] کے جتنے حصے ہیں، عقیدے، عبادتیں، معاملات[3]، خصلتیں اور رہنے سہنے کے طریقے۔ سب کی اصلاح کریں اور جو معلوم نہ ہوں پوچھتے رہیں۔ جو کام کریں پہلے شریعت سے تحقیق کر لیں۔ مگر تحقیق ایسوں سے کریں جو سچی بات

[1] انفاسِ عیسیٰ صہ ۳۰۹، ۳۱۰، [2] علم کی طلب صہ ۱۵، [3] الشریعت صہ ۴۳

بتلادیں۔ اور جو خود ہی اپنی خواہش نفسانی کو شریعت کے اندر ٹھونسیں اور زبردستی غیر دین کو مصلحتوں اور پالیسی کی وجہ سے دین بنادیں وہ واقع میں عالم نہیں وہ تو جاہل ہیں۔ ان سے مت پوچھیں ورنہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی گمراہ کریں گے۔ اگر یہ کہیں کہ اس زمانہ میں سچے عالم کہاں ملتے ہیں؟ تو یہ غلط ہے بلکہ ڈھونڈنے سے مل جاتے ہیں۔

○

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی تعریف اور باہمی تعلق

شریعت[1] احکامِ تکلیفیہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں اعمال ظاہری اور باطنی سب آ گئے۔ اور متقدمین کی اصطلاح میں لفظ فقہ کو اس امر کا مرادف (یعنی ہم معنی) سمجھا جاتا ہے جیسے امام اعظم ابو حنیفہؒ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے۔ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا (یعنی نفس کے نفع اور نقصان کی چیزوں کو پہچاننا) پھر متاخرین کی اصطلاح میں شریعت جزو متعلق باعمال ظاہرہ کا نام "فقہ" ہو گیا اور دوسرے جزو متعلق باعمال باطنہ کا نام "تصوف" ہو گیا اور ان اعمالِ باطنی کے طریقوں کو "طریقت" کہتے ہیں۔ پھر ان اعمال کی درستی سے قلب میں جو جلاء اور صفائی پیدا ہوتا ہے اس سے قلب پر بعض حقائق کونیہ متعلقہ اعیان واعراض (حقائق اعتقاد لوازمات) بالخصوص اعمال حسنہ وسیئہ، حقائق الٰہیہ صفاتیہ وفعلیہ بالخصوص معاملات بین اللہ اور بین العبد (یعنی جو معاملات اللہ اور بندے کے درمیان ہیں وہ) منکشف ہوتے ہیں۔ ان مکشوفات کو "حقیقت" کہتے ہیں اور اس انکشاف کو "معرفت" کہتے ہیں اور اس صاحب انکشاف کو "محقق" اور "عارف" کہتے ہیں۔ پس یہ سب امور متعلق شریعت کے ہی ہیں۔ اور عوام میں جو یہ شائع ہو گیا ہے کہ شریعت صرف جزو متعلق باحکام ظاہرہ کو کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح کسی اہلِ علم سے منقول نہیں اور عوام کے اعتبار سے اس کا منشا بھی صحیح نہیں کہ وہ ظاہر اور باطن میں اعتقادِ تنافی (یعنی ظاہر اور باطن میں اختلاف کا قائل ہونا) ہے۔ واللہ اعلم۔

تصوف[2] کے اصول صحیحہ قرآن اور حدیث میں سب موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن اور حدیث میں نہیں ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یعنی غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے اور خشک علماء کا بھی، کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں مگر دونوں غلط سمجھے۔ خشک علماء تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں یہ سب واہیات ہے۔ بس نماز روزہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اسی کو کرنا چاہیئے، یہ صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے تو گویا ان کے نزدیک قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں اور غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں تو ظاہری

---

[1] التکشف ص۱۱۱ [2] طریق القلندر ص۲۲

احکام ہیں۔ تصوّف علمِ باطن ہے ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن و حدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں فرقے قرآن و حدیث کو تصوّف سے خالی سمجھتے ہیں پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوّف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن و حدیث کو۔ اے صاحبو! کیا غضب کرتے ہو۔ خدا سے ڈرو۔ اس کے متعلق میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ایک تو "حقیقت الطریقت" جس میں مسائل تصوّف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے۔ ایک رسالہ مستقل (مسائل السلوک) جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تصوّف کے مسائل قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں۔ ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوگا کہ قرآن و حدیث تصوّف سے لبریز ہیں اور واقعی وہ تصوّف ہی نہیں جو قرآن و حدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوّف کے ہیں وہ سب قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

۲۔ طریقت

طریقت کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا	آگاہ ہو جاؤ کہ بے شک اللہ کے اولیاء پر
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.	نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ	لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے ہیں۔
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	ان کے لیے زندگانی دنیا میں اور آخرت میں
وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ	بشارت ہے اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہے
اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝	یہی بڑی مراد ہے۔

اس آیت میں ولایت کا مدار دو چیزوں پر فرمایا ہے۔ ایمان اور تقویٰ۔ سو جس درجہ کا ایمان اور تقویٰ حاصل ہو گا۔ اسی مرتبہ کی ولایت حاصل ہو گی۔ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان اور تقویٰ جو صحیح عقائد ضروریہ (گو تقلیداً ہو) اور ضروری اعمال سے حاصل ہوتا ہے ادنیٰ درجہ کی ولایت حاصل ہو گی جو ہر مومن کو حاصل ہے۔ اس کو[۲] "ولایت عامہ" کہتے ہیں۔ اور اگر اعلیٰ درجہ کا ایمان و تقویٰ ہے تو اعلیٰ درجہ کی ولایت حاصل ہو گی۔ اس کو "ولایت خاصہ" کہتے ہیں۔ اور اصطلاحاً "ولی" وہی شخص کہلاتا ہے جو اس ولایت خاصہ کے ساتھ موصوف ہو۔ ہمارا مقصود بھی اس کتاب میں اسی ولایت کے احکام کو بیان کرنا ہے تو اب ولایت خاصہ کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ٹھہری ایمانِ کامل اور تقویٰ کامل[۱]۔ اور مثل نماز روزے کے یہ بھی فرض و واجب ہے اور یہ دونوں چیزیں بدوں اصلاحِ باطن کے حاصل نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ایمان کا محل[۳] تو ظاہر ہے کہ قلب ہے۔ رہا تقویٰ، سو گو ظاہری جوارح سے متعلق ہے مگر حقیقی تقویٰ جو کامل تقویٰ ہے۔ قلب ہی سے متعلق ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تقویٰ

---

[۱] تعلیم الدین ص۶۷، [۲] وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ الآیہ۔ [۳] وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ الآیہ۔

اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَ اَشَارَ اِلَی الصَّدْرِ (مسلم) یہاں ہے اور سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔

سو جب کہ ایمانِ کامل اور تقویٰ کامل کا حاصل کرنا فرض ٹھہرا اور وہ اصلاحِ باطن پر موقوف ہے۔ سو اصلاحِ باطن بھی فرض ہوئی اسی طرح ظاہر ہے کہ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان و تقویٰ معدوم ہوگا تو اعلیٰ درجہ کا بھی کسی طرح حاصل نہ ہوگا۔

[1] کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ دو[2] قسم کے ہیں بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے کلمہ پڑھنا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ماں باپ کی خدمت، ان کو "مامورات" کہتے ہیں۔ اور کلماتِ کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا، زنا، چوری، سود خوری، رشوت وغیرہ۔ ان کو "منہیات" کہتے ہیں بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے۔ جیسے ایمان و تصدیق و عقائدِ حقہ، صبر و شکر، توکل، رضا بالقضاء، تفویض و اخلاص، محبت خدا و رسول وغیرہ۔ ان کو "مامورات" و "فضائل" کہتے ہیں اور عقائدِ باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریا، تکبر، عجب وغیرہ یہ "مناہی" و "رذائل" ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جس طرح قرآن مجید میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو) موجود ہے۔ اسی طرح یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا (اے ایمان والو! صبر کرو) اور وَ اشْکُرُوْا (اور اللہ کا شکر بجا لاؤ) بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے) اور لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ (لوگوں پر اللہ کے لیے خانہ کعبہ کا حج فرض ہے) پاؤ گے تو دوسرے مقام میں یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ اور وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں) بھی دیکھو گے جہاں اِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں) مذکور ہے اس کے ساتھ ہی یُرَآءُوْنَ

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۱۱

اَلنَّاسَ (لوگوں کو دکھلاتے ہیں) بھی موجود ہے اگر ایک مقام پہ تارکِ نماز و زکوٰۃ کی مذمت ہے تو دوسرے مقام پر تکبر و عجب کی بُرائی بھی موجود ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابوابِ نماز و روزہ، بیع و شراء، نکاح و طلاق پاؤ گے۔ ابواب ریاء و کبر وغیرہ بھی دیکھو گے۔

جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکم خداوندی ہیں اسی طرحِ اعمال باطنہ بھی حکمِ خداوندی ہیں۔ کیا اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ امر کا صیغہ ہے اور اِصْبِرُوْا وَاشْكُرُوْا امر کا صیغہ نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سبھی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود اور موجبِ نجات اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا. الآیہ	بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا۔ اور جس نے میلا کیا ناکام رہا۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔	اس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لیکر آیا۔

ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے۔ قلب ہی کا فعل ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب ایمان ہی کی تکمیل کے لیے ہیں پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے۔ دل بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور اعضاء اس کے لشکر یا غلام ہیں۔ اگر بادشاہ درست ہو جائے تو توابع خود بخود اس کی مطابقت کرنے لگیں۔ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں)۔

اَلَا اِنَّ فِى الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ. اَلَا وَهِىَ الْقَلْبُ (الحدیث)	بے شک آدمی کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن تباہ ہو جاتا ہے سن لو وہ دل ہے

یہ امور رات دن ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں کہ جس چیز کا دھیان دل میں سما جاتا ہے سارے اعضاء اُس کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ آنکھ اس کو دیکھنے، کان اُس کو سننے، ہاتھ اُس کو پکڑنے اور پاؤں اس کی جانب چلنے کو چاہتا ہے۔ خواہ وہ شئے بُری ہو یا بھلی۔ مگر دل کا خیال ان اعضاء کو اُس کے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

شریعت[1] میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی شرع کے معنی کا بھی اعتبار ہے۔ اس معنوی فقہ کو تصوّف کہتے ہیں۔ تصوّف کو علیحدہ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جاوے۔ یہ علیحدگی ایسی ہے جیسے مشہور فقہ میں کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصلوٰۃ الگ الگ ہیں اسی طرح کتاب التصوّف بھی فقہ ہے۔ اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ و کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جاویں گے۔ اسی طرح توحید و اخلاص، یا کبر و تواضع و عجب وغیرہ اخلاقِ حمیدہ و رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں۔

اہلِ علم بھی اُس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری قیام و قعود کے اور بھی کچھ ہے۔ اور وہ ضروری بھی ہے۔ مثلاً بظاہر اُٹھ بیٹھ لیے۔ اور نماز ادا ہو گئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں جہاں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ ہے۔ اس کے ساتھ ہی خَاشِعُوْنَ (خشوع کرنے والے) بھی لگا ہوا ہے۔ جب صَلٰوتِهِمْ سے نماز شرعی مطلوب سمجھتے ہیں تو کیا وجہ کہ خَاشِعُوْنَ سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ دونوں حکم ضروری ہیں

قَالَ[2] اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فَفَهَّمْنَاهَا	اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پس ہم نے وہ واقعہ
سُلَيْمٰنَ وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى	حضرت سلیمان کو سمجھا دیا اور رسول اللہ صلی اللہ
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَقَدْ كَانَ فِيْمَا	علیہ وسلم نے فرمایا۔ تحقیق تم سے پیشتر اُمتوں میں
قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ	صاحب الہام گزرے ہیں پس اگر میری اُمت
فَاِنْ يَّكُ فِيْ اُمَّتِيْ اَحَدٌ	میں کوئی ہے تو وہ عمرؓ ہیں (بخاری و مسلم)
فَاِنَّهٗ عُمَرُ رضی متفق علیه وقال	اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ہم نے اپنے پاس سے

---

[1] تصوّف و سلوک صلا۔ [2] تعلیم الدین صلا۔

اللّٰہُ تَعَالٰی وَعَلَّمْنَاہُ مِنْ ان کو علم سکھایا۔
لَّدُنَّا عِلْمًا۔

بعض عارفین کا قول ہے کہ جس کو علمِ باطن سے کچھ میسّر نہ ہو۔ اُس کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے اور ادنیٰ حصّہ یہ ہے کہ اس کی تصدیق اور تسلیم تو کرتا ہو منکر کی یہی کافی سزا ہے کہ وہ اُس سے محروم ہے۔ شعر

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی
بگذارد تا بمیرد در رنج خود پرستی

ترجمہ:۔ (عشق اور مستی کے رموز اور بھید مدعی اور خود پرست سے مت کہو۔ چھوڑ دو۔ اسے خود پسندی میں مرنے دو۔)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ	یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو
تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ	کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اُسے
لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔	نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس (احسان) کو بعد ایمان و اسلام کے فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ عقائد ضروریہ و اعمالِ ظاہرہ کے کوئی اور چیز بھی ہے کہ اس کا نام حدیث میں احسان آیا ہے اور اس کی حقیقت بیان فرمانے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی طریقِ باطن ہے کیونکہ بدون اس طریق کے ایسے حضوری ہرگز میسّر نہیں ہوتی کہ لاکھوں معتبر آدمیوں کی شہادت موجود ہے جس کے غلط ہونے کا عقل کو احتمال نہیں ہو سکتا کہ ہم کو اہلِ باطن کے پاس بیٹھنے سے ایک نئی حالت اپنے باطن میں عقائد و فقہ کے علاوہ محسوس ہوتی ہے جو پہلے نہ تھی اور اس حالت کا ثمرہ یہ ہے کہ طاعت کی رغبت اور معاصی سے نفرت۔ عقائد کی پختگی روز افزوں ہے۔ یہ بھی نہایت قوی دلیل ہے کہ طریقِ باطن بھی کوئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ بزرگوں کے کشف و کرامات اس درجہ منقول ہیں کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اگرچہ یہ کوئی قوی دلیل نہیں مگر استقامت شرع کے ساتھ اگر خرقِ عادات ہوں تو صاحب خوارق کے کامل ہونے پر اطمینان بخش ضرور ہوتے ہیں۔

اس بنا پر دو چیزیں طالبِ ولایت کے لیے فرض ٹھہریں۔ ایک ضروری عقائد و اعمال کی تصحیح۔ دوسری اصلاحِ باطن۔ سو عقائد و اعمال تو بقدرِ ضرورت مراجعت کتب و علماً سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اب یہاں صرف اصلاحِ باطن کا بیان کرنا باقی ہے۔

تصوّف کی ضرورت اور اس کا رواج

حضور[۱] اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں علم حدیث و اصول فقہ وغیرہ جدا جدا متمیز نہ تھے (بلکہ) پچھلے زمانہ میں قرآن و حدیث سے استنباط کر کے بہت سے علوم نکالے گئے اور ہر ایک کا جداگانہ نام تجویز ہوا۔ اور ان کے واضعین (بنانے والوں) کو سب نے امام مانا۔ حتیٰ کہ امام شافعی رح جیسے حضرات کو امام اعظم ابو حنیفہ رح اور ان کے تفقہ فی الدین (دین کی سمجھ) کو دیکھ کر الناس فی الفقہ عیال ابی حنیفۃ (لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے محتاج ہیں) کہنا پڑا۔ امام بخاری رح حدیث میں ایسے امام مانے گئے کہ آج تک ان کے تبحر فی الحدیث (حدیث میں کامل ہونے) کا شہرہ ہے۔ اسی طرح تزکیہ باطن کی تعلیم دینے والے ایسے بزرگانِ دین گزرے ہیں کہ ان کو سب نے پیشوا مانا ہے۔ جیسے پیرانِ پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح، خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رح، خواجہ معین الدین چشتی رح، اور شیخ شہاب الدین سہروردی رح اور ان سے پیشتر حضرت جنید بغدادی رح وغیرہ۔ اور جس طرح پچھلوں کو اگلوں کی تقلید و پیروی سے چارہ نہیں علم تصوّف میں بھی بدوں اتباعِ طریقۂ بزرگاں چارہ نہیں۔ گو ادنیٰ درجہ کا تزکیہ جو موجبِ نجات ہے۔ بدوں اتباعِ مشائخ طریق بھی میسّر ہو سکتا ہے مگر وہ امر کہ مطلوب ہے اور کمال کہلاتا ہے اس کا حصول بدوں صحبت کاملین کے ممکن نہیں۔

جس طرح[۲] دیگر علوم مستخرجہ و مستنبطہ کا خاص نام ہو گیا جیسے علم فقہ اور علم حدیث، اسی طرح مشائخ کے اس مستخرجہ طریقہ کا نام تصوّف ہو گیا۔ اگر کوئی شرح وقایہ و ہدایہ پڑھتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فقہ پڑھتا ہے اور اگر تفسیر یا حدیث پڑھتا ہے تو یوں نہیں کہتے کہ فقہ پڑھتا ہے۔ حالانکہ فقہ میں (بقول امام اعظم رح) بہت سے علوم مثلاً حدیث۔

---

[۱] تعلیم الدین ص۹۰۔ [۲] تصوّف و سلوک ص۱۱۔

تفسیر حتیٰ کہ علم کلام وغیرہ بھی داخل ہیں اسی طرح جب کوئی مشائخ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چلتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تصوف سیکھتا ہے۔ یا صوفی ہے نماز روزہ ادا کرنے والے کو صوفی نہیں کہتے۔ حالانکہ تصوف تزکیہ باطن بالمعنی الاعم سب کو شامل ہے۔
لہٰذا[1] جس طرح کنز و ہدایہ ضروری ہے ایسے ہی ابوطالب مکی رح کی "قوت القلوب" اور امام غزالی رح کی "اربعین" اور شیخ شہاب الدین سہروردی رح کی "عوارف" کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔
خلاصہ[2] یہ کہ تصوف کی حقیقت خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا ہے۔ اس[3] کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ہمت[4] کا مقتضا تو یہ ہے کہ صاحبِ ذوق بنو۔ اگر اتنی ہمت نہ ہو تو خدا کے لیے انکار تو نہ کرو۔

ولایت کے شیون

ولایت[5] چونکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور نبوت میں مختلف شیون و شانیں ہیں۔ اس لیے کسی ولی کو علیٰ قدمِ عیسیٰ اور کسی کو علیٰ قدمِ موسیٰ حسبِ اختلاف شیون کہا جاتا ہے اور یہ سب شیون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے شیون کے القاب ہیں۔ آپ ان سب شیون مختلفہ کے جامع ہیں۔ پس جس کو آپ کی شان ملقب بہ شانِ موسوی سے فیض ہوا۔ اس کو علیٰ قدم موسیٰ اور جسکو آپ کی شانِ عیسوی سے فیض ہوا اس کو علیٰ شانِ قدمِ عیسیٰ وغیرہما سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ — سو تم ملتِ ابراہیم کا اتباع کرو جس میں ذرا کجی نہیں۔

نسبت موسوی شیون محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ایک شان ہے۔ عیسیٰ روح اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، یہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شیون ہی کے اسماء ہیں۔ جن لوگوں میں ان شیون موسویہ اور شیون عیسویہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ لوگ مرتے

---

[1] تصوف و سلوک ص۱۵، [2] تفصیل الدین ص۴۳، [3] تصوف و سلوک ص۳۱، [4] تعلیم الدین ص۱۰۷
[5] فیوض الخالق ص۱۱۰،

وقت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُوْسٰی کَلِیْمُ اللّٰہِ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ عِیْسٰی رُوْحُ اللّٰہِ پڑھنے لگتے ہیں جس کی حقیقت عوام نہیں سمجھتے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جامع الکمالات ہیں پس اس سے مستفید ہونا اس حیثیت سے ہے کہ وہ دراصل کمال موسوی ہے بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ دراصل کمال محمدی ہے ؎

حسنِ یوسف دم عیسٰی ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تحقیقاتِ مفیدہ متعلقہ نبوّت وولایت

اس[1] میں گفتگو ہے کہ نبوّت افضل ہے یا ولایت۔ مگر اس پر اتفاق ہے کہ ولی سے نبی افضل ہے کیونکہ وہ نبوّت وولایت کے جامع ہوتے ہیں۔ جو حضرات نبوّت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ نبی کی افضلیت سے استدلال کرتے ہیں اور جو ولایت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ولایت میں توجہ الی الحق (صرف خدا کی طرف توجہ) ہے اور نبوّت میں توجہ الی الخلق (مخلوق کی طرف توجہ) ہے چونکہ خدا کی طرف توجہ مخلوق کی طرف توجہ کرنے سے افضل ہے) پس ولایت افضل ہوئی لیکن تحقیق یہ ہے کہ ولایت تو بے شک توجہ الی الحق ہے۔ مگر نبوّت توجہ الی الخلق والحق معاً (خدا اور مخلوق دونوں کی طرف توجہ) یعنی مرتبہ جامع ہے۔ پس نبوت کا افضل ہونا ظاہر ہے۔ علاوہ بریں اگر ولایت کو افضل کہا جائے تو لازم آتا ہے کہ نبی کو نبوت ملنے سے اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی قبل از نبوّت ولی ہوتا ہے پھر نبوت ملتی ہے مگر دونوں فریق میں نزاع لفظی ہے کیونکہ جو لوگ نبوت کو افضل کہتے ہیں وہ نبوت کو معنی مطابقی (یعنی توجہ الی الحق والخلق معاً) پر محمول کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ولایت کو افضل کہتے ہیں۔ معنی تضمنی (یعنی مخلوق کی طرف توجہ) کے اعتبار سے کہتے ہیں۔

دوم[2] یہ کہ نبی کی دو شاخیں ہوتی ہیں۔ ایک ولایت کی، ایک نبوت کی، تو نبی کی ولایت

---

[1] کمالات اشرفیہ ص۲۶۹، [2] مبادی التصوف

نبی کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ نبی کی توجہ الی افادۃ الخلق من حیث النبوت (یعنی مخلوق کے افادہ کے لیے نبوت کی حیثیت سے توجہ تھی اور توجہ الی الحق من حیث الولایت (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ولایت کی حیثیت سے) یعنی اصل مطلوب یہی توجہ الی اللہ ہے اور توجہ الی الافادۃ مطلوب للغیر ہے۔

(الغرض) ولی کبھی کسی نبی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ نہ عبادت کبھی معاف ہو سکتی ہے بلکہ خواص کو زیادہ عبادت کا حکم ہے۔ البتہ مجذوب کہ مسلوب الحواس ہوتا ہے معذور ہے۔ نہ ولی معصوم ہوتا ہے نہ صحابہ ہی کے مرتبہ کو پہنچ سکتا ہے۔

لقوله تعالیٰ کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ	کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم لوگ بہترین امت
وقوله علیه السلام خَیرُ القرونِ	ہو اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ سب زمانوں
قرنی، ولاجماعهم علی ان	سے بہتر میرا زمانہ ہے اور اس لیے کہ سب کا
الصحابة کلهم عدول ویقول	اجماع ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب عادل
عبد الله ابن المبارک من	ہیں اور عبداللہ بن مبارک جو تابعین میں سے
التابعین الغبار الذی دخل	ہیں فرماتے ہیں کہ جو غبار حضرت امیر معاویہؓ کے
انف فرس معاویة خیر من	گھوڑے کی ناک میں گیا ہے وہ حضرت اویس
اویس القرنی وعمر	قرنیؓ جو مشہور ولی ہیں اور حضرت عمر بن
المروانی۔	عبدالعزیز مروانی سے بہتر ہے۔

(اور اسی طرح) حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمر بن العزیزؒ میں اتنا ہی فرق ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو گرد بیٹھ کر جم گئی ہو وہ ہزار عمر بن العزیزؒ جیسوں سے افضل ہے۔ اس لیے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ وہ آنکھ کہاں سے لائیں گے جن سے حضرت امیر معاویہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور وہ زمانہ کہاں سے لائیں گے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اٹھے بیٹھے۔

اقسامِ طریق و سلوک

طریقِ دو قسم پر منقسم ہے۔ طریقِ جذب اور طریقِ سلوک۔ کبھی وصول الی اللہ پہلے ہو جاتا ہے۔ پھر شوقِ عبادت و ریاضت پیدا ہوتا ہے اس کو "طریقِ جذب" کہتے ہیں اور کبھی اول ریاضت ہوتی ہے پھر وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے اس کو "طریقِ سلوک" کہتے ہیں۔

سلوک دو قسم پر منقسم ہے۔ سلوکِ نبوت اور سلوکِ ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں جو حسبِ ذیل لکھے جاتے ہیں۔ اولیاء میں سے کسی پر کسی وقت فیضِ نبوت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی فیضِ ولایت کا۔

آثارِ سلوکِ ولایت	آثارِ سلوکِ نبوت
(۱) طریقِ ولایت والے کھانے پینے میں تکلفاً کمی کرتے ہیں۔	(۱) طریقِ نبوت والے قصداً کمی نہیں کرتے جو ملتا ہے اسی پر قناعت کرتے ہیں۔
(۲) خلق سے نفرت کرتے ہیں۔	(۲) خلق کی طرف افاضہ کے لیے رغبت کرتے ہیں لیکن خلق سے جی نہیں لگاتے۔
(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرتے جب تک واجب نہ ہو۔	(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں۔
(۴) ان کو اپنے مکاشفات اور تحقیقات پر اطمینان ہوتا ہے اور اس پر عمل کرتے ہیں اگر خلاف شرع نہ ہو۔	(۴) ان پر ادب غالب ہوتا ہے جیسا کہ صاحبِ شرع سے منقول ہوتا ہے اس پر اپنی طرف سے بذریعہ کشف وغیرہ نہیں بڑھاتے۔ اگرچہ وہ زیادہ خلافِ شرع نہ ہو۔

لہ مبادی التصوف صد

	آثارِ سلوکِ ولایت	آثارِ سلوکِ نبوت
۵	ان پر ذوق و شوق غالب ہوتا ہے اور عبادت میں لذتِ طبعیہ آتی ہے	ان پر ذوق و شوق غالب نہیں ہوتا بلکہ ان کو عبادت میں بھی طبعی مزہ نہیں آتا۔ یعنی اگر نہ آوے دلگیر نہیں ہوتے۔ محض حکم ایزدی سمجھ کر عبادت کرتے ہیں۔
۶	اہتمام سے دعا نہیں مانگتے۔	بمقتضائے اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ دعا مانگنا فرض سمجھتے ہیں۔
۷	اسبابِ ظاہری کو ترک کرتے ہیں	اوروں سے زائد اسباب سے متمسک ہوتے ہیں مگر بدوں انہماک کے مقتضائے کے موافق رسول اللہ صلعم نے غزوہ میں دو دو زرہیں پہنی ہیں۔
۸	حضرت علی رض کے ساتھ طبعاً زیادہ محبت کرتے ہیں مگر اعتقاد فضیلت ترتیب سے ہوتا ہے۔	حضرات ابوبکر رض و عمر رض سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔
۹	شیخ کو سارے جہاں سے افضل سمجھتے اور اس پر فریفتہ ہوتے ہیں۔	افضلیت کا یقین نہیں کرتے محبت کرتے ہیں۔
۱۰	ان سے شرائع میں کبھی تسامح بھی ہو جاتا ہے اور وہ معذور ہیں۔	یہ شریعت پر بڑی پختگی سے عمل کرتے ہیں۔
۱۱	ان پر سکر (یعنی عالمِ بیخودی) غالب	ان پر صحو (یعنی ہوشیاری) غالب

آثار سلوکِ ولایت	آثار سلوکِ نبوت
ہوتا ہے	ہوتا ہے۔
(۱۲) بعض اوقات بعض مغلوبین جماعت سے بھاگتے ہیں کیونکہ ان کو اخفاء مقصود ہوتا ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں ابھی غیر باقی ہے۔	(۱۲) جماعت کی پابندی کرتے ہیں اور ان کی نظر سے مقصودیت غیر کی بالکل نفی ہو چکی ہے۔
(۱۳) اگر ظاہری شریعت کے خلاف شیخ حکم کرے تو اسے خلاف شریعت نہیں سمجھتے کسی تاویل سے کر لیتے ہیں مگر غیر قطعیات میں۔	(۱۳) اگر خلاف ظاہر شریعت کوئی حکم شیخ کی طرف سے ہو تو مخالفت کرتے ہیں مگر ادب کے ساتھ۔
(۱۴) ان پر حبِ عشقی غالب ہوتی ہے	(۱۴) ان پر حبِ ایمانی غالب ہوتی ہے
(۱۵) اصحاب سلوک ولایت پر کبھی تشبیہ غالب ہوتی ہے۔	(۱۵) اصحابِ سلوکِ نبوت پر ہمیشہ تنزیہ غالب رہتی ہے۔
(۱۶) سلوکِ ولایت کی انتہا مقام رضا یا فناء الفناء ہے	(۱۶) سلوکِ نبوت کی انتہا مقامِ عبودیت ہے۔

تنبیہ تفصیل[1] بالا سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اولیاء[2] خلاف شریعت چلتے ہیں کیونکہ ایک تو نص کا ظاہر ہے اس پر اصحابِ حدیث چلتے ہیں اور دوسرے نصوص کے معانی محض احکام ہوتے ہیں۔ اس پر فقہاء عامل ہیں۔ تیسرے نصوص کے معنی المعنی (ہوتے ہیں) اس پر بعض احکام میں صوفیہ عامل ہیں لیکن فقہاء کا طریق اسلم ہے کیونکہ وہ شرعیات ہی سے علت مستنبط کر کے حکم کو متعدی کرتے ہیں۔ اور صوفیہ کبھی اپنے ذوق سے بھی علت نکال کر حکم کو متعدی کر لیتے ہیں۔ شرعیات سے علت نکال کر حکم کو متعدی کرنے کی نظیر تو صحابہ

---

[1] مبادی التصوف ص۱ [2] اولیاء اللہ۔

کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھی اور اس کا حجت ہونا تو صراحتہً ثابت ہے بخلاف ذوق محض کے کہ اس سے علت نکال کر حکم کو متعدی کرنے کی نظیر معروف نہیں اور محض ظاہر اً یتدبّرون و یتفکّرون کے خلاف ہے۔

سالک کا مقام

سالکین کا مقام اِیَّاكَ نَعْبُدُ (ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں)[1] پر تمام ہوجاتا ہے اس کے بعد اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (آپ ہی سے اعانت کی درخواست کرتے ہیں) سے تمکین کا طالب ہوتا ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ مرید کی ابتدائی حرکت "حمد" ہے کیونکہ جب سالک کا نفس مزکیّ اور اس کا قلب مُجلّٰی ہوجاتا ہے تو پھر اس میں انوارِ عنایت جو کہ مقامِ ولایت کا موجب ہے۔ درخشاں ہوتے ہیں تو یہ نفس مزکیّ طلب (مقصود) کے لیے خالص ہوجاتا ہے۔ پس اپنے اوپر انعاماتِ الٰہیہ کے آثار کامل اور اس کے الطاف کو غیر متناہی دیکھتا ہے سو اس پر وہ حمد کرتا ہے اور ذکر کو اختیار کرتا ہے پس سراپردہائے عزت کے پیچھے سے اس کے لیے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (ہر ہر عالم کے مربی) کے معنی کا حجاب مکشوف ہوجاتا ہے اس وقت وہ ماسوی اللہ کو محلِ فنا میں اور اپنے کو تربیت میں بقا دہندہ کا محتاج دیکھتا ہے پس وہ وحشتِ اعراض اور ظلمت سکون الی الاغیار سے خلاصی طلب کرنے کے لیے ترقی کرتا ہے پس اس پر درگاہِ مقدس کی ہواؤں سے رحمٰن رحیم (بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں) کے الطاف کے جھونکے چلتے ہیں۔ پھر وہ سراپردہائے جمال کے آگے سے برقہائے جلال کی چمک کے واسطہ سے مالکِ حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پھر وہ مقامِ لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (یعنی مقامِ توحید) میں بلسانِ اضطرار پکارتا ہے کہ میں نے اپنا نفس آپ کے سپرد کر دیا اور میں ہمہ تن آپ پر متوجہ ہوگیا۔ اور اس مقام پر پہنچ کر وہ لجۂ وصول میں گھس گیا اور مقامِ علیین تک پہنچ گیا۔ جس سے اس نے نسبتِ عبودیت کو محقق کر لیا اور کہنے لگا اِیَّاكَ نَعْبُدُ[2]

---

[1] مسائل السلوک ص۳

[2] اس خطاب میں مقامِ فناء کی طرف اشارہ ہے (مسائل السلوک ص۳)

اور یہاں مقامِ سالک کی انتہا ہے (جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے) کیا سیّد الخلق و حبیبِ حق صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر نہیں کرتے ہو کہ آپ کے اس مقام کو کس طرح اس قول سے تعبیر کیا گیا۔

سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا۔ وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ کو شب کے وقت لے گیا۔ اس کے بعد بندہ نے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے تمکین کی درخواست کی (جیسا کہ شروع میں اس کا بھی ذکر ہے) اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ الخ[1] (ہم کو سیدھا راستہ بتلا دیجیے) سے بھی اسی تمکین کا طالب ہوا اور اس قول سے کہ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ (نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے) تلوین سے پناہ مانگی۔ پس طالبِ کمال ہو کر اس نے صعود کیا۔ اور کامل ہو کر اس نے رجوع (نزول) کیا۔ اور گویا اسی لطیفہ کے سبب نماز کو معراجِ مومن کہا گیا۔

اصلاحِ باطن اور اس کے لوازمات

باطن[2] کے متعلق دو قسم کے اوصاف ہیں ایک محمود، دوسرے مذموم۔ سو حقیقتِ اصلاح کی یہ ہے کہ اوصافِ محمودہ کو پیدا کرے اور اوصافِ مذمومہ کو دور کرے۔ پہلے کو "تحلیہ" کہتے ہیں اور دوسرے کو "تخلیہ" اور "تجلیہ" کہتے ہیں۔ اسی طریقِ تحصیل ولایت کے جاننے کا نام عرف میں تصوّف ہو گیا[3]۔ اب ان اوصافِ حمیدہ اور اوصافِ ذمیمہ کو

---

[1] اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صراطِ مستقیم بدون اس کے میسر نہیں ہوتا کہ اہلِ صراطِ مستقیم کا اتباع کیا جاوے (جن کو اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ سے تعبیر کیا ہے) اور اس کے لیے صرف کتب و اوراق کافی نہیں۔ نیز اشارہ ہے اس طرف کہ مطلوب صراطِ مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی۔ جو صرف منعم علیہم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام مخلوق کو عام ہے (مسائل السلوک صہ ۸)

[2] تعلیم الدین ص ۶۸

[3] التصوّف ھو علم تعرف بہ احوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الاخلاق وتعمیر الظاھر و الباطن ونیل السعادۃ الا بدیۃ وموضوعہ التزکیۃ و التصفیۃ و

(باقی اگلے صفحہ پر)

معدوم کرنا چاہیئے۔ یوں تو بے شمار اوصاف ہیں مگر ان کے اصول معدود ہیں کچھ اوصاف حمیدہ اور کچھ اوصاف ذمیمہ جن کے حاصل یا زائل کرنے کے لیے حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صاف صاف امر فرمایا ہے[1] ان اوصاف کو جب یہ درست ہو جاویں۔ اصطلاحِ صوفیہ میں مقامات[2] کہتے ہیں پس تقریر ہذا سے واضح ہو گیا کہ مقاصد اس فن کے یہی مقامات ہیں اور طالب کا اتنا ہی کام ہے کہ ان کو درست کرے۔ ان کے درست کر لینے کو "تفصیلی ریاضت" کہتے ہیں۔ ایک طریقِ ریاضت و مجاہدے کا اجمالی ہے اس کے اصول ائمہ فن کے نزدیک چار امر ہیں[3] قلۃ الکلام، قلۃ الطعام، قلۃ المنام، قلۃ الاختلاط مع الانام غرض ریاضت و مجاہدہ خواہ تفصیلاً ہو یا اجمالاً۔ اس سے قلب سالک میں استعداد[4] قریب وصول الی اللہ کی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد محض فضلِ خداوندی سے اس کے قلب کو بالفعل ایک خاص تعلق جذبی مطلوبِ حقیقی کیساتھ پیدا ہو جاتا ہے[5] اس کو "نسبت" "سکینہ" اور "نور" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی نسبت کے پیدا ہو

التعمیر المذکور وغایتہ نیل السعادۃ الابدیۃ ومسائلہ ما یذکر فی کتبہ من المقاصد (القشیریۃ) [1] اب اس کہنے کی گنجائش نہیں کہ شارع ؑ نے تصوف نہیں سکھایا ۱۲ [2] المقام ما یتحقق بہ العبد بمنازلۃ من الاداب مما یتوصل الیہ بنوع تصرف بتحقیق ادامہ عند ذلک وما ھو مشتغل بالریاضۃ الی ان قال فان من بلا قناعۃ ولا یصح التوکل الخ (القشیریۃ) ۱۲ [3] وھو اربعۃ، السھر والخلوۃ، والصمت والجوع، الخ (الاحیاء) [4] تا وقتیکہ ہمہ امراض معنوی کہ صفات ذمیمہ اند رفع نہ شوند و بجائے آنہا ہمہ اوصاف حمیدہ حاصل نہ شوند۔ استعداد وصول الی اللہ میسر نیاید (ضیاء القلوب) ۱۲ [5] یرجع الطرق کلھا الی تحصیل ھیئۃ نفسانیۃ تسمی عندھم بالنسبۃ لانھا انتساب وارتباط باللہ عزوجل وبالسکینۃ وھو النور الی قولہ والغرض من اشتغال تحصیل نسبتہ والمواظبۃ علیھا واستغراق فیھا حتی ینیب للنفس ھھنا ملکۃ راسخۃ ولا تظن ان النسبۃ لا تحصل الا بھذہ الاشغال بل ھذا طرق فیھا من غیر حصر فیھا وغالب الرای عندی ان الصحابۃ والتابعین کانوا یحصلون السکینۃ بطرق اخری فمنھا المواظبۃ علی العبادات الی اخرھا ۱۲ (القول الجمیل)۔

جانے کا نام "وصول" ہے۔ پچھلے زمانہ میں بوجہ برکت قربِ عہد حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقام پر بوجہ نسبت قوی پیدا ہو جانے کے وصول کامل ہو جاتا تھا لیکن اس زمانہ میں اکثر اس مقام پر نسبت ضعیف پیدا ہو جاتی ہے جس کا حاصل کرنا فرض ہے اور نسبت قویہ اور وصول کامل کے لیے "اذکار" "اشغال" و "مراقبات" کی حاجت پڑتی ہے جس کا حاصل کرنا مندوب ہے۔ اہلِ بیتِ خلافت و مشیخت کا ادنیٰ درجہ اس قوت نسبت کے حاصل ہو جانے پر میسر آ جاتا ہے۔ پھر بعد حصول نسبت قویہ کے چونکہ مبدأ انیاض سے قلب کو تعلق ہو گیا ہے۔ بوجہ صفائی قلب اس پر کچھ علوم و اسرار کبھی حالات و آثار نازل ہوتے ہیں۔ ان علوم کو حقائق و معارف[1] اور ان آثار کو احوال کہتے ہیں اور بعض اوقات محض جذبۂ غیبی سے یا کسی بزرگ کی توجہ و ہمت سے اوّل نسبت حاصل ہو جاتی ہے اس کے بعد مقامات کی تصحیح ہوتی ہے اور یہ اقرب طریق ہے اور اکثر اس زمانے میں معمولِ مشائخ یہی ہے اور یہ طریق، "طریقِ عشق" سے ملقب ہے۔ شعر

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد ٭ از حرص و عیب کلی پاک شد

پہلے شخص کو سالک مجذوب، مرید اور محب کہتے ہیں۔ دوسرے کو مجذوب سالک، مراد اور محبوب کہتے ہیں اور تقدیم سلوک کو ہدایت اور تقدیم جذب کو اجتباء[2] کہتے ہیں۔ پس ترتیب سلوک اہلِ طریق کے نزدیک یوں ہوئی کہ اوّل قلب میں ارادہ پیدا ہوا۔ اس وقت اپنے کو کسی شیخِ کامل کے سپرد کرنا چاہیئے جس کا عنوان اس زمانہ میں بیعت ہے پھر شیخ

---

[1] :- الحقیقۃ الشہود لما قضی وقدر واخفی واظھر ۱۲ (قشیریہ) (حاشیہ ص۲۵) الحال عند القوم معنی یرد علی القلب من غیر تعمد منھم والاجتلاب والاکتساب لھم من طرب اوحزن وبسط او شوق او انزعاج او ھیبۃ او ابتھاج، فالاحوال مواھب والمقامات مکاسبھا (قشیریہ) [2] بدانکہ علت موجب قربِ الٰہی جذب یعنی کشش خداست بندہ خود را بسوئے خود۔ و این جذب گاہے بے توسط امرے باشد و آنرا "اجتباء" گویند و گاہے بتوسط امرے باشد و آں بتوسط دو چیز است بحکم استقرار یکے عبادت دوم محبتِ انسان کامل مکمل پس جذب الٰہی بتوسط عبادت باشد آنرا ثمرہ گویند و آنچہ بتوسط صحبت شیخ باشد آنرا اثر شیخ نامند ۱۲ از رسالۃ الطالبین (باقی اگلے صفحہ پر)

کاملِ اجمالی یا تفصیلی ریاضت کرادے جس سے کچھ نسبت پیدا ہوجاوے یا پہلے القارِ نسبت کرے پھر ریاضت کرادے۔ جب قلب تعلقات سے خالی ہوجاوے پھر اگر چاہے اس کو خلافت دے۔ اگر چاہے تو منتظر نزول احوال و معارف کا رہے۔ اگر قسمت میں ہے تو یہ علوم و آثار قلب پر نزول کریں گے جن کے غلبہ کا نام عروج ہے اور منتہی اس کا تجلی بے کیف ہے پھر بعض تو اس میں مستغرق رہ جاتے ہیں اور بعض کو افاقہ ہوتا ہے اس افاقے کو نزول کہتے ہیں۔ خلافتِ کاملہ اور مشیخت[^۱] علیا اس مقام پر حاصل ہوتی ہے۔

اصولِ طریقت کا اجمالی خاکہ

اس طریق[^۲] کے متعلق چند ضروری امور مثل اصول موضوعہ کے ہیں اگر تحقیقاً یا تقلیداً ان کا اعتقاد اور ان پر عمل رکھا جائے تو ہمیشہ کی پریشانی و غلط فہمی و کجروی سے بچ جائے۔

(بقیہ) اوّل را مرادیت و ثانی را مریدیت گفتن لائق است واللہ یجتبی الیہ من یشآء و یھدی الیہ من ینیب حق تعالیٰ اجتبار سکینہ ہر کرا میخواہد یعنی بدون سعی او برگزیدہ میکند و ہدایت میکند کسی راکہ رجوع مے آرد ۱۲ (ارشاد) مجذوب سالک آنکہ اوّل بقوت امداد جذبات بساطِ مقامات راطے کردہ بعالم کشف رسد۔ بعد ازاں منازل و مراحل را بہ قدم سلوک باز آید و سالک مجذوب آنکہ اوّل جملہ مہالکِ صفات نفسانی را بقدم سلوک درنوشتہ آنگاہ بامداد جذبات جناب الٰہی بعالم کشف و یقین رسیدہ ۱۲ جواہر غیبی، از شرح گلشن راز، سالکان دو نوع اند محبوبان و محبان۔ آنکہ جذب ایشاں مقدم است محبوبان اند و آنکہ سلوک ایشاں مقدم است محباں اند۔ ۱۲ جواہر غیبی (حاشیہ ص۲۶) [^۳] فاذا کفی ذلک او صنعت بالمجاھدۃ الی تولیہ الزمہ الشیخ ناحیۃ ویلقنہ ذکراً من الاذکار حتی تسقط حرکۃ اللسان تبقی صورۃ اللفظ فی القلب ثم لا یزال کذلک حتی یمحی عن القلب حرف اللفظ صورۃ بتقی حقیقۃ معناہ فاذا حصل قلبہ مع اللہ تعالیٰ انکشف جلال الحضرۃ الابدیۃ و تجلی لہ الحق و ظہر لہ من لطائف اللہ ما یجوز ان یوصف انتہی مختصرا ۱۲ (الاحیاء) [^۴] التوبۃ والعزیمۃ علی ترک المعاصی والتمسک بحبل التقویٰ ہی مضمر فاقیمت البیعۃ مقامھا ۱۲ (القول الجمیل) [^۵] ضیاء القلوب۔

[^۱]: انفاس عیسیٰ ص۳ ، ص۴ ۔

مطلوب = طلب کیا گیا　　زوائد = فضول اور بحث سے خارج باتیں

مبادی = پہلے اصول　　توابع = ساتھ، پیرو

اوّل: ہر مطلوب میں کچھ مبادی ہوتے ہیں، کچھ مقاصد، کچھ زوائد و توابع۔ اصل مقاصد ہوتے ہیں اور مبادی اس سے مقدم مگر مقصود بالعرض اور زوائد اس سے مؤخر مگر غیر مقصود۔ اسی طرح اس طریق میں بھی بعض مبادی ہیں اور وہ چند علوم و مسائل ہیں جو بصیرت فی المقصود کے موقوف علیہ ہیں اور بعض مقاصد ہیں کہ وہی مقصود بالتحصیل ہیں اور ان ہی پر کامیابی اور ناکامی کا مدار ہے اور بعض زوائد و توابع ہیں کہ ان کا وجود نہ معیارِ کامیابی ہے نہ فقدان معیار ناکامی (یعنی غیر مقصود ہیں)

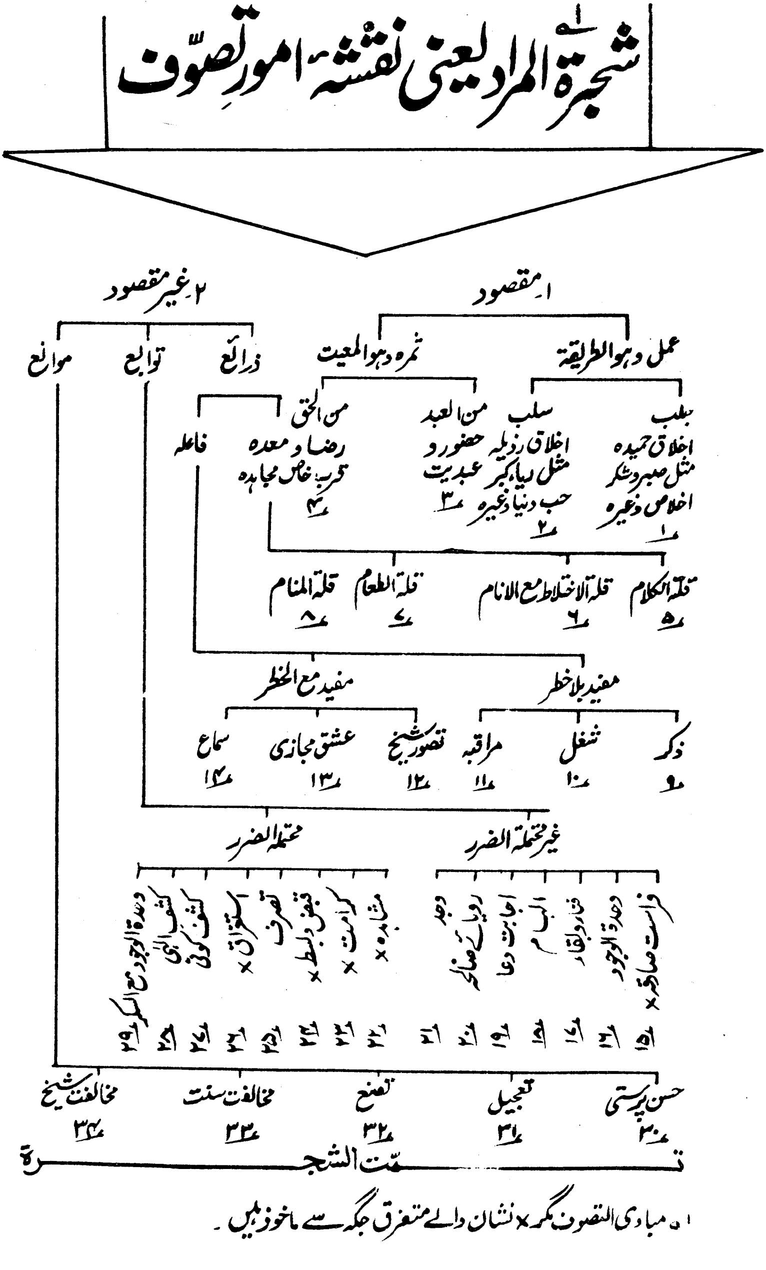
ثانی: منجملہ مبادی کے امرِ اوّل مذکورہ بالا ہے جو غالباً اعظم المبادی و اجمع المبادی ہے۔ اور دوسرے مبادی پر اثنائے سلوک میں وقتاً فوقتاً تنبیہ و اطلاع کیجاتی رہتی ہے اور مقاصد اعمال خاصہ ہیں جو افعال اختیاریہ ہیں جن میں ایک حصہ اعمال صالحہ متعلق بجوارح ہیں جن کو سب جانتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج و دیگر طاعاتِ واجبہ و مندوبہ اور دوسرا حصہ اعمال صالحہ متعلق بقلب و نفس ہیں۔ مثل اخلاص و تواضع و حب حق و شکر و صبر و رضا و تفویض و توکل و خوف و رجا و امثالہا اور ان کے اضداد کا ازالہ اور ان اعمالِ اختیاریہ کو مقامات کہتے ہیں اور یہی نصوص میں مامور بالتحصیل ہیں اور ان کے اضداد مامور بالازالہ والردع۔ اور ان اعمال کی غایت تعلق بحق (یعنی نسبت) و رضائے حق ہے کہ روحِ اعظم سلوک کی یہی ہے اور زوائد احوالِ خاصہ ہیں مثل ذوق و شوق، قبض و بسط، صحو و سُکر، غیبت، وجد، استغراق و اشباہہا۔ اور یہ امور غیر اختیاریہ ہیں۔ اعمالِ مذکورہ پر اکثر ان کا ترتب ہوتا ہے اور گاہ نہیں ہوتا۔ یہ احوال نہ مامور بہا ہیں نہ ان کے اضداد مامور بالازالہ اگر ترتب ہو جاوے محمود ہے۔ اگر نہ ہو تو مقصود میں کچھ خلل نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے المقامات مکاسب والاحوال مواہب (یعنی مقامات اختیار سے حاصل ہوتے ہیں اور کیفیات و احوال عطاء ربی ہیں) پس خلاصہ یہ ہوا کہ طریق میں تین امور مبحوث عنہ ہیں (یعنی تین امور ہیں جن سے بحث کی جاتی ہے۔)

(۱) علوم جن سے مقصود میں بصیرت ہوتی ہے۔ ✓

(۲) اعمال جو کہ مقصود ہیں اور ان کا اہتمام ضروری ہے۔ ✓

(۳) احوال۔ جوکہ مقصود نہیں گو محمود ہیں۔ ان کے در پے ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔

ثالثاً یہ قواعد کلیہ ہیں۔ باقی جزئیات کا ان پر انطباق، اس میں شیخ کی ضرورت ہے کہ اس کا درجہ طبیب کا سا ہے اور طالب کا درجہ مریض کا سا، طبیب سے اپنا حال کہا جاتا ہے۔ وہ نسخہ تجویز کرتا ہے اس کا استعمال کر کے اس کو اطلاع دیجاتی ہے وہ پھر جو رائے دیتا ہے اس پر عمل ہوتا ہے اسی طرح تا حصولِ صحت سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی طرح طریقِ سلوک میں بھی دو امر ہیں اطلاع و اتباع تا حصولِ مقصود یعنی رسوخ نسبت بحق (مطلب یہ کہ جب تک کامل نسبت اور وصول پیدا نہیں ہوتا۔ جملہ امراض سے شیخ کو مطلع کرتا رہے اور اس کی طرف سے تجویز کردہ نسخۂ شفاء کو استعمال میں لاتا رہے)۔



۱۔ مبادی التصوف مگر × نشان والے متفرق جگہ سے ماخوذ ہیں۔

ترتیب حصولِ سلوک اور اس کے عنوانات

یہ[1] سب کچھ جان لینے کے بعد اس بات کا جان لینا بھی ضروری ہے کہ اس راہ میں گامزن ہونے سے پہلے ترتیب سلوک کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ صحیح ترتیب یہ ہے کہ اوّل گناہوں سے توبۂ خالصہ کریں اور کچھ عبادات واجبہ نماز وغیرہ اگر فوت ہوئی ہوں تو ان کا قضا کرنا شروع کر دیں اور اگر ذمہ پر کچھ حقوق العباد ہوں تو ان کے ادا کرنے کے بندوبست میں لگ جاویں یا اہلِ حق سے معاف کرا دیں۔ کیونکہ بدوں اس کے کہ ان سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر عمر بھر بھی ریاضت اور مجاہدہ کریں گے۔ ہرگز مقصودِ حقیقی تک رسائی نصیب نہ ہو گی اور توبہ کے ساتھ آئندہ بھی قوی عزم رکھیں کہ اللہ و رسول کی اطاعت میں گو نفس کو کتنی ہی ناگواری ہو اور گو مال یا جان کا کتنا ہی بڑا ضرر ہو اور گو نفسانی دنیوی مصلحت کیسی ہی فوت ہوتی ہو۔ اور گو خلق کتنا ہی ملامت کرے سب برداشت کریں گے اور اللہ و رسول کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں گے اگر اتنی ہمت نہیں تو وہ طالبِ حق نہیں ہیں۔ کیونکہ طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے۔ شعر ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

(یعنی محبوب کے راستہ کو جو اپنے اندر جسم و جان کے لیے ہزاروں خطرات رکھتا ہے طے کرنے کی اگر خواہش ہو تو اس میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ دیوانہ بنا جائے) جب یہ امور انجام پا جائیں تو بقدر ضرورت علمِ دین حاصل کیا جائے۔ پھر شیخِ کامل کی جستجو کی جائے۔

پس[2] امورِ مذکورہ کی ترتیب کے اعتبار سے عنوانات کی یوں ترتیب ہوئی۔ ارادت[1] و بیعت ریاضت[2] اجمالی و تفصیلی، اذکار[3]، اشغال و مراقبات، احوال[4]، معارف[5] و حقائق اور چونکہ ہر فن میں کچھ اصطلاحات[6] ہوتی ہیں۔ جن کے نہ جاننے سے قوم کے کلام سمجھنے میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر مطلوب میں کچھ موانع[7] پیش آجاتے ہیں اسی طرح کچھ مسائلِ جزئیہ[8] بھی ہوتے

---

[1] : قصد السبیل صد۴ ، [2] تعلیم الدین صد ۹۸ ۔

ہیں۔ اسی طرح کچھ اغلاط[9] بھی لاعلمی سے واقع ہو جاتی ہیں تو اس میں[10] تنبیہ کی حاجت ہے جس کو اصلاحات کہنا چاہیئے۔ بعض امور کسی اشتباہ کے دفع یا کسی مرض باطنی کے علاج یا کسی عمل کے طرز و طریق ہیں۔ اس کو تعلیمات[11] سے تعبیر کرنا مناسب ہے اور بعض امور ظاہر نظر میں حدود جواز سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں اگر واقع میں وہ داخلِ حدود ہیں تو ان کی تاویل اور تطبیق کی جاوے۔ ان کو توجیہات[11] کہنا خوب ہے اور ایسے امور جو ان کلیات سے کسی کی فرد نہ ہوں ان کو متفرقات[12] کہا جائیگا۔ اسی[1] طرح مشائخ کا معمول رہا ہے کہ کچھ کلمات جامعہ بطور وصیت[13] کے طالبین کو فرماتے ہیں۔ بتوفیق اللہ تعالیٰ ان سب مضامین کو الگ الگ ابواب میں بترتیب مذکور لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تکمیل فرمائیں۔ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؀

---

[1] التکشف صہ ۳۱۵ ، [2] تعلیم الدین صہ ۶۹

۳۔ بیعت و ارادت

باب اوّل ——— بیعت کا بیان

عن عوف بن مالك الاشجعى قال كنا عند النبى صلى الله عليه وسلم تسعة او ثمانية او سبعة فقال الا تبايعون رسول الله صلى الله عليه وسلم فبسطنا ايدينا و قلنا على ما نبايعك يا رسول الله، قال على ان تعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا و تصلوا الصلوات الخمس وتسمعوا و تطيعوا ـ

(مسلم، ابو داؤد، نسائی) ـ

حضرت عوف بن مالک اشجعی رح فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ نو آدمی تھے یا آٹھ یا سات۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت نہیں کرتے ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور عرض کیا کہ کس امر پر آپ کی بیعت کریں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا ان امور پر کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور پانچوں نماز پڑھو اور (احکام) سنو اور مانو اس کو مسلم، ابو داؤد و نسائی نے روایت کیا۔

اثبات بیعت اور اس کی حقیقت

حضرات صوفیائے کرام میں جو بیعت معمول ہے جس کا حاصل التزام احکام (یعنی اعمال ظاہری و باطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے جس کو ان کے عرف میں "بیعت طریقت" کہتے ہیں بعض اہل ظاہر اس کو اس بنا پر بدعت کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں۔ صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعت جہاد کرنا معمول تھا مگر اس حدیث میں اس کا صریح اثبات موجود ہے کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہؓ ہیں اس لیے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں

---

[۱] :۔ التکشف صہ ۳۱۷

بلکہ بدلالت الفاظ معلوم ہے کہ التزام و اہتمام اعمال کے لیے ہے پس[1] اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بعدہٗ بوجہ اشتباہِ بیعتِ خلافت کے سلف نے صحبت پر اکتفا فرمایا پھر خرقہ کی رسم بجائے بیعت کے جاری ہوئی جب وہ رسم (بیعت) خلفاء میں نہ رہی تو صوفیہ نے اس مردہ سنت کو پھر زندہ کیا۔

(بیعت[2] کی اصلی حقیقت خود لفظ بیعت و ارادت اور مرید کی اصطلاح بلکہ لفظی معنی ہی سے واضح ہو جاتی ہے ارادہ محض آرزو اور تمنّا کا نام نہیں۔ بلکہ مراد کو پورا کرنے کے لیے ضروری اسباب و وسائل کی بہم آوری میں لگ جانا یا منزل مقصود کی طرف چل پڑنا ہے پس مرید بھی اصطلاحاً وہ ہے جو اپنی دینی خصوصاً باطنی و قلبی اصلاح و درستی کو مراد و منزل بنا کر اس کے ضروری وسائل اختیار کرتا اور اس کی طرف چل پڑتا ہے اور بیعت کے معنی ہیں اس منزل مقصود کے لیے کسی زیادہ واقف کار کو رہبر و رفیق بنا لینا اور اس کے پیچھے یا ساتھ چلنا تاکہ نہ صرف گمراہی کے خطرات سے حفاظت ہو بلکہ راستہ سہولت و راحت سے قطع ہو۔ بالفاظ دیگر اپنے سے زیادہ واقف و ماہر مصلح کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سونپ دے جیسے مریض کسی حاذق طبیب کے حوالے اپنے کو کر دیتا اور وہ پرہیز میں کاملاً اس کی تجویز و ہدایت پر عمل کرتا ہے۔

پیری و مریدی یا بیعت و ارادت کی حقیقت و ضرورت میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے ایک طرف اس کو سرے سے بعضوں نے بدعت سمجھ رکھا ہے اور دوسری طرف صرف ایک رسم بنا رکھا ہے کہ بس دست بوسی و پابوسی کر لی باقی خود کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں حالانکہ) نری پیری مریدی میں کچھ نہیں رکھا اصل کام خود چلنا ہے اور کسی رہبر کا ہاتھ پکڑنا۔ اگرچہ (رسمی) مرید کسی سے بھی نہ ہو یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے سے برکات کچھ نہیں لیکن اس کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے (بلکہ) اصلی[3] غرض اور مقصود سلوک کا رضائے حق کو سمجھے جس کا طریق احکام شرعیہ کا بجا لانا اور ذکر پر مداومت کرنا ہے شیخ اس کی تعلیم و تلقین کرتا ہے اور مرید اس پر کاربند ہوتا ہے اگرچہ کوئی کیفیت

---

[1] تعلیم الدین ص۲۷، [2] تصوف و سلوک ص۹۹، [3] قصد السبیل ص۸

معلوم نہ ہو اور نہ کوئی کمال اس کے زعم میں حاصل ہو، تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ جو کہ رضا ہے ظاہر ہوگا اور رضا سے دخول جنت و لقاء حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔
اور شیخ کی طرف سے تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اتباع کا عہد یہی پیری مریدی کی حقیقت ہے اور گویا تعلیم بدون بیعت متعارفہ (یعنی مشہورہ) بھی ممکن ہے لیکن خاص طور پر بیعت کرنے میں طبعاً یہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور مرید کو پاس فرمانبرداری زیادہ ہو جاتا ہے اور شیخ کی تعیین (یعنی ایک معین شخص ہونا) اور وحدۃ (یعنی ایک ہی ہونے) میں بھی یہی حکمت ہے کہ اس سے جانبین کو خصوصیت بڑھ جاتی ہے اور باقی ہاتھ میں ہاتھ لینا یا عورت کو کوئی کپڑا وغیرہ پکڑا دینا جب کہ وہ پاس ہو یہ محض ایک معاہدہ کی تاکید کے لیے ایک عادتِ صالحہ مستحسنہ ہے اور معاہدہ کا جزو نہیں (نہ مقصود ہے نہ کسی مقصود کا موقوف علیہ) اسی وجہ سے غائب کے لیے اس کی رسم نہیں (یعنی غائب کی بیعت بغیر ہاتھ میں ہاتھ لیے بذریعہ تحریر وغیرہ بھی ہو جاتی ہے) اور اس کا استحسان سنت میں بھی وارد ہے۔ چنانچہ مردوں کے لیے ہاتھ پکڑنا منقول ہے اور کپڑا وغیرہ ہاتھ میں دینا یہ ہاتھ پکڑنے کے قائم مقام ہے۔

بیعت کی ضرورت

[1] یہ تحقیقی ہے کہ بیعت طریقت کی ضرورت عام نہیں لیکن باوجود اس کے پھر بھی نفس میں بعض امراض خفیہ ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا اور جو[2] معلوم ہوتا ہے نفس کی کشاکشی سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے ان ضرورتوں سے پیر کامل کو تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے اور ان کا علاج و تدبیر بتلاتا ہے کیونکہ[3] خود اپنی حالت کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت سے مغالطے دیکھ چکا ہے اور بہت سے گرم و سرد دیکھ چکا ہے۔ جو پریشانی تم کو پیش آتی ہے وہ اس کو بارہا پیش آ چکی ہے اس کو بھی کسی صاحبِ بصیرت نے سنبھالا تھا بار بار تجربہ ہونے سے اس کو پوری بصیرت حاصل ہو گئی ہے تو وہ ہر

۱: انفاس عیسیٰ ص۱۶، ۲: قصد السبیل ص۳۸ ۳: الباطن ص۵۹

حالت کو پہچانتا ہے کہ اس میں کتنا حق اور کتنا باطل شامل ہے اور کتنی واقعیت اور کتنا دھوکہ ہے اور اپنے آپ اپنی حالت کو اگر کوئی شخص کسی وقت پہچان بھی لے لیکن اپنی تشخیص پر اطمینان نہیں ہو سکتا۔ پوری پہچان اسی کو ہے جو بارہا تجربہ کر چکا ہے پھر اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی مدد بھی شامل ہوتی ہے اس کا بتایا ہوا علاج سہل اور کامل ہوتا ہے (کوئی شخص کتنا ہی عالم فاضل ہو۔ اور طب کی کتابیں بھی پڑھ لیتا ہو مگر باقاعدہ کسی طبیب کے پاس رہ کر مشق نہ کی ہو اگر وہ خود اپنا علاج محض کتابی نسخوں سے کرنے لگے تو خطرے کا باعث نہیں تو اور کیا ہے۔ لہٰذا) کتب[1] طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے۔ اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے تھے۔ میں نے کہا لاؤ اس کو لکھ لیں۔ جب بخار آیا کرے گا تو اس کو استعمال کر لیا کریں گے۔ چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا مگر خاک نفع نہ ہوا۔ آخر کار حکیم صاحب کو بلایا انھوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہوا۔ پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صفراء کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں اب اگر میں نے یہ نسخہ بھی نقل کر لیا کہ چلو اس میں صفراء و بلغم دونوں کی رعایت ہے تو اس کا اندازہ کیسے ہو تا کہ اس سال بلغم صفراء سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم ہے اس کا اندازہ تو طبیب ہی کر سکتا ہے جو نبض کی حالت کو پہچانتا ہو اس لیے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے۔

غرض[2] نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بغیر رفیق سیدھا رستہ ملتا ہے اگر ایک نابینا کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اوّل اس کو خود چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے نہیں تو ہزار رفیق بھی ملنے پر راستہ قطع نہ ہو گا۔ البتہ چلنے کے بعد رہبر اور رفیق کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو نابینا راستہ میں ضرور کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرے گا۔ بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے کہ اپنے پیروں چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑ لے بالکل ویسی ہی حالت اس راستہ کی بھی ہے کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا ہے اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا

---

[1] : الرغبۃ المرغوبہ صد۲۱ ، [2] : تصوف و سلوک صد۱۰۹

ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

(الغرض) عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کمال بدون استاد کے حاصل نہیں ہوتا تو جب اس راہ (طریقت) میں آنے کی توفیق ہو۔ استادِ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہیئے جس کے فیضِ تعلیم و برکتِ صحبت سے مقصودِ حقیقی تک پہنچے۔ اشعار ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دِلا　　دامن رہبر بگیر و پس بیا

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق

(یعنی اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ کے چلو۔ اس لیے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چلا۔ اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہوا اور) مولانا رومؒ[۲] فرماتے ہیں۔ شعر ؎

یار باید راہ را تنہا مرو　　بے قلاوز اندریں صحرا مشو

(یعنی باطنی راستہ کے لیے کوئی رفیق ساتھ لے لو۔ تنہا اس راستہ کو طے کرنے کا ارادہ نہ کرو کیونکہ تم تنہا اس کو قطع نہیں کر سکتے)۔

باب دوم۔ شیخ کامل کا بیان

عن ابی ھریرۃ[۳] قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ،	حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریق پر ہوتا ہے۔ سو فرد دیکھ بھال لیا کرے کہ کس کے ساتھ دوستی کرتا ہے۔
(اخرجہ ابو داؤد والترمذی)	(ابو داؤد و ترمذی شریف)

ظاہر ہے کہ پیر سے اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے اور جب معمولی دوستی دین کے اندر مؤثر ہے تو اتنی بڑی دوستی اس تاثیر سے کیسے خالی رہے گی چنانچہ مشاہدہ ہے کہ پیر کے عقائد و اعمال و اخلاق کا اثر مرید میں سرایت کرتا ہے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم استحسان ہی کے درجہ میں ضرور

---

[۱] تعلیم الدین ص۲، [۲] الغانی ص۷، [۳] التکشف ص۲۷۷

اثر کرتا ہے یعنی مریدان امور کو مستحسن سمجھتا ہے پس اگر پیر کی حالت خراب ہوئی تو مرید کا خراب ہونا ظاہر ہے اس لیے تلاش پیر میں بڑی احتیاط چاہیئے۔ اس میں زیادہ تر بے پروائی برتی جاتی ہے جس کی اصلاح واجب ہے۔

چونکہ[1] بدوں علامات تلاش ممکن نہیں اس لیے اس مقام پر شیخ کامل (کی حقیقت اور اس) کے شرائط و علامات مرقوم ہوتے ہیں۔

شیخ کامل کی اہمیت اور اس کی پہچان

کارِ مرداں[2] روشنی و گرمی ست　　　کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی ست

روشنی سے مراد نور ایمان و عرفان، گرمی سے مراد گرمیِ عشق۔ اس میں اشارہ ہے شیخ کامل کی پہچان کیطرف کہ ان کے یہ صفات ہیں (معرفت اور عشق الٰہی) اور جو کمینے اور جھوٹے ہیں ان کی عادت حیلہ (مکر و فریب) اور بیحیائی ہے۔

مولانا رومیؒ نے شیخ کامل کی علامات اجمالاً بیان فرمائی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح مرضِ ظاہری کے علاج کے لیے ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو خود بھی صحیح و تندرست ہو، مریض نہ ہو اور دوسروں کا علاج بھی کر سکے کیونکہ اگر مریض ہے تو مسئلہ طبیہ ہے "رأی العلیل علیل" (یعنی بیمار کی رائے بھی بیمار ہے) گو وہ طبیب ہو مگر اس کی رائے قابلِ اعتبار نہیں۔ اور اگر وہ خود صحیح و تندرست ہے مگر علاج کا طریقہ نہیں جانتا تب بھی اس مریض کے مطلب کا نہیں۔ گو خود اچھا ہے اسی طرح امراض باطنی کے علاج کے لیے ایسے مرشد کی ضرورت ہے جو خود بھی متقی اور صالح ہو۔ مبتدع (اہلِ بدعت) و فاسق نہ ہو اور دوسروں کی تکمیل بھی کر سکتا ہو کیونکہ اگر بدعقیدہ و بدعمل ہے تو اولاً اس پر یہ اطمینان نہیں کہ یہ خیر خواہی سے تعلیم کرے گا بلکہ غالب تو یہی ہے کہ عقیدہ میں اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرے گا اور عمل میں اس کو اس لیے نصیحت نہ کر سکے گا کہ خود اس کا عامل نہیں یہی خیال ہو گا کہ اگر نصیحت کروں گا تو یہ شخص اپنے دل میں کیا کہے گا بلکہ غالب یہ ہے کہ خود بھلا

---

[1] تعلیم الدین ص۲۰، [2] التکشف ص۶۸

بننے کو اپنی بدعملی کو تاویل سے درست کرنا چاہے گا تو اس میں بڑی گمراہی کا اندیشہ ہے۔ ثانیاً اس کی تعلیم میں انوار و برکات و تاثیر و امداد غیبی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر متقی و صالح تو ہو مگر تربیت باطنی کا طریقہ نہ جانتا ہو تو بھی طالب کی رفعِ ضرورت نہیں کر سکتا اور جس طرح طبیب ظاہری کا طبیب ہونا ان علامات سے معلوم ہوتا ہے کہ علمِ طب پڑھا ہو کسی طبیب کامل کے پاس مدت معتد بہ تک مطب کیا ہو۔ سمجھدار لوگ اس کی طرف رجوع ہوں اس کے ہاتھ سے لوگ شفایاب بھی ہوتے ہوں اسی طرح طبیب باطنی یعنی شیخ کے شیخ ہونے کی علامات یہ ہیں کہ:۔

(۱) علمِ شریعت[1] سے بقدر ضرورت واقف ہو۔ خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے تاکہ فسادِ عقائد و اعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے۔ ورنہ بمصداق ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

(۲) عقائد، اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

(۳) تارک دنیا۔ راغب آخرت ہو۔ ظاہر و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔

(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔

(۵) بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو۔ ان سے فیوض و برکات حاصل کئے ہوں

(۶) تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو اور ان کی کوئی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۷) جو لوگ اس سے بیعت ہیں ان میں اکثر کی حالت باعتبار اتباعِ شرع وقلتِ حرصِ دنیا کے اچھی ہو۔

(۸) اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

(۹) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

(۱۰) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

---

[1] (۱) (۳)/(۵) از تعلیم الدین ص۱۴۲، (۲)، (۴)، (۶ تا ۱۱) از قصد السبیل ص۵

(۱۱) خود بھی ذاکر و شاغل ہو۔ کیونکہ بدون عمل یا عزمِ عمل، تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

(۱۲) مصلح ہو۔ نرا صالح ہونا کافی نہیں۔ شیخ ہونے کے لیے دونوں کے جمع کی ضرورت ہے کہ صالح بھی ہو اور مصلح بھی ہو (یعنی، فن کا جاننا اور اس میں مہارت ہونا ضروری ہے (تاکہ) جو مرض باطنی بیان کرو۔ اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے جو علاج تجویز کرے اس سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کی اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جاوے۔

جس[۲] شخص میں یہ علامات ہوں۔ پھر نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں۔ یا یہ شخص صاحبِ تصرفات ہے یا نہیں۔ یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں یا یہ جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہ امور لوازمِ مشیخت یا ولایت سے نہیں۔ اسی طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغِ لبسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی سے نہیں۔ اصل میں یہ ایک نفسانی تصرف ہے جو مشق سے بڑھ جاتا ہے۔ غیر متقی بلکہ غیر مسلم بھی کر سکتا ہے اور اس سے چنداں نفع بھی نہیں کیونکہ اس کے اثر کو بقا نہیں ہوتا۔ صرف مریدِ غبی کے لیے جو ذکر سے اصلاً متاثر نہ ہوتا ہو چند روز تک شیخ کے اس عمل سے اس میں ایک گونہ تاثر و انفعال قبول آثار ذکر کا پیدا ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لوٹ پوٹ ہی ہو جاوے۔

طریقِ کار اکثر[۳] درویشوں سے ملتا رہے جن پر احتمال کمال کا ہو اور کسی کی عیب جوئی اور انکار میں مبادرت (اور پیشقدمی) نہ کرے۔ مگر جلدی سے بیعت بھی نہ کرے۔ اول یہ دیکھے کہ شریعت پر مستقیم ہے یا نہیں۔ اگر مستقیم نہیں اس سے علیحدہ ہو۔ گو خوارق وغیرہ اس سے صادر ہوتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا	جس کے دل کو اپنی یاد سے ہم نے غافل کر دیا اور وہ اپنی
وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الآیہ)	خواہش کا پیرو ہے اور اس کا کام حد سے بڑھا ہوا ہو اس کا کہنا مانو

اور اگر شرع پر مستقیم ہے تو خود اس کا نیک اور ولی ہونا تو ثابت ہو گیا مگر اس شخص کو تو تربیت و تکمیل

---

[۱] کمالاتِ اشرفیہ صہ ۱۱۶ [۲] قصد السبیل صہ ۲ [۳] تعلیم الدین صہ

کی ضرورت ہے اس لیے ابھی بیعت نہ کرے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ اس کی صحبت سے قلب میں کچھ اثر (یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت، دنیا و معاصی سے نفرت) پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ حدیث شریف میں اولیاء اللہ کی یہی علامت آئی ہے۔

اِذَا رُءُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ (یعنی جب انھیں دیکھیں تو اللہ یاد آئے)۔

اکثر عوام کو تھوڑی صحبت میں اس کا محسوس کرنا دشوار ہے۔ اس وقت یوں چاہیے کہ اس کے مریدوں میں سے جس کو عاقل راست گو دیکھے۔ اس سے شیخ کی تاثیر کا حال دریافت کرے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (الآیۃ) اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو

اور حدیث شریف میں ہے:۔

اِنَّمَا شِفَآءُ الْعِیِّ السُّؤَالُ جہل کی شفا اور دوا اوروں سے سوال کرنا اور دریافت کر لینا ہے اگر کوئی معتبر آدمی شہادت دے تو اس کا اعتبار کرے اور جو بہت آدمی ویسی ہی شہادت دیں تو زیادہ اطمینان کا باعث ہے مگر وہ گواہی دینے والے قرائن سے سچے معلوم ہوتے ہوں۔ مریداں ہمی پرانند (یعنی مرید پیروں کو بڑھا چڑھا دیتے ہیں) کے مصداق نہ ہوں اور اگر خود وہاں نہ جا سکے یا اتنی فرصت اور ہمت نہ ہو تو دوسرا طریق مکاتبت طویلہ ہے۔ یعنی (بذریعہ تحریر) اس سے کچھ طریق پوچھ کر اس پر عمل کرے۔ پھر اپنے احوال سے اس کو اطلاع دے۔ پھر جو وہ تجویز کرے اس کا اتباع کرے۔ اسی طرح مدت دراز تک کرتا رہے۔ بعد اس کے اگر دل چاہے بیعت کی درخواست کرے۔ پھر دوسرا جو کچھ جواب دے۔ اسی پر راضی رہے۔

لے کمالاتِ اشرفیہ ص ۱۵۷۔

باب سوم: مناسبت شیخ و مرید کا بیان

عَنْ ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ، مَا تَعَارَفَ مِنْھَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاکَرَ مِنْھَا اخْتَلَفَ، اخرجہ مسلم و ابو داؤد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ارواح شکر کے لشکر ہیں۔ جو (عالم ارواح میں) مجتمع تھیں جن میں (وہاں) باہم جان پہچان ہوئی ان میں (یہاں بھی) باہم الفت ہے اور جن میں جان پہچان نہیں ہوئی۔ ان میں اختلاف مزاج ہے۔

یہ امر تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوض باطنی کے لیے پیر و مرید کی باہمی مناسبت نطری شرط ہے۔ اس حدیث کے عموم میں یہ مناسبت بھی داخل ہے۔ کیونکہ نفع عادۃً الفت پر موقوف ہے اور بنصِ حدیث الفت عالم ارواح کے تعارف پر موقوف ہے جو مناسبت فطری کی حقیقت[1] اور یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر مشائخ طالب کو اپنے پاس سے (بعض دفعہ) دوسرے شیخ کے پاس جس سے مناسبت مظنون یا مکشوف ہو بھیج دیتے ہیں (کیونکہ)[2] اس طریق میں مصلح کے ساتھ مناسبت ہونا بڑی (ضروری) چیز ہے۔ بدوں مناسبت کے طالب کو نفع نہیں ہو سکتا اور مناسبت شیخ (جو افاضہ و استفادہ کا مدار ہے) کے معنی یہ ہیں کہ شیخ سے مرید کو اسقدر مناسبت ہو جاوے کہ شیخ کے کسی قول و فعل سے مرید کے دل میں طبعی نکیر نہ پیدا ہو گو عقلی ہو یعنی شیخ کی سب باتیں مرید کو پسند ہوں اور مرید کی سب باتیں شیخ کو پسند ہوں اور یہی مناسبت بیعت کی شرط ہے (لہٰذا) پہلے مناسبت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے اس کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک یہ نہ ہو۔ مجاہدات، ریاضات، مراقبات و مکاشفات سب بیکار ہیں کوئی نفع نہ ہوگا۔ اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو عقلی پیدا کر لی جائے۔ اسی پر نفع موقوف ہے۔ اس لیے جب تک پوری مناسبت نہ ہو بیعت نہ کرنی چاہیئے جب پوری طرح راہ پر پڑ جاوے۔ خوب محبت (اور مناسبت) ہو جاوے اس وقت پیر سے بیعت زیادہ نافع ہے۔

---

[1] التکشف صـ ۲۹۶ [2] کمالات اشرفیہ صـ ۲۷۸، ۵۵، ۳۰۷، ۲۱۶

باب چہارم: صحبتِ شیخ کا بیان

عن حنظلة (فی حدیث طویل) فَاِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهٖ عَافَسْنَا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ وَالضَّیْعَاتِ وَنَسِیْنَا کَثِیْرًا فَقَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ تَدُوْمُوْنَ عَلٰی مَا تَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ اَوْ فِی الذِّکْرِ لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلٰئِکَةُ عَلٰی فُرُشِکُمْ وَفِیْ طُرُقِکُمْ وَلٰکِنْ یَاحَنْظَلَةُ سَاعَةً وَّ سَاعَةً ثَلٰثَ مَرَّاتٍ (اخرجہ مسلم والترمذی)

حضرت حنظلہ رضؓ سے روایت ہے (لمبی حدیث میں) پھر جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آتے ہیں تو بیوی بچوں اور معاملات جائداد میں آلودہ ہو جاتے ہیں اور بہت سی باتوں کا خیال بھی نہیں رہتا۔ آپؐ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جس حالت میں میرے پاس ہوتے ہو۔ اگر تم لوگوں کو اس حالت پر یا یہ فرمایا کہ ذکر میں دوام ہو جائے تو تم سے بستروں اور سڑکوں پر فرشتے مصافحہ کرنے لگیں لیکن اے حنظلہ! ایک ساعت کیسی ایک ساعت کیسی یہ مضمون آپؐ نے تین بار فرمایا (اسکو مسلم و ترمذی نے روایت کیا)

جس طرح مجاہدات و ریاضات سے کسی کیفیت کا ورود ہوتا ہے اسی طرح شیخ کی صحبت اور خطاب سے بھی ہو جاتا ہے گو اس کو مثل اثر ریاضت کے رسوخ اور بقا نہیں ہوتا چنانچہ حضرت حنظلہ رضؓ کا یہ فرمانا کہ خدمت مبارک سے علیحدہ ہو کر تعلقات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بہت سی باتیں یاد نہیں رہتیں اس سے ناشی ہے جس کا سبب بُعدِ خدمت نبویؐ ہے۔

صحبتِ شیخ کی ضرورت

(بیعت[۲] کی اصلی بڑی ضرورت یہی رفاقت یا پیر کی صحبت و تعلق ہے تاکہ راستہ کے خطرات یا اس کی ٹھوکر وں سے حفاظت ہو) علم[۳] چاہے ہو یا نہ ہو بلکہ علم بھی بلا صحبت کے بیکار ہے۔ "صاحبِ صحبت بلا علم" کی اصلاح "صاحب علم بلا صحبت" سے زیادہ ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ سب کے سب عالم نہ تھے مگر ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہاء اور بڑے سے بڑے اولیاء و اقطاب

---

[۱] التکشف ص ۲۴۰ ، [۲] تصوف و سلوک ص ۱۱۰ [۳] کمالات اشرفیہ ص ۱۷۷

پر مسلّم ہے۔ اس فضیلت کا مدار محض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر ہے) صرف صحبت سے پایا جو کچھ پایا اور ہمیشہ اہل اللہ نے صحبت ہی کا التزام رکھا۔ اتنی توجہ علم کی طرف نہیں کی جتنی صحبت کی طرف کی۔

بھلا[1] نری کتابوں سے بھی کوئی کامل مکمل ہوا ہے۔ موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کہ بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لیکر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جاسکے گا بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنولیس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز کوئی خوشنولیس نہیں ہو سکتا۔ غرض بدوں کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا۔

صحبت[2] صالح ترا صالح کند　　صحبت طالح ترا طالح کند

ہر کہ خواہد ہمنشینی با خدا　　گو نشیند در حضورِ اولیاء

یک زمانہ صحبت با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

(مطلب یہ ہے کہ) نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک بنا دے گی۔ اسی طرح بدبخت کی صحبت تم کو بدبخت بنا دے گی۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی ہمنشینی کا طالب ہو تو اس کو اولیائے کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہیئے۔ اللہ والوں کی تھوڑی دیر کی صحبت سو سالہ بے ریا طاعت (عبادت) سے بہتر ہے۔ نیکوں کی صحبت اگر ایک گھڑی بھی نصیب ہو جاوے تو وہ سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے۔

(ان اشعار اور ان کے مطلب سے جو بات سمجھ میں آتی ہے)[3] وہ یہ ہے کہ کامل کی صحبت میں بعض اوقات کوئی گُر ہاتھ آجاتا ہے یا کوئی حالت ایسی قلب میں پیدا ہو جاتی ہے جو ساری عمر کے لیے مفتاحِ سعادت بن جاتی ہے۔ ہر وقت یا ہر ساعت مراد نہیں بلکہ وہی وقت اور وہی ساعت مراد ہے جس میں یہ حالت میسّر ہوگی۔ ہر صحبت میں اس کا احتمال ہے اس لیے ہر صحبت کا اہتمام چاہیئے اس سے ہر صحبت کا مفید اور نافع ہونا ظاہر ہے اور اس حالت کو

---

[1] تصوف و سلوک ص۱۱۱، [2] اختیار الخلیل ص۱۷۱، [3] کمالات اشرفیہ ص۲۲۹۔

صد سالہ طاعت کے قائم مقام بتلانے کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے اگر کسی شخص کے پاس سو اشرفیاں ہوں تو بظاہر تو اس کے پاس اَمتِعَہ (یعنی اسباب میں) سے کوئی ایک چیز بھی نہیں لیکن اگر ذرا تعمق کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر چیز اس کے قبضہ میں ہے (کیونکہ اشرفیوں سے اسباب خریدا جا سکتا ہے) اسی طرح اگر وہ کیفیت اس کے اندر پیدا ہو گئی تو بظاہر تو خاص طاعات میں سے کوئی بھی چیز اس کے پاس نہیں مگر حکماً ہر چیز ہے پس مراد (اس سے اعمال پر قدرت ہونا ہے اس سے اس کے سب کام بن جاویں گے اور اصل چیز وہی کام ہے جنکی یہ مفتاح (چابی) صحبت میں نصیب ہو گئی۔ اگر وہ اعمال نہ کیے تو نری مفتاح کس کام کی؟ اسی لیے یہ کہتا ہوں کہ بدوں اعمال نہ کچھ اعتبار اقوال کا ہے نہ احوال کا، نہ کیفیات کا۔ اس لیے ان چیزوں میں سے کسی چیز میں بھی خطہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر اعتبار کے قابل کوئی چیز ہے تو وہ اعمال ہیں اور اعمال بلا توفیقِ حق کے مشکل اور حق تعالیٰ کی توفیق عادۃً صحبتِ کامل پر موقوف ہے۔[1]

صحبتِ شیخ[2] میں طالب در دیدہ طور پر اپنے اندر اخلاق کو لے لیتا ہے (صحبتِ نیکاں کے متعلق یہ قطعہ بہت عجیب اور مناسب ہے) ؎

گِلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلآویزِ تو مستم
بگفتا من گِلِ ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(ترجمہ:۔ ایک دن حمام میں ایک محبوب کے ہاتھ سے ایک خوشبودار مٹی مجھ کو ملی، میں نے اس سے کہا تو مشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری دلآویز خوشبو سے میں مست ہو گیا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں ناچیز اور معمولی مٹی تھی مگر ایک مدت پھول کے ساتھ میری صحبت رہی، میرے ہم صحبت کی خوبی نے مجھ میں اثر کیا۔ ورنہ میں تو وہی خاک ہوں جیسی کہ پہلے تھی)

(اسی طرح) صحبتِ شیخ میں خاصیت ہے کہ:۔

---

[1] کمالات اشرفیہ صد ۱۹۱ [2] تصوف و سلوک صد ۱۱۱۔

(۱) شیخ کے اندر جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آئے گی۔
(۲) اگر اصلاح[۱] کامل نہ بھی ہو تو کم از کم اپنے عیوب پر ہی نظر ہونے لگتی ہے یہ بھی کافی اور مفتاحِ طریق ہے۔
(۳) اخلاق و[۲] عادات میں اس کا اتباع کرے گا اذکار و عبادات میں نشاط اور ہمت کو قوت ہوگی۔
(۴) جو حال غریب (یعنی عجیب) پیش آوے گا اس باب میں اس سے تشفی ہو جاوے گی۔
(۵) جو افادات[۳] زبانی سننے میں آتے ہیں وہ تحقیقات و مسائل کے خلاصہ ہوتے ہیں جس سے اپنی حالت بھی وضوح کے ساتھ منکشف ہوتی ہے۔
(۶) ان اہلِ صحبت میں جو با برکت ہوتے ہیں وہاں ایک نفع صحبت کی برکت اور ان کے طرز عمل سے سبق لینا ہوتا ہے۔
(۷) عمل کا شوق بڑھتا ہے۔
(۸) اپنی استعداد معلوم ہو جاتی ہے۔
(۹) اہلِ محبت کی صحبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔
(۱۰) مشائخ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے با برکت ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تعلیم میں بھی برکت ہوتی ہے جس کی وجہ سے جلد شفا ہو جاتی ہے۔ خود کتابیں دیکھ کر علاج کرنا کافی نہیں
(۱۱) اہل اللہ کی صحبت کے مؤثر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بار بار اچھی باتیں جب کان میں پڑیں گی تو کہاں تک اثر نہ ہوگا ایک وقت چوکو گے، دو وقت چوکو گے، تیسری دفعہ تو اصلاح ہو ہی جاوے گی۔ اور ایک سبب باطنی بھی ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے پاس رہو گے اور تعلق بڑھاؤ گے تو اس سے دو طرح اصلاح ہوگی ایک تو یہ کہ وہ دعا کریں گے۔ اور ان کی دعا مقبول ہوتی ہے تو حق تعالیٰ تم پر فضل فرمائیں گے اور اکثر یہ ہے کہ ان کی دعا باذنِ حق ہوتی ہے تو ان کے منہ سے دعا نکلنا اس بات کی علامت سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کے فضل ہونے کا وقت آگیا ہے۔ دوسری وجہ بڑی خفی ہے وہ یہ کہ تمہارے

---

[۱] کمالات اشرفیہ صـ۱۰۲ [۲] قصد السبیل صـ۱۰ [۳] انفاس عیسیٰ صـ۲۹،۳۰

اعمال میں ان کی محبت سے برکت ہوگی اور جلد جلد ترقی ہوگی اور جلد اصلاح ہو جائے گی ۔

۱۲) ان[1] حضرات کے دل خدا کے نور سے روشن ہیں ، ان کے پاس رہنے سے نور آتا ہے اور جب نور آتا ہے تو ظلمت بھاگ جاتی ہے ۔ بس اس نور سے ہر چیز کی حقیقت کھل جاتی ہے ۔ اور شبہ جاتا رہتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو بدوں پاس رہے ۔ صرف ان حضرات کا دیکھ لینا ہی کافی ہو جاتا ہے اور اگر اس درجہ کی سلامتی نہ ہو تو البتہ پھر چند دنوں کی صحبت کی بھی ضرورت ہے ۔

طریق کار

صحبت[2] پرہیز کے ساتھ اختیار کی جائے ۔ پرہیز یہ ہے کہ اہل دنیا کی صحبت سے بچیں ۔ اور اہلِ دنیا وہ ہیں جو غیر اللہ کا تذکرہ زیادہ کریں (جنکی صحبت کی جائے) ان[3] کی طرف سے دل میں بداعتقادی اور انکار رکھ کر وہاں نہ رہیں ۔ اگر پورا اعتقاد نہ ہو تو کم از کم دل میں اتنی گنجائش تو ضرور ہو کہ شاید ان کی بات صحیح ہو ۔

جب[4] شیخ کامل میسر ہو جاوے اور اس سے بیعت کا ارادہ کریں تو اب بعد بیعت کے اگر وقت اور مہلت میسر ہو تو چندے اس کی خدمت میں رہیں اور اگر اس کی نوبت نہ آوے تو غائبانہ ہی اس کی تعلیم پر کاربند رہیں اور اگر ابتدا میں ذرا زیادہ اور اس کے بعد کبھی کبھی شیخ کی صحبت نصیب ہو جاوے تو نورٌ علی نور ہے

مطالعۂ کتب

اگر اہل اللہ[5] کی صحبت میسر نہ ہو تو کم از کم ان کے ملفوظات وغیرہ کا مسلسل بنظرِ اصلاح واستفادہ ، مطالعہ نہ صرف دین کی فہم وبصیرت کے لیے ضروری ہے ۔ بلکہ اس سے اہل اللہ کا ایمان وعمل ہمارے اندر منتقل ہوتا اور قالب سے تجاوز کر کے قلب اور روح میں اتر تا یا رچ جاتا ہے (حضرت مجدد الملّت حکیم الامّت الشاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرّہ العزیز نے بھی براہ راست صحبت میسر نہ آنے کی صورت میں بزرگوں کے ملفوظات اور تقاریر ہی کے مطالعہ کی ہدایت فرمائی ہے بشرطیکہ نیت دینی وباطنی اصلاح واستفاضہ کی ہو ، نہ کہ آجکل کی طرح علمی وادبی تحقیق وتنقید کی ۔ خود حضرت حکیم الامّت رح کے ملفوظات اور تقاریر

---

[1] ملخصاً ۱۱۸ – ۱۱۷ ، تسہیل قصد السبیل صفحہ ۳۰۳ آداب شیخ و مرید [2] آداب ارشاد صفحہ ۵ [3] الجمعین صفحہ ۳۹ [4] قصد السبیل صفحہ ۱۰۰۶ [5] تصوف وسلوک صفحہ ۱۱۸ – ۱۱۷ ملخصاً

کو بالخصوص اس لیے پڑھنا چاہیئے کہ وہ قدیم بزرگوں کے ملفوظات سے نسبتاً وقت کے حالات اور تجدیدات کے مناسب ہیں۔ ان سے نہ صرف غلطیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا۔ بلکہ تصوّف کے ساتھ ساتھ نفسِ دین سے متعلق جو بدگمانیاں تھیں وہ بھی دور ہوگئیں اور طالبانہ ذوق وشوق پیدا ہوگیا)۔

۴ اعمال

باب اول[۱]: ریاضت ومجاہدہ کا بیان

عن فضالة الكامل قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله (رواه البيهقي)	حضرت فضالہ کامل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے [روایت کیا اس کو بیہقی نے (مشکوٰۃ شریف]

مجاہدہ نفس کو بزرگوں کے ملفوظات میں "جہادِ اکبر" کہا گیا ہے۔ اس حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کی ترکیب "المجاهد الخ" جس سے ظاہراً حصر جنس مستفاد ہوتا ہے۔ جو حصر کمال کے لیے مستعمل ہوتا ہے كما لا يخفى على اهل العلم (ترجمہ: جیسا کہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں) پس معنی یہ ہوئے کہ "مجاہدِ کامل" مجاہدِ نفس ہے تو ظاہر بات ہوئی کہ جہادِ کامل جہادِ نفس ہے اور کامل اور اکبر کے ایک ہی معنی ہیں۔

ریاضت ومجاہدہ کی حقیقت

مجاہدہ[۲] امور مقاصد (یعنی ضروری کاموں) میں سے ہے کیونکہ مامور بہ فی الشرع ہے (یعنی شریعت میں اس کا حکم ہے) نصوص میں جا بجا مجاہدہ کا ذکر ہے پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہیئے جو شریعت

۱۔ التکشف صہ ۴۳۹ ، ۲۔ اشرف المسائل صہ ۳۴ ۔

نے بتلائی ہے (اس لیے کہ مجاہدہ تمام عبادات بلکہ تمام شریعت کی روح ہے۔ کیونکہ سارے دین کا خلاصہ مجاہدہ ہی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ لغت میں مشقّت کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں مخالفتِ نفس کا نام مجاہدہ ہے اور اس کا حاصل بھی مجاہدہ ہی ہے کیونکہ مخالفتِ نفس میں تعب ضرور ہوتا ہے اور دین کا خلاصہ بھی مشقّت ہی ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ نفس کے اوپر پابندی لازم ہوتی ہے اور نفس پر پابندی گراں ہے وہ تو طبعی طور پر آزادی کا طالب ہے اس لیے نفس پر اعمالِ دینیہ شاق ہوتے ہیں اور اسی لیے دین کا نام تکلیف ہے اور احکامِ شرعیہ کو احکامِ تکلیفیہ کہا جاتا ہے اور عبد کو مکلف کہتے ہیں۔ تو مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق و عادت ہے کہ حق تعالیٰ کی رضا و طاعت کے مقابلہ میں نفس کی جانی و مالی اور جاہی خواہشات و مرغوبات کو مغلوب رکھا جا سکے۔ جس کی قرآن کریم نے جامع تعبیر جہاد بالنفس والاموال سے فرمائی ہے اور اسی مجاہدہ پر ہدایت کا قطعی وعدہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ (سورۂ عنکبوت)

جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب و ثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھائیں گے۔

تو مجاہدہ[1] کی حقیقت ہے نفس کے اقتضاءات کو روکنا۔ تفصیل اس میں یہ ہے کہ اقتضاءات نفس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو یقیناً مذموم ہیں یعنی خلافِ شرع ہیں۔ ان کی مخالفت تو ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جو یقیناً محمود ہیں۔ جیسے فرض نماز، روزہ اور بقدر ضرورت کھانا پینا کپڑا پہننا۔ ان کی مخالفت ضروری کیا ہوتی[2] بلکہ موافقت ضروری ہے (اس قسم کے تمام شرعی امور کا بجالانا ضروری ہے) اور بعض وہ ہیں جو نہ یقیناً مذموم ہیں نہ یقیناً محمود ہیں بلکہ دونوں کو محتمل ہیں جیسے مباحات، بلکہ بعض دفعہ مستحبات بھی۔ ان میں[2] تقلیلاً مخالفت کرے۔ یہ مخالفت مستحب ہے مگر ایسا مستحب، کہ مخالفتِ واجبہ کا حصول کامل اسی مخالفتِ مستحبہ پر موقوف ہے جیسے بہت سونا، بہت کھانا، بہت عمدہ کپڑے پہننا، بہت باتیں کرنا۔ لوگوں سے بہت ملنا جلنا سو ان میں تقلیل کرے (اور اگر تقاضا زیادہ ہو تو ان میں[3] شیخ محقق سے رجوع کیا جاوے۔

---

[1] اشرف المسائل صہ۴ [2] انفاس عیسیٰ صہ۵، [3] اشرف المسائل صہ۴۔

اگر وہ کہہ دے کہ تقاضا محمود ہے تب تو مخالفت کی ضرورت نہیں اور اگر وہ کہے کہ یہ تقاضا مذموم ہے تو اس کی مخالفت کی جائے (اس لیے کہ مطلقاً مخالفتِ[1] نفس کا نام مجاہدہ نہیں، بلکہ جہاں مرغوبِ نفس مامور بہ نہ ہو۔ ورنہ نفسِ مطمئنّہ (خواہ وہ کامل درجہ کا مطمئنّہ نہ ہو) کو بعض اوقات مامور بہ کی رغبت ہوتی ہے حالانکہ اس کی مخالفت مجاہدہ نہیں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) :- جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) یقیناً مرغوبیّت صلوٰۃ پر دال ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا ترک مطلوب نہیں اور مامور بہ ہونا یہ وحی سے معلوم ہوگا تو مجاہدہ کا محل وحی سے متعیّن ہوگا نہ کہ محض رغبت یا عدم رغبت سے۔

منافعِ[2] نفس دو قسم کے ہیں۔ ایک حقوق، جس سے قوامِ بدن اور بقائے حیات ہے دوسرے حظوظ، جو اس سے زائد ہیں۔ سو مجاہدہ و ریاضت میں حظوظ کی تقلیل یا ترک کرایا جاتا ہے اور حقوق کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ کہ یہ خلاف سنّت بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بے شک تمہارے نفس کا تم پر حق ہے) کیونکہ اس سے ضعف بڑھ جاتا ہے صحت میں خلل پڑتا ہے۔ پھر ضروری اشغال و عبادات سے بھی عاجز ہو جاتا ہے۔ اس لیے ترقیٔ باطنی سے محروم رہتا ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ بزرگوں نے جو ریاضات و مجاہدات میں ترکِ لذّات کیا ہے وہ بطورِ علاج کیا ہے۔ جیسے کوئی ظاہری مریض بطور پرہیز کے کوئی قوی غذا چھوڑ دیتا ہے کہ مضر ہوگی اس کو عبادات اور موجبِ قربِ الٰہی نہیں سمجھتا۔ اب ان پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ بدعت ہے۔

قال اللہ تعالیٰ لا تُحَرِّموا طیبات	اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو پاک طیب چیزیں
ما احلّ اللہ لکم ولا تعتدوا	اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو اور نہ حد سے بڑھو۔

کیونکہ بدعت اس وقت ہوتی ہے جب بطور تقرب ہو ورنہ خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

---

[1] کمالات اشرفیہ صـ ۲۸۸ ، [2] التکشف صـ ۶۴

مِنَ الْاِسْرَافِ اَنْ تَاْکُلَ مَا اشْتَهَتْ — یہ اسراف میں سے ہے کہ جس چیز کی نفس خواہش کرے اس کو کھالے۔

پس مقصود ان حضرات کا یہ تھا کہ تکثیرِ لذات سے نفس کی قوت بہیمیہ کو غلبہ ہوتا ہے اور طاعات میں سستی اور کاہلی ہوتی ہے یا معاصی کا تقاضا کرنے لگتا ہے۔ بعض اوقات اس وجہ سے لذات متروک ہوجاتی ہیں کہ غلبہ محبتِ الٰہی میں لذات کی طرف التفات نہیں ہوتا سو یہ ترک غیر اختیاری ہے نہ سنت ہے نہ بدعت۔

مجاہدات و ریاضات کی ضرورت اور ان کا رواج

صحابہ[1] کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور یہ قوت بفیضِ نبوی صلعم صحابہؓ میں تھی۔ مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم۔ اور تابعین میں بھی تھی۔ مگر صحابہؓ سے کم۔ لیکن تبع تابعین میں یہ قوت بہت ہی کم ہوگئی اور اس کمی کی تلافی کے لیے بزرگوں نے مجاہدات و ریاضات ایجاد کیے۔

اعمالِ[2] صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے۔ کیونکہ اعمال، نفس کی خواہش کے خلاف ہیں۔ نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر۔ اس لیے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے مبتدی کو بھی اور منتہی کو بھی۔ اور دونوں کو کبھی نہ کبھی اعمال میں منازعت نفس کی وجہ سے کسل بھی پیش آتا ہے۔ مبتدی کو زیادہ، منتہی کو کم۔ اس کسل ہی کو رفع کرنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے نیز کسی وقت دونوں کا نفس معاصی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ کے لیے بھی مجاہدہ کی دونوں کو ضرورت ہے۔ ایک غلطی تو مبتدی کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو مشقت سے بچانا چاہتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہی نہیں بلکہ اسی انتظار میں ہے کہ سارا کام بدوں مشقت کے ہوجائے۔ اور ایک غلطی منتہی کرتا ہے کہ وہ ابتدا میں مجاہدہ کرکے آئندہ کے لیے مجاہدہ سے اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ طبائع بشریہ پھر عود کرتے ہیں اور اس وقت منتہی کو بھی معاصی کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کا نفس بھی طاعات میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے۔ جیسے ایک تو وہ سوار ہے جس کے نیچے ایسا گھوڑا ہے

---

[1] ارواح ثلثہ صفحہ ۲۱۰ [2] المجاہدہ صفحہ ۱۴، ۱۷، ۱۵، ۳۱، ۵، ۷، ۹، ۱۱

جس پر ابھی ابھی سواری شروع کی گئی ہے اس کو زیادہ ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ مشقت کا بھی سامنا ہے کیونکہ نیا گھوڑا بہت شرارت کرتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے دوسرا وہ شخص ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہے جو سواری میں شائستہ ہو چکا ہے اس کو زیادہ مشقت کا تو سامنا نہیں مگر ہوشیار بیٹھنے کی اس کو بھی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی کبھی بمقتضائے حیوانیت شوخی کرنے لگتا ہے۔ مگر سوار کی ذرا سی دھمکی اس کے دفع کرنے کو کافی ہے لیکن اگر سوار بالکل غافل رہا تو کسی وقت یہ شائستہ گھوڑے کے اوپر سے بھی ضرور گرے گا پس نفس کی نگہداشت کا مجاہدہ منتہی کو بھی لازم ہے۔

ہم جتنے گناہوں میں مبتلا ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہم نفس کو مشقت سے بچانا چاہتے ہیں اور جتنے اوامر کو ہم ترک کر رہے ہیں اس کی اصل بھی یہی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اصلاحِ اعمال واصلاحِ نفس کا مدار عادی مجاہدہ پر ہے۔ چنانچہ بے نمازی اسی لیے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اس کو آرام دیتا ہے۔ اگر وہ مجاہدۂ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔

غالب حالت یہی ہے کہ نماز روزہ وغیرہ میں مشقت ہوتی ہے اور اس مشقت میں بعض اوقات مانعیت کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور اس مشقت کی مانعیت کا علاج مجاہدہ ہے اور وہ مانع غالباً دو ہیں۔ ایک اسبابِ تنعم، دوسرے ضعفِ نفس یعنی باوجود عقیدہ صحیح ہونے اور تحریک طاعت پیدا ہونے کے بھی بعض دفعہ نفس ضعف و کم ہمتی کی وجہ سے یا اسبابِ تنعم اور سامان راحت میں منہمک ہونے کے نماز روزہ وغیرہ (اعمالِ شرعیہ) سے سستی کرتا ہے۔ اور بعض دفعہ نفس اپنی تسویل (یعنی بہکانے) سے ان موانع کے ساتھ عقیدہ صحیحہ سے بھی مانعیت کا کام لیتا ہے مثلاً کسی وقت گناہ کا تقاضا ہوا تو نفس یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے غرض نفس کی شہوت وغیرہ بعض دفعہ عقائدِ صحیحہ سے مخالف کام لینے لگتی ہے اس لیے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو اس مانع کا مقابلہ کرے اور وہ مجاہدہ ہے کیونکہ ان سب موانع کا حاصل یہ ہے کہ نفس آرام ولذت چاہتا ہے۔ والعلاج بالضد پس اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔ لہٰذا نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہو سکتی۔

مجاہدہ میں اعتدال مجاہدہ[1] سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت کا عادی بنانا اور راحت و تنعم کی عادت نکالنا ہے اور اس کے لیے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے۔ بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل معطل (اور بیکار) ہو جائے گا تو خوب سمجھ لو کہ محنت ہمیشہ مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو اسی وقت مستحسن ہے۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے بلکہ اعتدال کی رعایت لازم ہے اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

نہ چنداں بخور کز دہانت برآید ۔ نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

(یعنی نہ اتنا زیادہ کھاؤ کہ منہ سے باہر آنے لگے اور نہ اتنا کم کہ جسم میں کمزوری لاحق ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الآیہ)

یعنی خدا کے بندے وہ ہیں جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ خرچ اس کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے۔

پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہیئے مگر اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کریں بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کریں۔

ریاضت اور مجاہدہ کے اقسام ریاضت و مجاہدہ کی دو[2] قسمیں ہیں۔ ایک "مجاہدۂ اختیاریہ" دوسرا "مجاہدۂ اضطراریہ" جب کسی پر حق تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے تو اس کو مجاہدۂ اضطراریہ میں مبتلا کر کے صبر دیتے ہیں جس سے رفع درجات ہوتا ہے پس ایک مجاہدہ تو یہ ہے کہ خود تقلیل لذات کو اختیار کیا (اس کو مجاہدۂ اختیاریہ کہتے ہیں) اور ایک یہ کہ خود تو تقلیل لذات نہیں کیا۔ لیکن حق تعالیٰ نے اس کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا (اس کو مجاہدۂ اضطراریہ کہتے ہیں) مثلاً بچہ مر گیا پھر اس نے صبر کیا اس سے رفعِ درجات ہوا۔ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تم کو خوف، بھوک، مال، جان اور پھلوں کی کمی میں سے کسی چیز

---

[1] المجاہدہ ص۲۔ [2] کمالات اشرفیہ ص۲۴۳

الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (الآیہ) کے ساتھ آزمائیں گے۔

(تو اس) مجاہدۂ اضطراریہ میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہے کہ فرماتے ہیں:

اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ (الآیہ) یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کا انعام اور رحمت ہے۔

ان مجاہداتِ اضطراریہ سے نفس کی تہذیب و تمحیص ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رنج و غم میں اخلاق درست ہو جاتے ہیں، ساری فوں فاں اور فرعون بے سامانی رخصت ہو جاتی ہے جو بات مجاہداتِ اختیاریہ سے برسوں میں حاصل نہ ہو وہ ان مجاہدات اضطراریہ سے ایک دن میں حاصل ہو جاتی ہے اور نفس ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

مجاہدۂ اختیاریہ میں تو فعل کا غلبہ ہوتا ہے اور اس لیے اس میں انوار زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ انوار کا ترتب عمل پر ہوتا ہے اور مجاہدۂ اضطراریہ میں فعل کم ہوتا ہے اس میں نورانیت کم ہوتی ہے لیکن اس میں انفعال کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس سے قابلیت میں قوت بڑھتی ہے اور اس انفعال و قابلیت کی خود اعمال اختیاریہ کے راسخ ہونے میں سخت ضرورت ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے ایسے ایسے مجاہدات بہت زیادہ کرائے ہیں (اور بعض اوقات مجاہداتِ اضطراریہ و اختیاریہ دونوں موجود ہوتے ہیں) تو یہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَّھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (یعنی نور پر نور ہے۔ خداوند کریم جس کو مناسب سمجھتا ہے نور سے راہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ دونوں قسم کے مجاہدوں کو جمع کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

الٓمّٓ۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ (الآیہ)

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم یقین لائے اور ان کی آزمائش ایمان نہ ہوگی اور جو ان سے پہلے تھے ہم نے ان کو جانچا ہے۔ پس البتہ اللہ تعالیٰ معلوم کر دے گا ان کو جو سچے ہیں۔ اور ان کو جو جھوٹے ہیں۔

یعنی تم کو محض اٰمَنَّا کہنے پر نہ چھوڑا جائے گا۔ بلکہ مجاہداتِ اضطراریہ سے تمہارے صدق و کذب

۱؎ اجمعین ص ۱۲۸، ۵۰۰، ۵۱۰

کا امتحان کیا جائے گا۔ ایک (دوسرے) مقام پر ارشاد ہے:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ (الآیۃ)

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر ان لوگوں جیسے حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے ہو چکے کہ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور جھڑ جھڑا گئے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور وہ بھی جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئیگی

اس میں بتلا دیا کہ مجاہدۂ اختیاریہ کے ساتھ اضطراریہ کو جمع کیا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ یعنی فراغت میں اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں۔ اس میں حالتِ ضرار (تنگی) میں انفاق (یعنی خرچ کرنے کی) ترغیب ہے جس سے دو مجاہدوں کا جمع ہے کہ فقر بھی ہے اور انفاق بھی ہے۔ ایک اضطراری مجاہدہ ہے ایک اختیاری۔ بہر حال یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجاہدۂ اضطراریہ و اختیاریہ کا جمع ہونا شریعت میں محمود و مطلوب ہے پھر اگر مجاہدۂ اضطراریہ سے عمل میں قلت بھی ہو جائے اور محض فرائض و واجبات ہی پر اکتفاء ہوتا رہے تب بھی مجاہدہ کاملہ کا ثواب ملتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ مسافر و مریض کے لیے ان اعمال کا ثواب پورا لکھا جاتا ہے جو وہ سفر و مرض سے پہلے کرتا تھا۔

ریاضت و مجاہدہ کے ارکان

(**بلحاظِ ارکان**) مجاہدہ[1] کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدۂ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے۔ مثلاً تکثیرِ نوافل سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے طعام کی حرص وغیرہ کو کم کرنا اور ایک مجاہدہ بمعنی مخالفتِ نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت پر داعی ہو اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے۔ اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کے واسطے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوگا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی۔ لیکن اگر

---

[1] المجاہدہ ص ۲۲

بدوں مجاہدہ جسمانیہ کے کسی کو نفس پر قدرت ہو جائے تو اس کو مجاہدہ نفسانیہ کی ضرورت نہیں مگر ایسے لوگ شاذ ہیں۔ اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدۂ جسمانیہ کا اہتمام بھی کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کے چار ارکان ہیں۔ قلتِ کلام، قلتِ طعام، قلتِ منام و قلتِ اختلاط مع الانام۔ جو شخص ان ارکان کا عادی ہو جائے گا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا اور مجاہدۂ نفسانیہ، کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے اس کی مخالفت کرنا۔ یہ بات اس وقت حاصل ہو گی جب کہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی (کسی حد تک) مخالفت کیا کریں۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے (اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد) اس کی جائز خواہش پوری کر دی جائے۔ (تاکہ نفس پریشان نہ ہو جائے بلکہ اس کو خوش رکھا جائے اور اس سے کام بھی لیا جائے اس لیے) کہ ؏

مزدور خوشدل کند کار بیش

تو جب مباحات میں مخالفت نفس کے عادی ہو گے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہو گے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اس کو دبا نہیں سکتا۔

(خلاصہ یہ کہ) ریاضت[1] و مجاہدہ کے دو رکن ہیں۔ اوّل مجاہدۂ اجمالی (یا جسمانی) دوسرا ریاضتِ تفصیلی (یا نفسانی) مجاہدۂ اجمالی کے اصول چار ہیں۔ قلتِ کلام۔ قلتِ طعام، قلتِ منام اور قلتِ اختلاط مع الانام۔ ان سب امور میں مرتبہ اوسط حسبِ تعلیم شیخ کامل ملحوظ رکھے نہ اس قدر کثرت کرے جس سے غفلت و قساوت و کاہلی پیدا ہو۔ نہ اس قدر قلت کرے کہ جس سے صحت و قوت زائل ہو جائے۔ (اس مجاہدۂ اجمالی کا مفصل بیان انشاء اللہ[2] "ذرائع کے بیان" میں آئے گا۔) دوسرے ریاضتِ تفصیلی۔ اس میں دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل "اخلاقِ حمیدہ" میں اور وہ چند مقامات ہیں۔ مثل توبہ۔ صبر و شکر وغیرہ۔ قسم دوم "اخلاقِ ذمیمہ" میں اور وہ چند چیزیں ہیں۔ مثل شہوت، حرص، غضب وغیرہ (تفصیل آئندہ باب میں

---

[1] تعلیم الدین ص۴۲، ص۸۰ [2] ملاحظہ ہو صفحات ۲۳۶ تا ۲۵۷

طریقِ تکمیل (ملاحظہ ہو) تکمیل[1] کے دو درجے ہیں۔ ایک "تحلیہ" اور ایک "تخلیہ" یا ایک "تجلیہ" اور ایک "تحلیہ" تجلیہ میں بھی تخلیہ ہی ہوتا ہے جیسے برتن کو پہلے میل کچیل سے صاف کرتے ہیں۔ پھر اس پر قلعی اور دوسرا کام کرتے ہیں۔ تحلیہ کے معنی لغت میں آراستہ کرنا اور اصطلاحِ صوفیہ میں یہ ہے کہ سالک اپنے کو اخلاقِ حمیدہ اور تعلق مع اللہ سے آراستہ کر لے۔ جس کا طریقہ طاعات و ذکر میں مشغول ہونا ہے اور تخلیہ کے معنی لغت میں خالی کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں سالک کا اپنے کو اخلاقِ رذیلہ سے پاک کرنا اور غیر اللہ سے تعلق منقطع کرنا ہے۔

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سلوک کے لیے تحلیہ و تخلیہ دونوں کی ضرورت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تحلیہ کو مقدم کیا جائے یا تخلیہ کو۔ مشائخ میں دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ بعض تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تخلیہ کرتے ہیں۔ بعض تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور اس کے بعد تحلیہ کرتے ہیں اور ہر دو طریق سے کامیابی ہوتی ہے۔ جیسے معالجات امراضِ جسمانیہ میں بھی دونوں طریقے مستعمل ہیں: حکمائے یونان تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں یعنی پہلے مادۂ فاسد کو نکالتے ہیں۔ بعد میں تقویتِ طبع کا اہتمام کرتے ہیں اور حکمائے یورپ کی رائے یہ ہے کہ مرض کی حالت میں سب سے پہلے تقویّتِ طبع کا اہتمام کرنا چاہیئے یعنی تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحلیہ سے تخلیہ خود ہو جاتا ہے۔ یعنی جب طبیعت قوی ہو جاتی ہے تو وہ مرض کو خود زائل کر دیتی ہے۔ حکمائے یونان جواب میں کہتے ہیں کہ ضعفِ طبع کا سبب تو مرض ہی ہے اگر مرض کا ازالہ ہو گیا تو طبیعت خود قوی ہو جائے گی اور دونوں طریقوں سے کامیابی ہوتی ہے۔ اسی طرح صوفیہ کی بھی رائے مختلف ہو گئی۔ بعض کے یہاں صفاتِ حمیدہ اور تعلق مع اللہ پہلے پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر ذمائم کی اصلاح کی جاتی ہے اور بعض کے یہاں صفاتِ رذیلہ اور تعلق غیر اللہ کو اوّل قطع کیا جاتا ہے۔ پھر صفاتِ حمیدہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا جاتا ہے مگر اس میں قولِ فیصل یہ ہے کہ نہ تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا جائے نہ تخلیہ کو۔ بلکہ

---

[1] اشرف المسائل صد ۶۷-۲۰۰ ملخصاً۔

دونوں کو دوش بدوش چلنا چاہیئے۔ اگر تخلیہ کو مقدم کیا گیا تو بعض دفعہ رذائل ایسے قوی ہوتے ہیں کہ سارا تحلیہ بیکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سر سے پیر تک پاخانہ میں بھرا ہوا ہو تو اس کے بدن پر عطر ملنا بیکار ہے وہ عطر کو بھی لے ڈوبے گا اسی طرح اگر تخلیہ کو مقدم کیا تو اتنا زمانہ تحلیہ کی برکات سے خالی جائے گا پھر ممکن ہے کہ تخلیہ میں دیر لگ جائے اور کوتاہی عمر کیوجہ سے تحلیہ کی نوبت ہی نہ آئے تو یہ شخص تعلق مع اللہ سے بالکل ہی کورا جائے گا اس لیے محققین کی رائے اب یہ ہے کہ تحلیہ اور تخلیہ ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے۔ چشتیہ کے ہاں پہلے تخلیہ مقدم تھا اور اب بھی ان کو تحلیہ کے ساتھ تخلیہ کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے مگر پہلے یہ حالت تھی کہ برسوں مجاہدات کراتے تھے پھر مدت کے بعد بارہ تسبیح وغیرہ تعلیم کرتے تھے اور نقشبندیہ پہلے ہی دن ذکر تعلیم کر دیتے تھے ان کے ہاں تحلیہ مقدم تھا۔ بعد میں تخلیہ کراتے تھے اور اب گو دونوں سلسلوں کے محققین کی رائے بدل گئی ہے۔ مگر مذاق پر چشتیہ کے تخلیہ غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ غالب ہے۔ مگر باوجود اس کے اہلِ تربیت جو محقق ہیں اس میں طالب کے مذاق پر زیادہ مدار رکھتے ہیں جس کو وہ اپنی خداداد بصیرت سے تشخیص کر لیتے ہیں۔

طریقِ کار ہر وقت[1] تین سوہانِ روح تیار ہیں۔ ماضی کی حسرت، حال کے شبہات، مستقبل کا خوف۔ جب محققین مجددین مجتہدین فی الطریق (ومنھم اکملھم مرشدی حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی ؒ) نے دیکھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے الہاماً ان کو دکھلایا کہ اس طریق میں بوجہ تعبِ شدید۔ اور حصولِ ثمرۂ تربیت میں زمانِ مدید کے بعض اوقات مصرعہ مشہورہ ہی کا مصداق ہو جاتا ہے۔ ع

تا تو بمن مے رسی من بخدا می رسم۔

پھر اہلِ زمانہ کی قوتیں ضعیف، ہمتیں کمزور تو ان سب امور پر نظر کر کے بالہامِ حق ایک دوسرا طریق تربیت کا اختیار فرمایا۔ وجہ یہ کہ یہ سب ماضی و مستقبل حجاب عن الحق ہیں۔ حق تعالیٰ نے ہم کو اپنے مشاہدہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ نہ کہ ماضی و مستقبل کے مطالعہ کے لیے ولنعم ما قال الرومی (یعنی مولانا رومی ؒ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ) ماضی و مستقبل پردۂ خداست، البتہ توبہ کی ضرورت

---

[1] اشرف المسائل صد ۴۷

سے ماضی پر اور عزم کی ضرورت سے مستقبل پر نظر تھی لیکن ضروری کیلئے بقدر ضرورت اتنا کافی ہے کہ گذشتہ گناہوں سے موافق شرائط خوب توبہ کر لے پھر بار بار دل میں ان کا سبق نہ دہرا تا رہے اور مستقبل کے لیے اللہ پر بھروسہ کر کے اس کا قصد کرے کہ انشاء اللہ پھر یہ گناہ نہ کروں گا۔ اس کے بعد ہر وقت اس قصہ میں نہ لگا رہے اس سے زیادہ دوسرا کام ہے جس کو حدیث میں ان دو لفظوں میں تعبیر فرمایا گیا ہے راقب اللّٰه تجد تجاهك (اللہ کا دھیان رکھو۔ اس کو اپنے سامنے پاؤ گے) پس اس کام میں لگ جانا چاہیئے یعنی ذکر و فکر اور عمل کے وقت عمل میں کہ وہ بھی ذکر میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرب کو مقصود سمجھے اور جو طریق اس کیلئے مقرر ہے یعنی عقائد کی تصحیح کے بعد اعمال اختیاریہ کہ جس وقت کا جو عمل ہو خواہ ظاہری مثل صلوٰۃ و زکوٰۃ، خواہ باطنی مثل خوف ورجا، شکر و صبر وغیرہ۔ پس اس میں مشغول رہے۔ اور جو بُعد کے اسباب ہیں یعنی ظاہری و باطنی معصیت اس سے بچتا رہے نہ اس کی ضرورت ہے کہ اسباب قرب میں ملکہ پیدا کرنے کی فکر کرے۔ نہ اس کی حاجت کہ اسباب بُعد کے مادہ کو منقطع کرے (بلکہ) اُمورِ اختیاریہ میں سے جس میں کوتاہی ہو جاوے اس کو مہتم بالشان سمجھے اور اس کی اصلاح کر لے اور اُمور غیر اختیاریہ کے وجود و عدم پر التفات بھی نہ کرے اور اصلاح میں بھی زیادہ کاوش نہ کرے۔ مثلاً اگر کسی ضروری عمل میں خلل ہو گیا۔ اس کی قضا یا تلافی کرے اگر کوئی امر منکر صادر ہو گیا۔ اس سے استغفار کرے اور پھر اپنے کام میں لگ جاوے اسی ایک بات کے پیچھے نہ پڑ جائے کہ ہائے یہ کام مجھ سے کیوں ہوا یا یہ کام کیوں نہیں ہوا یہ غلو و مبالغہ ہے جس سے (اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) کتاب و سنت میں منع فرمایا ہے۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ ، (دین میں) ناحق کا غلو مت کرو

مَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَیْهِ ، جو سختی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پہ سختی کرتے ہیں

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِیْمُوْا درمیانی راہ اختیار کرو اور قرب تلاش کرو اور اس پر ڈٹ جاؤ۔

حضرت عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔ ع

سخت می گیرد جہاں بر مردمانِ سخت گیر

اور اسی غلو اور مبالغہ کا اثر خصوصاً اس وقت کے قویٰ اور ہمتوں پر یہ ہوتا ہے کہ بہت جلد مایوسی اپنا رنگ لاتی اور سالک کو معطل کر دیتی ہے اور کبھی جان پر اور کبھی ایمان پر اس کا اثر پہنچتا ہے۔ جان پر تو یہ کہ صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کثرتِ تخیلات و افکار سے سودا بڑھ جاتا ہے اور ایمان پر یہ کہ باوجود مبالغہ و معالجہ کے کامیابی مزعوم یعنی شفاء مطلق کے نہ ہونے پر یا دیر میں ہونے سے حق تعالیٰ سے تنگی اور شکایت پیدا ہو کر کیفیت کراہت اور ناراضگی کی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم کو اتنے دن سر مارتے ہو گئے مگر وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا کے وعدے خدا جانے کہاں گئے اور ایک مرض ہر وقت کے وگلوگیر رہتا ہے کہ اپنے عمل کو بالغ اور اپنی سعی کو سابغ سمجھ کر ہر وقت ثمرات کا منتظر رہتا ہے بس اپنے عمل کا پلہ عطاء حق سے بڑھا ہوا سمجھتا ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ کبھی اپنے کو کامیاب نہیں سمجھتا اس لیے ناشکری ہی میں مبتلا رہتا ہے اور اگر بزعمِ خود کامیاب بھی ہو گیا۔ تو اگر وہ کامیابی پھر زائل ہو گئی کیونکہ ایسے انقلابات عمر بھر رہتے ہیں تو پھر وہی تنگی اور پریشانی شروع ہوتی ہے تو اس کا سلسلہ عمر بھر بھی منقطع نہیں ہوتا۔ اس کا یا اس کو دیکھ کر دوسرے کا نفس کہتا ہے کہ اس راہِ خدا سے خدا کی پناہ۔ جس میں بجز مصیبت کے راحت کا نام ہی نہیں۔ پس اس غلو کے یہ مضار و مفاسد دیکھ کر انھوں نے یہ تجویز کیا کہ ان تدقیقات و تعمقات کو اصلاً نظر انداز کر دے اگر کوئی وارد محمود آوے تو نہ اس کو کمال سمجھے نہ اس کے بقاء کی تمنا کرے۔ نہ اس کے فوت پر حسرت کرے اگر کوئی وسوسہ پیدا ہو اس کے دفعہ میں تندہی نہ کرے۔ ذکر کی طرف بہت مبالغہ سے نہیں بلکہ سرسری طور پر متوجہ ہو جائے خواہ وہ دفع ہو یا نہ ہو یعنی ذکر بقصدِ قرب کرے۔ نہ بقصدِ دفعِ وسوسہ۔ خلاصہ یہ کہ طالبِ رضائے حق وہارب عن سخط الحق رہے (یعنی خداوند کریم کی ناراضگی کے اسباب سے بچے) جس امر کو رضاء میں دخل ہو اس پر عمل کرے اور جس امر کو سخطِ حق میں دخل ہو۔ اس سے اجتناب کرے اگر اس کا صدور ہو جاوے۔ استغفار کر لے۔ نہ اپنے

کو خواص میں سمجھے کہ احوال عامیہ سے گھبرا وے۔ نہ ثمرات عاجلہ و آجلہ کا طالب رہے پس اسکی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں توفیق اور آخرت میں جنت عطا فرمائیں اور دوزخ سے نجات بخشیں بس ہوگیا سلوک مسنون۔

باب دوم : اخلاق کا بیان

اخلاق[1] سب فطری و جبلی ہیں اور درجۂ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے نہ محمود، بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح و ذم آجاتی ہے۔ مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ (یعنی جس نے اللہ ہی کی رضا کیلئے دیا اور اللہ ہی کی رضا کے لیے روکا تو اس کا ایمان مکمل ہوا۔) اس میں اعطاء و منع دونوں کے ساتھ لِلّٰہِ کی قید ہے جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل مطلقاً مذموم بلکہ اگر خدا کے لیے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم۔

اخلاق[2] ذمیمہ جن سے نفس کا تزکیہ کرنا ضروری ہے یوں تو بہت ہیں مگر اصول یہی ہیں جن کا آئندہ ذکر آئے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) اور ان میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے اس لیے جب تک سب ہی سے نجات نہ ملے گی۔ اس وقت تک نفس قابو میں نہ آئے گا اور ایک کی اصلاح کرنا اور دوسرے سے بے پرواہ رہنا کچھ مفید نہ ہوگا کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو وہ تندرست اسی وقت کہلایا جاسکتا ہے جبکہ اس کی دسوں بیماریاں جاتی رہیں جسطرح کوئی خوبصورت آدمی حسین اسی وقت کہلا سکتا ہے جبکہ ہاتھ پاؤں آنکھ کان غرض سارے اعضاء مناسب اور خوبصورت ہوں۔ اسی طرح انسان کو حسنِ خلق اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ اس کی تمام باطنی حالتیں قابلِ تعریف اور پسندیدہ ہوں۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "مسلمان وہی ہے جس کا خلق کامل ہو اور مومنین میں افضل وہی ہے جس کا خلق سب سے بہتر ہو" بس اسی اصل کا نام دین ہے اور اسی کی تکمیل کیلئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔

جاننا چاہیئے کہ خَلق اور خُلق جدا جدا دو لفظ ہیں خَلق سے مراد صورتِ ظاہری ہے اور خُلق سے مراد صورتِ باطنی۔ کیونکہ انسان جسطرح جسم سے ترکیب دیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان وغیرہ اعضاء اس کو مرحمت ہوئے ہیں جن کو قوتِ بصارت یعنی چہرہ کی آنکھیں ادراک کرسکتی ہیں اسی طرح انسان روح

خَلق یا خُلق

---

[1] انفاس عیسیٰ ص۱۸۷، [2] تبلیغ دین ص۷۷

اور نفس سے ترکیب دیا گیا ہے اور اس کا ادراک بصیرت یعنی دل کی آنکھیں کرتی ہیں۔ یہ ترکیب ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ اور ان دونوں ترکیبوں میں حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جدا جدا صورت اور قسم قسم کی شکلوں پر پیدا فرمایا ہے کہ کوئی صورت اور سیرت حسین اور اچھی ہے اور کوئی صورت اور سیرت بری اور بھونڈی ہے۔ ظاہری ہیئت و شکل کو صورت کہتے ہیں اور باطنی شکل اور ہیئت کو سیرت کہتے ہیں مگر سیرت کا مرتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے چنانچہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي "اور آدمؑ کے پتلے میں میں نے اپنی روح کو پھونک دیا" آیت کریمہ میں روح کو اپنا کہہ کر ذکر فرمایا اور قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (اے محمدؐ کہہ دے کہ روح میرے پروردگار کا امر ہے) میں اسکا اظہار فرمایا کہ روح امر ربی ہے اور جسم کی طرح سفلی اور خاکی نہیں ہے کیونکہ جسم کی نسبت مٹی کی جانب فرمائی اور إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِينٍ (یعنی بیشک میں نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا) ارشاد ہوا۔ اس مقام پر روح اور نفس سے مراد ایک ہی شے ہے یعنی وہ شے جو حق تعالیٰ کے الہام و القاء سے اپنی اپنی استعداد کے موافق اشیاء کی معرفت اور ادراک حاصل کرتی ہے ثابت ہوا کہ زیادہ قابل لحاظ امر ربی یعنی سیرت انسانی ہی ہے کہ جب تک اسی باطنی ترکیب کی شکل و ہیئت میں حسن موجود نہ ہوگا۔ اس وقت تک انسان کو خوب سیرت نہیں کہا جاسکتا۔ اور چونکہ اس صورت کے اعضاء ہاتھ پاؤں کی طرح سیرت کو بھی حق تعالیٰ نے باطنی اعضاء مرحمت فرمائے ہیں جن کا نام قوت علم، قوت غضب، قوت شہوت اور قوت عدل ہے۔ لہٰذا جب تک یہ چاروں اعضاء سڈول مناسب اور حد اعتدال پر نہ ہوں گے اس وقت تک سیرت کو حسین نہ کہا جائے گا ان باطنی اعضاء میں جو بھی کمی بیشی ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی کی ظاہری شکل اور صورت جسمیہ میں افراط تفریط ہو کہ پاؤں مثلاً گز بھر ہوں اور ہاتھ تین گز کے یا ایک ہاتھ مثلاً آدھ گز کا ہو اور دوسرا گز بھر کا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی خوبصورت نہیں کہا جائے گا بس اسی طرح اگر کسی کی قوت غضبیہ مثلاً حد اعتدال سے کم ہے اور قوت شہوانیہ مناسب اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے تو اس کو خوب سیرت نہیں کہہ سکتے۔ اب[1] ہم چاروں اعضائے مذکورہ کا اعتدال و تناسب اور حسن بیان کرتے ہیں۔

ظاہری اعضاء
باطنی اعضاء

---

[1] اسی قسم کا ایک مضمون شریعت کے بیان میں بھی ہے وہ بھی دیکھ لیا جاوے (بر صفحہ ۳۱ ہذا)

اوّل :۔ قوتِ علم ۔ اس کا اعتدال اور حسن تو یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے اقوال کے اندر سچ جھوٹ میں امتیاز اور اعتقادات کے متعلق حق اور باطل میں فرق کر سکے اور اعمال میں حسن اور قبیح یعنی اچھا اور برا پہچان سکے۔ پس جس وقت یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو اس وقت حکمت کا وہ ثمرہ پیدا ہوگا جس کو حق تعالیٰ بایں الفاظ ارشاد فرماتا ہے کہ "جس کو حکمت نصیب ہوئی اس کو خیر کثیر عطا ہوئی" اور حقیقت میں تمام فضیلتوں کی جڑ اور اصل یہی ہے

دوم وسوم ۔ قوتِ غضب و قوتِ شہوت ۔ ان کا اعتدال اور حُسن یہ ہے کہ دونوں قوتیں حکمت اور شریعت کے اشارہ پر چلنے لگیں اور مہذب و مطیع شکاری کتے کی طرح شریعت کی فرمانبردار بن جائیں کہ جس طرف بھی ان کو شریعت چلائے بلا عذر و بلا تامل اسی جانب لپکیں اور شکار پر حملہ کریں اور جس وقت وہ ان کو روکنا چاہے تو فوراً ٹھہر جائیں اور چپ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ جائیں۔

چہارم ۔ قوتِ عدل ۔ اس کا اعتدال یہ ہے کہ قوتِ غضبیہ اور شہوت دونوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے اور ان کو دین اور عقل کے اشارہ کے ماتحت بنائے رکھے۔ گویا عقل تو حاکم ہے اور یہ قوتِ عدل اس کی پیش کار ہے کہ جدھر حاکم کا اشارہ پاتی ہے فوراً اسی جانب جھک جاتی ہے اور اسی کے موافق احکام جاری کر دیتی ہے اور قوتِ غضبیہ و شہوانیہ گویا شکاری مرد کے مہذب کتے ہیں فرمانبردار گھوڑے کی طرح ہیں کہ ان میں حاکم کا حکم اور ناصح کی نصیحت کا نفاذ اور اجراء ہوتا ہے پس جس وقت یہ حالت قابلِ اطمینان اور لائقِ تعریف ہو جائے گی اس وقت انسان حَسَنُ الخلق اور خوب سیرت کہلائے گا اور ان کی بدولت انسان کے تمام اخلاق و عادات درست ہو جائیں گے۔

قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا نام "شجاعت" ہے اور یہی عند اللہ پسندیدہ ہے کیونکہ اگر اس میں زیادتی ہوگی تو اس کا نام "تہوّر" (بیباکی سے تباہ کرنا) ہوگا اور اگر کمی ہوگی تو "بزدلی" کہلائے گی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں ناپسندیدہ ہیں۔ حالتِ اعتدال یعنی شجاعت سے لطف و کرم، دلیری و جودت، بردباری و استقلال، نرمی و ملاطفت اور غصہ کے ضبط کا مادہ اور ہر کام میں دور اندیشی اور وقار پیدا ہوتا ہے اور اگر زیادتی ہوتی ہے تو ناعاقبت اندیشی، ڈینگ مارنا، شیخی بگھارنا، غصہ سے بھڑک اٹھنا، تکبر اور خود پسندی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو بزدلی و ذلت، بے غیرتی، کم ہمتی، خساست (کمینہ پن) اور وہ حرکات ظاہر ہوتی ہیں جو چھچھورا پن کہلاتی ہیں۔

شہوت کی حالتِ اعتدال کا نام پارسائی ہے پس اگر شہوت اپنی حدِ اعتدال سے بڑھ جائے گی تو "حرص و ہوا" کہلائے گی حالتِ معتدل یعنی پارسائی اللہ پاک کو پسند ہے اور اس سے جو خصائل پیدا ہوتے ہیں وہ سخاوت، حیا، صبر، قناعت اور اتقاء کہلاتے ہیں طمع کم ہوجاتی ہے۔ خوف و خشیت اور دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور حدِ اعتدال سے بڑھنے اور گھٹنے سے حرص و لالچ، خوشامد، چاپلوسی امراء کے سامنے تذلل اور فقراء کو بنظرِ حقارت دیکھنا، بیحیائی، فضول خرچی، ریا، تنگدلی، نامردانگی اور حسد وغیرہ خصائل بد پیدا ہوتے ہیں۔

اور **قوتِ عقل** میں اگر اعتدال ہوتا ہے تو انسان مدبر و منتظم اور ذکی و سمجھدار ہوتا ہے کہ اس کی رائے صائب ہوتی ہے اور ہر مضمون میں اس کی طبیعت چلتی اور جودت دکھلاتی ہے اور اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی، فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے اگر عقل کی قوت میں کسی قسم کا نقصان اور ضعف ہوگا تو کند ذہنی و حماقت اور بیوقوفی کہلائے گی جس کا اثر یہ ہوگا کہ ایسا آدمی جلد دوسرے کے دھوکہ میں آجائے گا۔

غرض جس وقت یہ ساری قوتیں حدِ اعتدال پر رہوں گی تو اس وقت انسان کو خوب سیرت کہا جائیگا۔ کیونکہ اعتدال سے گھٹنا اور بڑھنا دونوں حالتیں حسن سے خارج ہیں خیرالامور اوسطھا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہمارے بندوں کی یہ شان ہے کہ نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ اس کے بین بین حالت پر رہتے ہیں۔"

جس طرح حسنِ ظاہری میں کمی اور بیشی ہوا کرتی ہے کہ کوئی زیادہ خوبصورت ہے اور کوئی کم۔ اسی طرح حسنِ باطنی میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں پس سب سے زیادہ خوب سیرت تو سرورِ عالم رسولِ مقبول سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ کی شان میں آیت کریمہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ نازل ہوئی ہے۔ آپ کے بعد جس مسلمان کو آپ کے اخلاق کے ساتھ جتنی مناسبت ہوگی اسی قدر اس کو حسین سیرت کہیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ سیرتِ باطنی میں جس قدر بھی جس کو حسن حاصل ہوگا اسی قدر اسی کو سعادتِ اخروی حاصل ہوگی۔

اخلاقِ حمیدہ کا بیان

اخلاقِ حمیدہ[1] چند مقامات ہیں۔ ارادہ و نیت، اخلاص، انس، تبلیغ، تفکر، تفویض، تقویٰ،

---

[1] تعلیم الدین صـ۴۲

تواضع[۹]، توبہ[۱۰]، توحید[۱۱]، توکل[۱۲]، خشوع[۱۳]، خوف[۱۴]، دعا[۱۵]، رجا[۱۶]، رضا[۱۷]، زہد[۱۸]، شکر[۱۹]، شوق[۲۰]، صبر[۲۱]، صدق[۲۲] محبت وغیرہ۔ ہر ایک مقام کو ایک ایک فصل میں مع اس کی دلیل حقیقت اور طریق کار و طریق تحصیل کے بیان کیا جاتا ہے۔

پہلی[۱] فصل ــــــ ارادہ اور نیت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

سورۂ انعام ۲ پ ۷

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الآیۃ)	اور مت دھتکار و اے محمد صلعم ان کو جو اپنے رب کو صبح وشام یعنی ہر وقت پکارتے رہتے ہیں خاص ذات باری تعالیٰ کو چاہتے ہیں

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (متفق علیہ)	اعمال کا اعتبار نیت ہی پر ہے۔

نیت کی حقیقت دل کا ایسی چیز کی طرف ابھرنا جس کو اپنی غرض و نفع کے موافق سمجھتا ہے نیت کہتے ہیں اور[۲] اس کے معنی ارادہ اور قصد کے ہیں کہ جس سے کسی کام پر قدرت پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہر کام کے لیے اول علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے بعد اس کے عمل میں لانے کا قصد و ارادہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ہاتھ پاؤں ہلانے اور اس کام کے کرنے کی قدرت پیدا ہوتی ہے گویا **قدرت**، قصد و ارادہ کی خادم ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ تمہارے اندر کھانے کی خواہش رکھی ہوئی ہے مگر وہ ایسی دبی ہوئی ہے کہ جیسے کوئی سویا ہوا ہوتا ہے اور جس وقت تمہاری نظر کھانے پر پڑی اور طعام کا علم ہوا اسی وقت وہ جاگ اٹھی اور اس کے کھانے کا قصد ہوا اس کے بعد اس کی طرف ہاتھ بڑھے گا اور وہ قوت اپنا کام کرے گی جو خواہش طعام کے اشارہ کی مطیع بنائی گئی ہے۔ غرض آنکھ کے مشاہدہ سے معرفت و علم حاصل ہوگا اور معرفت کی خواہش بیدار ہوگی اور قصد پیدا ہوگا اور یہ قصد خداداد قوت کے ذریعہ سے ہاتھ کو حرکت دلائے گا اور کھانا کھلائے گا اسی طرح تمہارے اندر ان لذتوں کی بھی خواہش رکھی ہوئی ہے جو تم کو آخرت میں ملنے والی ہیں اور جن کا علم عقل اور شرع کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور قدرت چونکہ اس خواہش و میلان کی بھی خادم ہے لہٰذا وہ اعضا کو حرکت دے گی اور خواہش کو پورا کرائے گی پس وہی عزم اور

---

۱ تعلیم الدین صلا ، ۲ تبلیغ دین صلا

پختہ میلان جس نے قوت کو ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ کیا نیت کہلاتا ہے۔ مثلاً جہاد میں جانے والا شخص اپنے گھر سے نکلا تو دیکھو کہ اس کے گھر سے باہر نکالنے والا باعث و محرک کیا چیز ہے؟ یعنی اگر ثواب آخرت ہے تو بس یہی اس کی نیت ہے اور اگر اس کا باعث مالِ غنیمت، یا شہرت و نیکنامی کا حاصل کرنا ہے تو اسی کو اس کی نیت کہا جاوے گا۔

نیک[1] عمل میں نیت تین طرح کی ہو سکتی ہے ایک یہ کہ وہ فعل قصداً اور اختیاراً کیا جاوے لیکن اس میں نہ غایتِ محمودہ کا تصور ہو۔ نہ غایتِ مذمومہ کا۔ دوسرے یہ کہ غایتِ محمودہ کا قصد ہو۔ مثلاً یہ کہ میں نماز اس لیے پڑھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوں۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ غایتِ مذمومہ کا ارادہ ہو۔ مثلاً نماز اس لیے پڑھے کہ مخلوق کے نزدیک بڑا بنے پس ان تینوں صورتوں میں سے ریاء مذموم اخیر کی صورت ہے۔ اور صورتِ اولیٰ و ثانیہ اخلاص میں داخل ہے۔

طریقِ کار | (جب[2] کام شروع کرے تو شروع میں ایک بار نیت کر لینا کافی ہے اگر ہر بار نیت کی ضرورت ہو تو کوئی بھی فعل اختیاری نہ ہو سکے گا۔ دیکھیے مسجد کی طرف نماز کی نیت سے چلنا موجبِ ثواب ہے۔ مگر ہر ہر قدم پر نیتِ مشی و ارادہ رفعِ قدم ضروری نہیں اس طرح تو چلنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ غرض افعالِ اختیاریہ کے لیے حدوث میں تو ارادہ کی ضرورت ہے مگر اس کے بقا میں ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ نیت کافی ہے پھر جتنی دیر تک وہ فعل کرتے رہو گے وہی نیت مستمر (یعنی جاری) رہے گی۔ نیت[3] یہ ہو کہ ہمیں راستہ نظر آجاوے اور رہبر بننے کی نیت شرک فی الطریقہ ہے بلکہ بزرگ بننے کی بھی نیت نہ ہونی چاہیئے اگر یہ نیت ہے تو وہ شخص غیر حق کا طالب ہے خود کچھ تجویز نہ کرے (مزید تفصیل کے لیے فصل اخلاص دریا ملاحظہ ہو۔ ۱۲ مرتب)۔

طریقِ تحصیل | [4] اس چیز کی۔ مثلاً عملِ صالح و سلوکِ طریق۔ آخرت کے نفع و مصالح کی معرفت حاصل کر کے ان میں غور کرے۔ دل کو حرکت پیدا ہو گی۔

دوسری فصل۔ اخلاص کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ[5] — اور ان کو حکم نہیں ہوا مگر اس بات کا کہ عبادت کریں

---

[1] دعواتِ عبدیت ج ۱۱ ص ۱۱۳ [2] العبد الوحید ص ۲۱ [3] کمالاتِ اشرفیہ ص ۱۲۴ [4] تعلیم الدین ص ۸۷، [5] الاخلاص ص ۱۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (الآیہ) — اللہ تعالیٰ کی خالص کرنیوالے ہوں اس کے واسطے دین اور طرف سے منہ پھیرے ہوتے ہوں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى نِيَّاتِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ (الحدیث) — حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں فرماتے لیکن تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں۔

حقیقتِ اخلاص | اپنی طرف[1] سے صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب و رضا کا قصد رکھنا اور مخلوق کی خوشنودی و رضامندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کو ملنے نہ دینا (اخلاص ہے)

اخلاص[2] کے وجوداً و عدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایتِ صحیح کا قصد ہو۔ یہ تو غایتِ اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایتِ فاسدہ کا قصد ہو یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے ایک یہ کہ کچھ بھی قصد نہ ہو۔ نہ غایتِ صحیح کا نہ غایتِ فاسدہ کا۔ بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کر لیا۔ یہ درجہ بَین بَین ہے اس کو اخلاص سے اتنا بُعد نہیں جتنا دوسرے درجہ کو بُعد ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خداوند کریم ہم سے راضی ہوں گے اس کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہ اخلاص کا درجۂ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع و خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاوے گا یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں۔ نہ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو۔ یہ مرتبہ بَین بَین ہے یہ اگر اخلاص کا درجۂ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ اس کو اخلاص سے قرب ضرور ہے مگر ظاہر ہے کہ فعلِ اختیاری، فاعلِ مختار سے بدوں کسی غرض کے تصور کے نہیں ہو سکتا تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں مگر نیت کچھ نہیں ہوتی یہ محض عادت کی برکت ہے جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے اس کے لیے بار بار ارادہ اور عزم نہیں کرنا پڑتا۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت

---

[1] تعلیم الدین صـ۸۷ ، [2] اشرف المسائل صـ۹۱

پر نظر نہیں ہوتی۔ تکرار کی وجہ سے عادت ہوگئی ہے اور عادت کے بعد غایات کا لحاظ نہیں ہوا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ جس کام میں تکرار ہو اس میں اخلاص سے من وجہ قرب ہے اور جس میں تکرار نہ ہو اس میں اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک غایت صحیح کا تصور اور اس کا قصد نہ ہو۔[۱] حَتّٰی رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلًا عَلَیْهِمَا بِقَلْبِهٖ (دو رکعتیں ایسی حالت میں پڑھے کہ دل سے اس پر متوجہ ہو) یہ ایک مرفوع حدیث کا جزو ہے اور دوسری حدیث موقوف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا جزو ہے اِنِّیْ لَاُجَهِّزُ جَیْشِیْ وَاَنَا فِی الصَّلٰوةِ (میں اپنے لشکر کی تیاری نماز کی حالت میں کرتا ہوں) مجموعہ روایتین سے دو[۲] درجے مفہوم ہوئے۔ ایک یہ کہ جس طاعت میں مشغول ہے اس کے غیر کا قصداً استحضار بھی نہ ہو۔ اگرچہ وہ بھی طاعت ہی ہو دوسرا درجہ یہ کہ دوسری طاعت کا استحضار ہو جاوے اور ان دونوں میں یہ امر مشترک ہے کہ اس دوسری طاعت کا اس طاعت سے قصد نہیں ہے مثلاً نماز پڑھنے سے یہ غرض نہیں کہ نماز میں یکسوئی کے ساتھ تجہیز جیش کریں گے۔ پس حقیقت اخلاص تو دونوں میں یکساں ہے اس میں تشکیک نہیں البتہ عوارض کے سبب ان میں تفاوت ہو گیا اور درجہ اول اکمل اور درجۂ دوم اگر بلا عذر ہے تو غیر اکمل اور اگر عذر سے ہے تو وہ بھی اکمل ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ضرورت تھی اور اس کا معیار اجتہاد ہے لیکن ہر حال میں اخلاص کے خلاف نہیں۔

اخلاص کے فائدے چاہے[۳] کیسا ہی نیک کام ہو اور چاہے ذرا سا کام ہو مگر خلوص کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے چاہے اس کا کوئی بھی معاون نہ ہو جس[۴] قدر اخلاص زیادہ ہو گا اسی قدر ثواب بڑھتا جائے گا اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر نصف مُد یعنی آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے اُحد (پہاڑ) کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ بات یہ ہے کہ ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر تھا کہ اوروں کے اندر اتنا نہیں اسی واسطے ان کے صدقات و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

طریق کار (اعلیٰ[۵] درجہ یہ ہے کہ) محض خدا کے لیے کام کرے اور مخلوق کا اس میں تعلق ہی نہ ہو (اس سے کم یہ ہے کہ) مخلوق کو راضی کرنے کیلئے کام کرے مگر کوئی دنیاوی غرض مطلوب

۱۔ انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۳۵ ۲۔ انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۳۴ ۳۔ الصوم صفحہ ۹ ۴۔ انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۳۶

نہ ہو۔ صرف اس کا کوشش کرنا مقصود ہو جو دینی غرض ہے (تیسرا درجہ یہ ہے کہ) کچھ نیت نہ ہو نہ دنیا مطلوب ہو نہ دین۔ یونہی خالی الذہن ہو کر کوئی عمل کیا یہ بھی اخلاص یعنی عدم الریاء ہے۔

طریق تحصیل | ریاء[عـہ] کو دفع کرنا عین اخلاص کا حاصل کرنا ہے۔ معالجہ ریاء میں معلوم ہوگا۔

تیسری فصل۔ اُنس اور ناز کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ (الآیہ)[2]
وہ اللہ ایسا ہے کہ تسکین اور اطمینان مومنین کے دلوں میں اتارتا ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ (رواہ مسلم)

لوگ نہیں بیٹھتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں مگر فرشتے ان پر گھر آتے ہیں اور ان کو رحمت خداوندی ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر تسکین اور اطمینان اترتا ہے اور اللہ ان کو ان میں جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتوں میں) یاد کرتا ہے۔ (مسلم شریف)

انس کی حقیقت | جو چیز من وجہ ظاہر اور معلوم ہو اور من وجہ مخفی و مجہول ہو۔ اگر وجوہِ معلوم پر نظر واقع ہو کر اس پر فرح و سرور ہو۔ اس کو انس کہتے ہیں۔ یہ فرح کبھی یہاں تک غلبہ کرتی ہے کہ مطلوب کے صفات جلال پیشِ نظر نہیں رہتے اور اس وجہ سے اس کے اقوال و افعال میں کسی قدر بے تکلفی ہونے لگتی ہے۔ اس کو انبساط و ادلال (اور ناز) کہتے ہیں[3] یہ ایک حال ہوتا ہے جو متوسطین سلوک پر وارد ہوتا ہے۔ کاملین اہلِ دلال نہیں ہوتے ان میں عجز و نیاز غالب ہوتا ہے ہاں وسطِ سلوک میں بعض لوگوں پر غلبۂ بسط سے دلال کا حال وارد ہو جاتا ہے وہ

عـہ تعلیم الدین صـ۸ ، عـہ۲ تعلیم الدین صـ۹۹ ، عـہ۳ الکمال فی الدین صـ۱۷

اس وقت ناز میں آکر بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو دوسرا اگر کہے تو مردود ہوجائے. مولانا رومؒ فرماتے ہیں. ؎

نازرا روئے بباید ہمچو ورد — چوں نداری گرد بد خوئی مگرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز — عیب باشد چشم نابینا و باز
پیش یوسف نازش وخوبی مکن — جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(ترجمہ:- ناز کرنے کے لیے گلاب جیسی صورت چاہیئے اور جب ایسی صورت نہ ہو. تو بد خوئی کے قریب نہ جا. بدصورت کو ناز کرنا زیبا نہیں. نابینا آنکھ کھلی ہوئی بدنما معلوم ہوتی ہے. یوسفؑ کے سامنے ناز وخوبی مت کر. سوائے عاجزی اور آہ یعقوبؑ کے اور کچھ مت کر) یعنی ناز کرنے کے لیے بھی منہ چاہیئے. ہر اک کا منہ ناز کے قابل نہیں ہوتا. اگر کسی کو یہ حال حاصل ہو اس کے لیے ناز بجا ہے اور اگر حال نہ ہو تو بجز آہ و نیاز کے کچھ مناسب نہیں اور کبھی تو اہل دلال کی بات سن لی جاتی ہے اور گاہے ان کی گوشمالی بھی کردی جاتی ہے. جب[1] خداوند کریم حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں.

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ	اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر وحی بھیجی ہے سب
اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ	سلب کرلیں پھر اس کے واپس لانے کے لیے آپ کو
بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۙ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ	ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ ملے مگر یہ آپ کے رب
رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ	ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بے شک آپ پر
كَبِیْرًا (الآیہ سورۂ بنی اسرائیل)	اس کا بڑا فضل ہے.

یعنی اگر ہم چاہیں تو یہ سب علوم جو وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو عطا کیے ہیں آپ سے سلب کرلیں تو دوسرا کون شخص ہے کہ اپنی کسی حالت پر ناز کرے. بلکہ ہر وقت تغیر و زوال سے ترساں و لرزاں رہنا چاہیئے.

طریق تحصیل چونکہ[2] یہ بھی آثار محبت سے ہے اس لیے اس کی تحصیل کے لیے کوئی جداگانہ طریق نہیں (یعنی محبت کے ساتھ ساتھ حاصل ہوجاتا ہے. ۱۲)

---

[1] اشرف المسائل ص۱۳۱ [2] تعلیم الدین ص۸۰

چوتھی فصل[1]۔ تبلیغ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ	(اور لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ	کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں
الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ	سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں
الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران)	ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وانهوا عن المنكر (ابن ماجہ)	امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو۔

تبلیغ کی حقیقت

"امر بالمعروف[2]" یقیناً واجب ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور حکم سب کو عام ہے مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے وہ یہ کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطابِ عام، دوسرا خطابِ خاص۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتی اور امر بالمعروف (تبلیغ) عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں بلکہ یہ صرف علماء پر واجب ہے (مگر عوام مسلمین کے ذمہ سفر خرچ و دیگر اسباب کا مہیا کرنا ہے) اور امر بالمعروف کا مدار قدرت پر ہے یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے اس کے ذمہ واجب ہے کہ امر بالمعروف کرے۔ مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ (اور دیگر ضروریاتِ دین) کی نصیحت کریں۔ خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بیوی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے آقا کیلئے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور جوان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔

حدیث شریف میں ہے :۔

مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ	تم اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا امر کرو جب کہ

---

[1] بیان القرآن ص۴۲ ج۲۔ [2] آداب تبلیغ ص۱۰، ۲۲، ص۲۵ ملخصاً۔

اِذَا بَلَغُوْا سَبْعًا وَاضْرِبُوْهُمْ اِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا
ان کی عمر سات سال ہو اور دس سال کی عمر میں مار کر پڑھاؤ۔

غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو امورِ خیر کا حکم کرے اور خلاف شرع باتوں سے روکے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ[1]
یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

جو[2] شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر قادر ہو یعنی قرائن سے غالب گمان رکھتا ہو کہ اگر امر و نہی کرے گا تو مجھ کو کوئی ضرر معتد بہ لاحق نہ ہوگا۔ اس کے لیے امورِ واجبہ میں امر و نہی کرنا واجب ہے اور امورِ مستحبہ میں مستحب (مثلاً نماز پنجگانہ فرض ہے تو ایسے شخص پر واجب ہوگا کہ بے نماز کو نصیحت کرے۔ اور نوافل مستحب ہیں ان کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا اور جو شخص بالمعنی المذکور قادر نہ ہو۔ اس پر امر و نہی کرنا امورِ واجبہ میں بھی واجب نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ تارکِ واجبات و مرتکب محرمات سے دل سے نفرت رکھے۔ البتہ اگر ہمت کرے تو ثواب ملے گا۔ پھر اس امر و نہی میں قادر کے لیے امور واجبہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قدرت ہاتھ سے ہو تو ہاتھ سے اس کا انتظام واجب ہے اور اگر (ہاتھ سے قدرت نہ ہو اور) صرف زبان سے قدرت ہو۔ زبان سے کہنا واجب ہے۔

ہاتھ[3] سے ازالۂ منکر کرنے کا اختیار حکام کو ہے۔ عوام کو اس کا اختیار نہیں۔ راز یہ ہے کہ عوام کی دست اندازی سے فساد ہوگا اور شریعت کا مقصود امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے اصلاح ہے نہ کہ فساد لیکن حکومت کے درجے ہیں۔ باپ کو بیٹے پر اور شوہر کو بیوی پر۔ استاد کو شاگرد پر فی الجملہ حکومت ہوتی ہے لہٰذا ان کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہاتھ سے بھی امر بالمعروف کا حکم ہے۔

حدیث[4] شریف میں آیا ہے کہ "جب لوگ معصیت میں مبتلا ہو جائیں اور ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو ان کو معصیت سے روک سکتے ہیں مگر وہ کاہلی کریں اور ان کو معصیت سے منع نہ کریں تو حق تعالیٰ ان پر عذاب نازل فرمائے گا۔" حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ "ایک قصبہ پر عذاب نازل ہو چکا ہے جس میں اٹھارہ ہزار مسلمان

---

[1] بیان القرآن سورۂ حج [2] بیان القرآن حاشیہ سورۂ آلِ عمران [3] کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۶۱، [4] تبلیغ دین صفحہ ۲۷

آباد تھے اور ان کے اعمال انبیاء جیسے تھے مگر اتنا نقص تھا کہ اللہ کی نافرمانیاں دیکھ کر ان کو غصہ نہ آتا تھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑے ہوتے تھے لہٰذا ہلاک کر دیئے گئے۔ (معلوم ہوا کہ) اگر کسی جگہ پر کوئی ناجائز کام ہوتا ہوا دیکھو گے اور خاموش بیٹھے رہو گے۔ تو اس گناہ میں تم بھی شریک سمجھے جاؤ گے۔

پس خوب سمجھ لو کہ ان گناہوں کے موقعوں سے صرف بچنا ہی ضروری نہیں بلکہ جب تک بے تامل نصیحت نہ کرو گے۔ اور گناہ سے ان کو روک نہ دو گے۔ اس وقت تک بری الذمہ ہرگز نہ ہو سکو گے۔

تبلیغ کے آداب وشرائط

امر[1] بالمعروف کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضوابط (قاعدے) اور طرق (طریقے) مقرر ہیں ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے اس کے الگ آداب ہیں ایک فروع کی تبلیغ اس کے الگ آداب ہیں (اور وہ یہ ہیں کہ)

(۱) اس[2] امر کے متعلق (جس کی تبلیغ کرنی ہو) شریعت کا پورا حکم معلوم ہو۔

(۲) امر[3] بالمعروف کی اول شرط اخلاص ہے کہ محض لوجہ اللہ نصیحت کرے اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے نصیحت نہ کرے اور اس کا معیار یہ ہے کہ عین نصیحت کے وقت بھی یہ شخص مخاطب کو اپنے سے افضل سمجھے۔

(۳) دوسروں کی نصیحت کے لیے شفقت شرط ہے۔

(۴) تبلیغ کے وقت خود نفس تبلیغ کو مطلوب سمجھے۔ ترتب[5] ثمرات کو مقصود نہ سمجھے کہ وہ غیر اختیاری ہیں

(۵) وعظ میں تعرض خاص نہ ہونا چاہیئے بلکہ خطاب عام ہونا چاہیئے۔

(۶) واعظ (کے لیے مناسب ہے کہ) محض تبلیغ کے لیے ہو کہ احکام کی تبلیغ کرے اور اس کو ہدایا لینے سے قطعاً منع کر دیا جائے۔ جب وعظ بے غرض ہوگا۔ اس کا مخاطب پر بڑا اثر ہوگا۔

(۷) کسی[4] شخص کی مجمع عام میں اصلاح نہ کی جائے۔ کیونکہ اس سے دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے

۱؎ آداب التبلیغ ص۷،۸ ، ۲؎ بیان القرآن سورۂ آل عمران ۳؎ انفاس عیسیٰ ص ۲۴۹، ۲۵۴، ۲۵۶

۴؎ اشرف السائل ص۱۱ ۵؎ یعنی جس کو تبلیغ کی ہے وہ اس کی بات مان لے۔

اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہے کہ نصیحت کرنے والے سے بغض ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس امر کو ترک کرنے کی بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ یا تو خود اس کو خلوت میں لے جا کر اس سے کہہ دے یا اگر اس سے نہ کہہ سکے تو کسی ایسے شخص سے کہہ دے جو کہ اس کی اصلاح کر سکے لیکن اس کے دشمن سے نہ کہے کیونکہ دشمن سے کہنے میں اصلاح تو ہو نہیں سکتی ہاں تذلیل ہوگی۔

(۸) سختی اور درشتی کا اظہار نہ ہو بلکہ نرمی اور شفقت سے امر بالمعروف کرے اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے محض خطاب عام پر اکتفا کرے۔ نرمی سے کہے[۲] تحقیر اور طعن کے طور پر نہ کہے۔

طریق تبلیغ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (الآیہ)

(حق تعالیٰ فرماتے ہیں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مواعظ حسنہ کے ساتھ بلائیے اور اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو ان سے مجادلہ (بھی) کیجیے مگر احسن طریقہ سے[۳]

سبیل رب وہ ہے جس سے ان تک رسائی ہو جاتی ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے اسی کی طرف بلانے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہوا ہے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے تین چیزیں بتلائی ہیں۔ دعوت[۱] بالحکمت، دعوت[۲] بالموعظۃ الحسنۃ، اور ایک مجادلہ[۳]۔ یعنی ایک قسم یہ ہے کہ موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جاوے۔

گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک اپنے دعوے کا اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کا ابطال۔ تو حکمت یہ کہ اپنے دعویٰ پر علمی دلائل قائم کیے جائیں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعیٰ کو باطل کیا جاوے۔ اصل مقصود یہ دونوں ہیں باقی تیسری چیز موعظہ حسنہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد (بندوں) کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لیے موعظہ حسنہ بھی ایک طریق بتلا دیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا۔ وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری

---

[۱] الفاس عیسیٰ صد ۲۰۵، [۲] اشرف المسائل صد ۱۱۱ [۳] آداب التبلیغ صد ۲۶، ۲۳، ۲۹، ۲۷ ملخصاً

کر دیتا ہے دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوالوں۔ اس لیے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے۔ چنانچہ اس کو سمجھاتا ہے، کڑھتا ہے دل سے دعا کرتا ہے اوروں سے بھی دعا کراتا ہے تو دیکھیے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ بغرض محض شفقت ہی کے مقتضا سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو۔ بلکہ ساتھ ساتھ موعظۂ حسنہ بھی کرتے رہو وہ ایسے مضامین مؤثرہ ہیں۔ جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو۔ دل پگھل جاتے۔ (جیسے) درجاتِ جنت کی ترغیب اور جہنم سے ترہیب کرنا وغیرہ۔ (مثلاً) باپ کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے اس کو مت کھانا۔ یہ پیٹ میں درد پیدا کر دے گی۔ پھنسیاں نکل آئیں گی۔ اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لو گے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا تو اس لیے ترغیب و ترہیب دونوں کی ضرورت ہے۔

نصیحت[1] کا قاعدہ یہ ہے کہ مصلح اپنے اوپر شفقت ڈالے اور مخاطب کو آسان طریقہ سے سمجھائے۔ ابتدا میں تو تالیف قلب کرے اور انتہا میں صفائی سے کام لے یعنی مسئلہ کو صاف صاف بیان کر دے۔ گول مول بیان نہ کرے ابتدا میں ترغیب اعمال، اخلاق کے پیرایہ میں دینی چاہیے تاکہ مخاطب کو گرانی اور وحشت نہ ہو۔ مثلاً اس طرح (نصیحت شروع کرے) کہ نفس کو پابند کرنا اور آزادی سے روکنا اور اس میں استقلال اور پختگی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ انسان اور جانور میں کیا فرق ہے؟ مردانگی اس میں ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو نفس کا تابع فرمان نہ ہو۔

طریق کار دو چار آدمی مل کر تبلیغ کا کام شروع کر دیں اور اپنی قلت پر نظر نہ کریں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دیں۔ (تبلیغ عام کے لیے) ایک مبلغ مقرر کر لیں اور اس کا خرچہ اپنے

---

[1] انفاس عیسیٰ ص ۲۵۱ تا ۲۵۳ ملخصاً۔

ذمہ لیں کسی عالم کو مشورہ کے لیے منتخب کریں۔ اسی کے مشورہ سے مبلغ رکھیں اور اسی کی رائے سے تبلیغ کا طریقہ اختیار کریں اور مبلغ سے کہہ دیں کہ جس طرح فلاں شخص کہے اسی طرح کرو۔

رفاہِ عام کا کوئی کام کرنے کا (ایک) طریقہ یہ ہے کہ اپنے سے جتنا کام ہو سکے شروع کر دے۔ مثلاً ایک دینی مدرسہ قائم کرنا ہے تو لڑکے لے کر بیٹھ جائیں اور پڑھانا شروع کر دیں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دیں کہ اتنا ہی ہمارے بس میں تھا بس اپنا کام کیجیے آگے اللہ تعالیٰ مالک ہے۔ مدرسہ بھی جاری کرا دے گا۔

طریقِ تحصیل تبلیغ کے فضائل اور ترک تبلیغ کے مؤاخذہ کو ذہن میں حاضر کرنا اور اس میں غور و فکر کرنا اس کا طریقِ تحصیل ہے۔

پانچویں فصل — تفکر کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ الآیۃ۔ — اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے شاید وہ کچھ فکر کریں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فَاٰثِرُوْا ما يبقى على ما يفنى (رواہ احمد) — پس باقی (رہنے والی) چیزوں کو فانی چیزوں پر اختیار کرو۔

حقیقتِ تفکر دو معلوم چیزوں کا ذہن میں حاضر کرنا جس سے تیسری بات ذہن میں آجائے (اسکا نام تفکر ہے) مثلاً ایک بات یہ جاننا ہے کہ "آخرت باقی ہے"۔ دوسری بات یہ جاننا ہے کہ "باقی قابلِ ترجیح کے ہے"۔ ان دونوں سے تیسری یہ بات معلوم ہوئی کہ "آخرت قابلِ ترجیح کے ہے" اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

لہ تعلیم الدین صہ ۹۷

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور
وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ	یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے جانے میں
وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ	اہل عقل کے لیے دلائل ہیں جن کی حالت یہ
الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا	ہے کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ	زبان سے بھی) کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی
يَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور
وَالْأَرْضِ ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ	زمین کے پیدا ہونے میں غور (وفکر) کرتے ہیں
هٰذَا بَاطِلًا ۔ سُبْحٰنَكَ	کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس (مخلوق)
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ؕ	کو لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں
الآیہ	رکھی ہیں) ہم آپ کو منزہ (اور پاک) سمجھتے ہیں
	سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔

اس میں صاف تعلیم ہے کہ خلق سموات و ارض میں اس غرض سے تفکر کرنا چاہیئے کہ خداوند کریم کی حکمت و قدرت کا علم ہو کہ یہ فضول پیدا نہیں کیئے گئے پھر اس سے امکانِ وقوعِ معاد (یعنی آخرت) پر استدلال کر کے جنت کی طلب اور جہنم سے استعاذہ (یعنی اعمالِ صالحہ کرنے اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام) کرنا چاہیئے۔ اسی لیے حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس باب میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان کہ آپ ہمیشہ فکر و سوچ اور غم میں رہتے تھے اور اس فکر اور غم ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ کبھی کھل کر ہنستے نہ تھے۔ حدیث شریف میں ہے کان جل ضحکہ التبسم کہ آپ کا بڑا ہنسنا یہ ہوتا تھا کہ آپ تبسم فرما لیتے تھے اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حوصلہ تھا کہ ہماری خاطر سے تبسم فرما لیتے تھے ورنہ جس کے سامنے وہ احوالِ شدیدہ ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف تھے اس کو تو تبسم بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر تم وہ باتیں جانتے جو مجھے معلوم ہیں تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا

لہ بیان القرآن آخر سورۂ آل عمران والرحیل صہ ۲۳۰

کرتے۔ یعنی بالکل نہ بنتے۔

تفکر کی ضرورت

عَنْ عَلِیٍّ[1] قال لَا خیر فی قراءۃ لیس فیھا تدبر و لا عبادۃ لیس فیھا فقہ (الحدیث اخرجہ رزین)۔

حضرت علی رضی سے روایت ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا۔ ایسے قرآن مجید پڑھنے میں کوئی (معتدبہ) نفع نہیں جس میں فکر نہ ہو اور نہ ایسی عبادت میں جس میں معرفت نہ ہو۔

صوفیہ کے طریق کا مدار اعظم ہی فکر ہے (لہٰذا) خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اکابر کو (بھی) فارغ ہوکر بیٹھنا نہ چاہیئے۔ مثل مبتدی کے اہتمام اصلاحِ اعمال اور راندیشہ تغیر حال میں لگا رہنا چاہیئے فکر کی وجہ[2] سے راستہ خود بخود منکشف ہونے لگتا ہے۔ سوچنے کی مثال ایسی ہے جیسے گھڑی کی بال کمانی۔ کہ ہے تو مختصر مگر تمام پرزوں کی حرکت اسی سے ہوتی ہے۔ اسی طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہوجاتے ہیں۔

سارا[3] قرآن مجید فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ قیامت کے بارہ میں ارشاد ہے کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کے لیے ملکوت السمٰوٰت والارض میں نظر کرنا چاہیئے۔ ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا و آخرت میں فکر کرو یعنی دنیا و آخرت میں موازنہ کے لیے تفکر کرو کہ ان میں اختیار کرنے کے قابل کون ہے اور کون قابلِ ترک ہے اہلِ اللہ نے دنیا میں فکر کرکے ہی اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اسی لیے دنیا سے ان کو نفرت ہے۔

طریق فکر نورِ ایمان کے کامل کرنے کا طریقہ ذکر و فکر ہے جس کو (اللہ تعالیٰ نے) اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ہر شخص یہ دیکھتا (اور فکر کرتا) رہے کہ کل کیواسطے کیا سامان کیا[4] یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہے کہ آج دن میں کتنے نیک کام ہوئے جو نیک کام ہوئے ہیں ان پر خدا کا شکر کرے اور جو گناہ ہوئے ہیں ان سے توبہ و استغفار کرے جو بات کہے سوچ کر کہے۔ جو کام کرے پہلے اس کے انجام کو سوچ لے۔ مراقبات[5] کرے (بالخصوص مراقبہ موت) اور اگر موت کے

لہ الکشف صد ۲۲۰، ۲۶۶ لہ کمالات اشرفیہ صد ۶۹، ۶۲ لہ المراقبہ صد ۲۰۰۴ لہ کمالات اشرفیہ صد ۶۲، ۶۳۔

سوچنے سے کسی کا دل گھبرا دے تو حیات کو سوچے کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے جو خیر بھی ہے۔ ابقیٰ (باقی رہنے والی) بھی ہے الذّ (بہت لذیذ) بھی ہے۔ اشہیٰ (بہت زیادہ پسندیدہ) بھی ہے۔ یوں تصوّر کرے کہ میں آسمان پر پہنچا ہوں۔ حوریں ہیں، باغ کی، قصور کی سیر کر رہا ہوں پھر یہ خیال کرے کہ یہ چیزیں جب ملیں گی جب خدا کے حکموں کی پابندی کرے دل گا اس سے لالچ اور رغبت پیدا ہوگی اور اعمال صالحہ سرزد ہوں گے۔

طریق تحصیل دونوں چیزوں (یعنی دنیا اور آخرت کی حقیقت) کا ذہن میں حاضر کرنا۔ (تفکر کی تحصیل کا طریق ہے)

چھٹی فصل۔ تفویض کا بیان[۶]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس مومن نے کہا۔

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ۔ الآیہ — اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ سب بندوں کا (خود) نگراں ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا[۲] اصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء واذا امسیت فلا تحدث نفسك بالصباح۔ الحدیث — جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ۔ اور شام ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ لاؤ۔

حقیقتِ تفویض و طریقِ کار اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا کہ جو وہ چاہیں ان میں تصرف کریں اور اپنی طرف سے کوئی حالت یا انتظام تجویز نہ کرنا (تفویض ہے)[۳] جو تمام حالات کو شامل ہے۔ خواہ وہ حالات آفاقیہ ہوں۔ خواہ انفسیہ ہوں۔ پھر انفسیہ میں خواہ احوال حسیّہ ہوں۔ جیسے مرض و صحت اور قوت و ضعف، خواہ باطنیہ ہوں جیسے قبض و بسط، ہیبت و انس اور محبت و شوق و امثالہا۔

۱ے تعلیم الدین صہ ۷۹ ۲ے الجبر بالصبر صہ ۳۶ ۳ے انفاس عیسیٰ صہ ۲۲۲، ۲۲۱، ۲۳۰

تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کرے اور جن امور میں تدبیر کا کچھ تعلق و دخل نہیں۔ ان میں تو ابتداء ہی سے تفویض و تسلیم اختیار کرے۔ اپنی طرف سے کوئی حالت یا نظام تجویز نہ کرے۔ تجویز ہی تمام تر پریشانیوں کا سبب ہے کہ ہم نے ہر چیز کا ایک نظام خاص اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہیئے پھر اس نظام کے خلاف واقع ہونے سے کلفت ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے، تو غیر اختیاری امور کے لیے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے اسی لیے اہل اللہ نے تجویز قطع کر کے یہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم خدا کے ہیں ان کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں تصرف کریں۔ پھر اس کے بھی دو۲ طریق ہیں کبھی تو استحضارِ ثواب سے تفویض حاصل ہوتی ہے کہ اس سے ہم کو ثواب ملے گا اور کبھی محض رضائے حق کے لیے تفویض کی جاتی ہے۔ گو ثواب بھی مل جائے مگر یہ شخص محض اس لیے تفویض کرتا ہے کہ محبوب کا حق یہی ہے کہ اس کے سامنے اپنی رائے اور تجویز کو فنا کر دیا جائے یہ تفویض کا اعلیٰ درجہ ہے۔

صاحبِ[2] تفویض تو ہر امر میں ابتدا ہی سے تفویض کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے محض سنت اور طاعت سمجھ کر کرتا ہے اس کی یہ نیت نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور کامیاب ہی ہو بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے اور دونوں حالتوں میں راضی رہتا ہے (اور اسی میں راحت بھی ہے) مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں بلکہ دنیا ہے۔ حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا بلکہ محض رضائے حق کا قصد ہو۔ کیونکہ راحت تو بہر حال ہو گی مگر اس نیت سے ثواب باطل ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ اس نیت کی نحوست سے راحت بھی کم نصیب ہو نیز اس درجہ کا رضا و قرب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو تفویض کو محض حق تعالیٰ کا حق سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔

---

۱ الاجر بالصبر ص۳۶　۲ انفاسِ عیسیٰ ص۳۲۱، ۲۲۴

یہ سمجھ کر تفویض اختیار کرو کہ تم غلام ہو اور وہ آقا ہیں اور آقا کا حق ہے کہ غلام اپنے سب امور اس کو مفوض کر دے اور اپنی منفعت و مصلحت کا خیال نہ کرے پھر وہ منافع و مصالح بھی خود بخود حاصل ہو جائیں گے کیونکہ وہ تفویض کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ادائے حق عظمت کے ساتھ وہ منافع مع ثواب و رضا کے حاصل ہوں گے اور اس کے بغیر گو منافع مرتب ہوں گے مگر اس میں رضا و قرب زیادہ نہ ہوگا۔

(الغرض) اپنی تجویز کو دخل نہ دیں بلکہ اپنی تربیت کو خدا تعالیٰ کے سپرد کریں کہ جس طرح چاہیں تربیت کریں، حالات و کیفیات عطا کریں یا سب کو سلب کر لیں اپنی تجویز کو خدا تعالیٰ کی تجویز میں فنا کر دیں (یعنی کامل عبدیت اختیار کریں)۔

طریق تحصیل جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آوے اس وقت اس کو فوراً ذہن میں حاضر کر لیا جاوے کہ یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے ابتداء میں تو اہل اللہ کو یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی حکمت و قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ حالت ان کے لیے امر طبعی بن جاتی ہے۔

ساتویں فصل۔ تقویٰ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ الآیہ	اے ایمان والو، خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الا ان التقویٰ ھٰھنا واشار الی صدرہ	آگاہ رہو کہ تقویٰ اس جگہ ہے اور آپ نے قلب کی طرف اشارہ کیا۔

حقیقت تقویٰ تقویٰ کا امر اور فضل قرآن مجید میں جس قدر ہے غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں اس سے اس کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوا حقیقت اسکی

۱؎ انفاس عیسیٰ ص ۲۲۶، ۲۱۹، ۲؎ الکمال فی الدین ص ۴۱ ۳؎ الکمال فی الدین ص ۱۴۱، ۸۳، ۸۵، ۸۲

یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے ایک "ڈرنا" دوسرے "بچنا" اور تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو معاصی سے بچنا ہی ہے مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے جبھی اس سے بچا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اوّل جب فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ کا نزول ہوا تو اس سے صحابہؓ ڈر گئے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی حق تقویٰ لازم ہوگیا۔ حالانکہ شروع ہی سے تقویٰ کا حصول دشوار ہے۔ حق تقویٰ کے معنی ایک تو یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق جیسا تقویٰ ہے وہ اختیار کرو (سو آیت میں) یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اس کی تکلیف تکلیف مالایطاق ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجالاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ ابتدا ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے تو صحابۂ کرامؓ نے اس آیت کو بمعنی اول سمجھا اور پھر یہ خوف ہوا کہ حق تقویٰ کا آج ہی سے حاصل ہونا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیونکر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہو سکتا ہے اس وقت تو اسکو اختیار کرو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جائے اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی۔

تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک تقویٰ یہ ہے کہ کفر اور شرک سے بچے دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے۔ پھر جیسے جیسے اعمال ہونگے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا رہے گا اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا۔ حتیٰ کہ درجہ "احسان" (حاصل ہو جائے گا) جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ	مشرق کیطرف کر لو یا مغرب کو (کر لو) لیکن (اصلی
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات

ل بیان القرآن صفحہ ۹ ج ۱

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ
ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ
السَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَ
اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ
وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ
فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ
حِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ الآیہ

وصفات) پر یقین رکھے اور (اسی طرح) قیامت
کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود)
پر (بھی) اور (اللہ کی) کتاب پر اور (سب)
پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو۔
اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو
اور (نادار) یتیموں کو اور (دوسرے غریب)
محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو
اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو (قیدی)
اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ
کرتا ہو) اور وہ شخص نماز کی پابندی بھی رکھتا
ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص
(کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی
رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے
ہوں جب (کسی جائز امر کا) عہد کرلیں اور
(اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ)
وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل مزاج رہنے والے
ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے)
بیماری میں اور (تیسرے معرکہ) قتالِ (کفار)
میں (یعنی کم ہمت اور پریشان نہ ہوں) یہ لوگ
ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور
یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں

غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں۔ نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا انھیں کمالاتِ مذکورہ میں سے ایک کمالِ خاص یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے اور اس

کے حسن سے اس میں بھی حسن آگیا ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔

اس[1] آیت میں تمام ابوابِ تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول محض صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے اس کے بعد ایمان باللہ و ایمان بالمعاد اور ایمان بالملئکہ اور ایمان بکتبِ سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے یہ تو اعتقادیات کے متعلق ہے۔ پھر حبِ مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبتِ الٰہی میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے) یہ اصلاحِ قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامتِ صلوٰۃ کا امر ہے۔ یہ طاعت بدنیہ ہے۔ پھر ایتاءِ الزکوٰۃ کا، یہ طاعت مالیہ ہے۔ اس کے بعد ایفاءِ عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے۔ غرض اس میں تمام شعبِ تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا ہے اسی لیے اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ پر اس کو ختم فرمایا ہے۔

اعمال[2] تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو دین میں نافع ہیں۔ ان کا ترک کرنا مامور بہ ہے خواہ درجۂ فرضیت و وجوب میں ہو یا درجۂ سنیت و استحباب میں۔ اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں۔ ان کا ترک مامور بہ ہے۔ خواہ درجۂ حرمت میں ہو یا کراہت میں اور بعض وہ ہیں کہ جن کے فعل یا ترک کا امر نہیں۔ وہ مباحات ہیں۔ مباحات اپنے اثر کے لحاظ سے دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ دین کے لیے نافع ہیں جیسے بغرضِ حفظِ صحت چلنا پھرنا۔ ورزش کرنا یا نافع نہیں۔ اگر دین میں نافع ہے تو وہ فعلاً مامور بہ ہے گو درجۂ وجوب میں نہ ہو مگر جب مباح نافع فی الدین کو اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ مستحب ضرور ہو جاتا ہے اور اس میں ثواب بھی ملتا ہے یا وہ دین میں نافع نہیں تو فضول ہے اور فضولیات کا ترک کر دینا مامور بہ شرعاً ہے چنانچہ حدیث میں ہے من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ مالایعنی کو ترک کر دیا جائے۔ جب فضولیات کے ترک کو حسن اسلام میں دخل ہے اور حسنِ اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہو گیا۔ گو ان کو حرام نہ کہا جائے۔ مگر فضولیات میں اشتغال کراہت سے خالی نہیں پس جس طرح حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی

---

[1] دار الافاضات ص۱۱ [2] حاشیۃ التیسیر ص۱۶، ۱۷، ۲۲ ملخص

طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری ہے۔ غرض بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی برا ہے اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی برا ہے۔

بعض لوگ قبل اسلام کے حالتِ احرامِ حج میں اگر کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تو دروازہ سے جانا ممنوع جانتے تھے اس لیے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے۔ اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے حق تعالیٰ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ الآیۃ	اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو۔ ہاں فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے۔ (چونکہ دروازوں سے گھروں میں آنا حرام نہیں اس لیے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور (اصل الاصول تو یہ ہے کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے) تم امید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو جاؤ۔

اس آیت سے ایک بڑے کام کی بات معلوم ہوئی کہ جو شے شرعاً مباح ہو۔ اس کو طاعت وعبادت اعتقاد کر لینا اسی طرح اس کو معصیت اور محلِ ملامت اعتقاد کر لینا شرعاً مذموم ہے چنانچہ گھروں میں دروازوں سے آنا مباح تھا۔ اس کو ان لوگوں نے معصیت سمجھا تھا اور دروازہ چھوڑ کر کسی اور طرف سے آنا بھی فی نفسہ مباح ہے اس کو ان لوگوں نے عبادت وفضیلت سمجھا تھا۔ اس پر حق تعالیٰ نے ان پر رد فرمایا اور ان کے اعتقاد کو باطل اور مخالف تقویٰ کے ٹھہرایا اور تقویٰ کو واجب فرمایا۔ تو جس چیز سے واجب کا ترک اور خلاف لازم آئے گا وہ ضرور گناہ ہوگی پس ان کے یہ دونوں اعتقاد گناہ ہوئے اس قاعدہ سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا جو کہ عوام بلکہ خواص میں بھی شائع ہیں۔

---

[1] بیان القرآن صفحہ ۱۱۰ ج ۱

(نیز خیال رہے کہ ہر شئی (اور اعضاء) کا تقویٰ ہے۔ آنکھ کا تقویٰ یہ ہے کہ بُری نگاہ سے کسی عورت یا مرد کو نہ دیکھے زبان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے (جھوٹ نہ بولے) کسی کو ستاوے نہیں۔ اسی طرح ہاتھ کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے۔ شہوت سے مس نہ کرے۔ پاؤں کا تقویٰ یہ ہے کہ بری جگہ چل کر نہ جاوے۔ کان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ سنے۔ راگ باجے سے بچے۔ وضع میں بھی تقویٰ ہے کہ خلافِ شریعت وضع نہ رکھے۔ پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھاوے (وغیرہ)۔

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں (جو مذکور ہوئے) اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا۔ دین کا کوئی جزء اس سے باقی نہیں رہا۔ اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو۔ پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت "کمالِ دین" ہونا ثابت ہوگیا۔

طریقِ کار جو کام کریں اس میں یہ دیکھ لیں کہ ہم خلافِ شریعت تو نہیں کرتے خواہ دین کا ہو یا دنیا کا۔ دین کے کام میں تو یہ دیکھ لیں کہ شریعت نے اس کی کامیابی کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ کیا ہے اس کے موافق کریں اور دنیا کا جو کام کریں۔ اس میں صرف یہ دیکھ لیں کہ جائز ہے یا ناجائز۔

طریقِ تحصیل اللہ تعالیٰ کے قہر و عتاب کو یاد کرنا اور سوچنا اس کا طریق تحصیل ہے۔

آٹھویں فصل۔ تواضع کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ — اور رحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں

یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا۔ الآیہ — جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

لہ الصوم صہ ۱۹۔

اور[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ — جو اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے اللہ اس کو بلند کرتا ہے۔

تواضع کی حقیقت

تواضع للّٰہیہ (کی حقیقت) یہ ہے کہ حقیقت میں اپنے کو لاشے سمجھے اور ہیچ سمجھ کر تواضع کرے ۔ اپنے کو رفعت کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے ۔ اس کی اصل مجاہدۂ نفس ہے کیونکہ تواضع اس کا نام نہیں کہ زبان سے خاکسار ، نیاز مند ، ذرۂ بیمقدار کہہ دیا ۔ بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو ذرۂ بیمقدار سمجھ کر بُرا بھلا کہے اور ذلیل کرے تو تم کو انتقام کا جوش پیدا نہ ہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ تو واقعی ایسا ہی ہے پھر کیوں بُرا مانتا ہے اور کسی کی بُرائی سے کچھ رنج واثر نہ ہو تو یہ تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ مدح وذم برابر ہو جائے ۔ مطلب یہ کہ عقلاً برابر ہو جائے ۔ کیونکہ طبعاً تو مساوات ہو نہیں سکتی (کیونکہ غیر اختیاری ہے البتہ اختیاری امور میں تواضع اختیار کرے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-)

وَلَا[2] تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ۔ الآیہ

(حضرت لقمان علیہ السلام نے یہ نصیحت کی کہ بیٹا) لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر ۔ اور زمین پر اترا کر مت چل بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے ، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر (یعنی بے تکلف اور متوسط رفتار تواضع وسادگی کے ساتھ اختیار کر اور بولنے میں) اپنی آواز کو پست کر (یعنی گفتگو میں بھی عاجزی اور تواضع اختیار کر)۔

اللہ[3] تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو تواضع اختیار کرے گا ہم اس کو رفعت عطا کریں گے۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص ۲۴۰ ، [2] بیان القرآن جلد ۹ ص ۱۹ [3] انفاسِ عیسیٰ ص ۲۴۲

(نیز) اتفاق کی اصل تواضع ہے جن دو شخصوں میں تواضع ہوگی ان میں نااتفاقی نہیں ہو سکتی۔ تواضع[1] میں جذب اور کشش کی خاصیت ہے متواضع کی طرف خود انجذاب ہوتا ہے بشرطیکہ صحیح تواضع ہو۔

طریق کار یہ سمجھ[2] کر تواضع اختیار کریں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا حق یہی ہے کہ ان کے سامنے پستی اور تواضع کو اپنی صفت بنائیں اور اپنے کو لاشے سمجھیں۔ لباس[3] اور وضع سے یا اہل دنیا کے طرز گفتگو سے عزت طلب کرنا انسان کا کام نہیں یہ تو نہایت بھدا پن ہے۔ جس جماعت میں شمار ہے اسی کی اصطلاح وضع اور طرز کو اختیار کریں۔ عزت اسی میں ہے۔ اگر مخلوق میں اس سے عزت نہ بھی ہوئی تو کیا پرواہ ہے۔ خالق کے یہاں تو ضرور عزت ہوگی۔ ظاہری اسباب عزت کی ضرورت نہیں انسان تو وہ ہے جو کمالات میں بادشاہ ہو گو ظاہر میں فقیر ہو۔ عارف رح فرماتے ہیں۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلاہ اند

(یعنی عشق کے بھکاری کو حقیر نہ سمجھ کہ یہ لوگ باوجود ظاہری کمر و فر اور تاج نہ ہونے کے بھی بادشاہ ہیں) اگر کوئی لباس پر طعن کرے۔ کرنے دیں۔ طرز میں عیب نکالے نکالنے دیں کسی کی تحقیر کی پرواہ نہ کریں۔ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کافی ہے۔ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں اور یاد رکھیں کہ عشق (و محبت) میں تو ملامت ہوا ہی کرتی ہے خدا تعالیٰ کے عاشق (اور محب) بننا چاہتے ہیں تو ملامت سننے کیلئے تیار رہیں ؎

نساز و عشق را کنجِ سلامت
خوشا رسوائی کوئے ملامت

(لیکن[4]) جس جگہ زیادہ تواضع کرنے سے دوسرے کو تکلیف ہوتی ہو وہاں قصداً اتنی تواضع نہ کریں۔ کیونکہ بعض طبائع کو بلکہ اکثر کو واقعی (زیادہ) تواضع کرنے سے ندامت اور تکلیف ہوتی ہے۔ باقی اگر حال ہی غالب ہو جاوے۔ یا اس طرف التفات ہی نہ ہو وہ

---

[1] کمالات اشرفیہ صد ۴۵ ، [2] انفاس عیسیٰ صد ۲۴۸ ؛ [3] الرحیل ست ۱۳۸۵ھ منحصا ، [4] الرغبۃ المرغوبہ صد ۳۱

اور بات ہے۔

طریقِ تحصیل (طریقِ تحصیل وہی ہے جو تکبر کا طریقِ علاج ہے۔)

نویں فصل۔ توبہ کا بیان

[1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا۔ الآیہ — اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی طرف خالص توبہ کرو

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

یا ایہا الناس توبوا الی اللہ مسلم — اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو۔

توبہ کی حقیقت خطا کو یاد کر کے دل کا دکھ جانا اور اس کے لیے لازم ہے اس گناہ کا ترک کر دینا اور آئندہ کو پختہ ارادہ رکھنا کہ اب نہ کریں گے اور خواہش کے وقت نفس کو روکنا (توبہ کہلاتا ہے)۔

توبہ[2] کے معنی رجوع کرنے اور بُعد سے قُرب کی جانب لوٹ آنے کے ہیں۔ مگر اس کے لیے بھی ایک ابتدار ہے اور ایک انتہار ہے۔ ابتدار توبہ ہے کہ قلب پر نورِ معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں اور دل کو مضمون کی پوری آگاہی حاصل ہو جائے کہ گناہ سمِ قاتل ہے اور تباہ کر دینے والی شے ہے اور پھر خوف اور ندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت اتنی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کے لیے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کر لے اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گذشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے۔ جب ماضی اور مستقبل اور حال تینوں زمانوں کے متعلق توبہ کا یہ ثمرہ پیدا ہو جائے گا تو گویا توبہ کا وہ کمال حاصل ہو گیا جس کا نام توبہ کی انتہار ہے۔

---

[1] تعلیم الدین صہ۴۷ ؛ [2] تبلیغ دین صہ۸۵

محققین[1] کا مشہور قول تو یہ ہے کہ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ عدمِ عود (یعنی پھر گناہ نہ کرنے) کا عزم ہو لیکن بعض محققین کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں بلکہ عزم کا نہ ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس عزم میں ایک قسم کا دعویٰ اور مشیت سے غفلت بلکہ مشیت سے معارضہ ہے لیکن ذوق اور ظاہر نصوص اس کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ عزم مقدمہ ہے۔ کف کا۔ اور کف واجب ہے اور واجب کا مقدمہ واجب ہوا کرتا ہے۔ اس لیے عزم عدمِ عود توبہ کے لیے لازم ہے۔ میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ عزم کے ساتھ قدرت و مشیتِ الٰہی پر بھی نظر کر کے ابتلاء کا بھی اندیشہ رکھے۔ غیر عارفین کی توبہ کی طرح نہ ہو کہ عزم کرتے ہوئے قضاء و قدر سے بالکل غافل رہتے ہیں۔ محققین[2] کے نزدیک توبہ کی حقیقت صرف ندامت ہے جیسا کہ حدیث میں ہے التوبة الندم یہ عزم مستقل طاعت ہے۔ صحت توبہ کا موقوف علیہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ[3] نے ارشاد فرمایا :۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى	توبہ جس کا قبول کرنا (حسب وعدہ) اللہ تعالیٰ
اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ	کے ذمہ ان لوگوں کی ہے جو حماقت سے کوئی
السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ	گناہ (صغیرہ یا کبیرہ) کر بیٹھتے ہیں پھر قریب
يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ	ہی وقت میں (یعنی قبل حضورِ موت) توبہ کر
فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ	لیتے ہیں۔ سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ (قبولِ
عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ	توبہ کے ساتھ) توجہ فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول
عَلِيمًا حَكِيمًا وَ	فرما لیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں
لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ	(کہ کس نے دل سے توبہ کی) حکمت والے ہیں
يَعْمَلُونَ السَّيِّـَٔاتِ	(کہ دل سے توبہ نہ کرنے والوں کی فضیحت نہیں
حَتَّىٰٓ إِذَا حَضَرَ	کرتے) اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں
أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ	جو (برابر) گناہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص۱۹۲، ۱۹۳، [2] الاصابہ ص۱۵، [3] بیان القرآن ص۱۰۱ ج ۲

قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْاٰنَ الآیۃ — کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آکر کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔

(یہاں) حضور موت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگیں اور برابر گناہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بار بار کرتے ہیں۔ بلکہ اگر ایک بار بھی گناہ کر کے اس سے توبہ نہ کی تو بوجہ اس کے کہ یہ اصرار ہے اور اصرار حکم عود میں ہے اس لیے اس کو بھی مثل بار بار گناہ کرنے کے کہا جاوے گا۔ یہ مطلب ہے برابر کرنے کا۔ اور جاننا چاہیئے کہ قریب کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی سے ناامیدی ہو جائے لیکن اب تک اس عالم کے احوال و اہوال نظر نہیں آئے۔ اس حالت کو "یاس" کہنا مناسب ہے اور دوسرے یہ کہ احوال بھی نظر آنے لگیں۔ اس کو "حالت یاس" کہنا زیبا ہے۔ پس پہلی حالت میں تو کافر کا ایمان لانا اور عاصی کا توبہ کرنا دونوں مقبول ہیں اور دوسری حالت میں دونوں غیر مقبول محققین کا یہی مذہب ہے اور ظاہر قرآن سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ یہ جو فرمایا کہ "حماقت سے الخ" یہ قید واقعی ہے احترازی اور شرطی نہیں کیونکہ ہمیشہ گناہ حماقت ہی سے ہوتا ہے جس کو اپنے نفع اور ضرر کی پرواہ نہ ہو اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہوگی اور عاصی کے حق میں جو فرمایا کہ توبہ بوقت حضورِ موت مقبول نہیں۔ یعنی وعدۂ مغفرت اس پر مرتب نہیں اور ویسے اگر مشیت سے فضل ہو جائے تو کوئی امر مانع نہیں۔

اور قبولِ توبہ[1] کی علامت یہ ہے کہ اس گناہ کا نقش بالکلیہ ذہن سے محو ہو جائے، محو ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس کا اثر خاص یعنی قلق طبعی نہ رہے گو یاد بھی رہے اور قلق اعتقادی بھی رہے۔

ضرورتِ توبہ

توبہ[2] کے معنی اور حقیقت سمجھنے کے بعد واضح ہو گیا ہوگا کہ توبہ ہر شخص پر واجب ہے کیونکہ حق تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب بنا کر

---

[1] انفاس عیسیٰ صفحہ ۱۹۱ ، [2] تجدید ان صفحہ ۹۵ ۔

فرماتا ہے کہ "اے ایمان والو! تم سب توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ" چونکہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کو اخروی زندگی کے لیے سم قاتل اور مہلک سمجھے اور ان کے چھوڑنے کا عزم کرلے اور اتنا مضمون ایمان کا جزو ہے۔ اس لیے ہر مومن پر اس کا واجب اور ضروری ہونا تو ظاہر ہے۔

اللہ[1] تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ الآیہ یعنی جو شخص (موافق قاعدۂ شریعت کے) اپنی اس زیادتی (یعنی گناہ) کرنے کے بعد توبہ کرلے اور (آئندہ کے لیے) اعمال کی درستی رکھے (یعنی تمام برائیوں کو چھوڑ دے۔ شریعت کے مطابق کام کرے اور اپنی توبہ پر قائم رہے۔) تو بیشک اللہ تعالیٰ اس (کے حال) پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائیں گے کہ توبہ سے پچھلا گناہ معاف فرمائیں گے اور استقامت علی التوبہ سے مزید عنایت فرمائیں گے۔ حق تعالیٰ[2] فرماتے ہیں کہ میرے بندے اگر زمین و آسمان کے برابر بھی گناہ لے کر میرے پاس آئیں اور مجھ سے مغفرت چاہیں تو میں سب کو بخش دوں گا اور گناہ کی کثرت کی پرواہ نہ کروں گا۔ پس عمر گذشتہ کے ضائع ہونے کا بھی علاج موجود ہے۔ لاعلاج کوئی مرض نہیں وہ علاج یہ ہے کہ توبہ کرو اور توبہ کے بعد اگر ادائے حقوق کا موقع نہ ملے تو توبہ سے اس کے لیے حقوق العباد بھی معاف ہو جاویں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کرکے ظالم کی مغفرت فرمائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے:-

التائب[3] من الذنب کمن لا ذنب له	گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ شخص جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔

نیز رسول[4] اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

انی لاستغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ	بے شک میں ہر روز ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔

---

[1] بیان القرآن ص ۲۶، ۱۳۰ ج ۲، [2] انفاس عیسیٰ ص ۱۹۲، ۱۹۳، [3] الجمعین ص ۳۳
[4] دعوات عبدیت ص ۳۲ ج ۱۔

عصمتِ انبیاء (یعنی انبیاء کا گناہوں سے پاک ہونا) ایک مسلّم مسئلہ ہے پھر بھی آپ استغفار فرما رہے ہیں۔ (یہ انبیاء اور) اکابرینِ مقبولین کی حالت ہے تو ہم کس شمار میں ہیں اس کی پرواہ نہ کریں کہ توبہ ٹوٹ جائے گی جب توبہ ٹوٹ جائے فوراً دوبارہ پھر توبہ کرلیں مگر شرط یہ ہے کہ توبہ دل سے ہو۔ یعنی توبہ کے وقت یہ عزم پختہ ہو کہ اب یہ گناہ نہ کریں گے اس طرح توبہ کرکے اگر سو مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے کچھ پرواہ نہیں۔ ہر دفعہ پھر توبہ کرتے رہیں۔ خدا کے مقبول اور اہل طاعت میں سے شمار ہوں گے ؎

[۲] باز آباز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

یعنی ہماری درگاہ کی طرف ضرور واپس آؤ جو کچھ بھی تم ہو واپس آؤ۔ اگر کافر و بت پرست ہو تو بھی واپس آؤ۔ یہ ہماری درگاہ ناامیدی کی درگاہ نہیں ہے۔ سینکڑوں بار اگر توبہ توڑ چکے ہو تو بھی واپس آؤ اور توبہ کرو۔ ہم قبول کریں گے۔

(۱) [۳] حق تعالیٰ کی وسعتِ رحمت ہے کہ ہر حالت میں اجازت دے دی کہ ہم سے باتیں کرلو ہمارا نام لے لو ہر حالت میں سماعت ہوگی۔

(۲) توبہ [۴] کی بدولت حق تعالیٰ کی رحمت و مودت تمہارے ساتھ ہوگی۔ استغفار کے بعد جمعیتِ قلب معاً حاصل ہوگی۔

(۳) اگر [۵] ساری زمین گناہوں سے بھر جاوے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے جیسے بارود ذرا سی ہوتی ہے مگر بڑے بڑے پہاڑوں کو اڑا دیتی ہے۔

(۴) دین اور دنیا کی حاجتوں کے برآنے کا ذریعہ استغفار ہے۔

(۵) حق تعالیٰ کی ناراضی کا علاج ماضی سے استغفار و توبہ اور آئندہ کے لیے اصلاح (عمال ۴)۔

(۶) توبہ [۶] کرنے سے گناہ کی عادت اور اس کا تقاضا بدل جاتا ہے۔

---

[۱] اجمعین صـ ۳۳ ، [۲] دعواتِ عبدیت صـ ۳۲ ج ۱ [۳] شرف المکالمہ صـ ۱۹ ،
[۴] انفاسِ عیسیٰ صـ ۱۹۳ ، [۵] کمالاتِ اشرفیہ صـ ۴۴، ۱۶۸، ۵۴ . [۶] اصلاح کی آسانی صـ ۱۸ .

طریق کار | توبہ بحسب معصیت ہوتی ہے۔ تدارک میں بھی جو عمل کہ قابلِ تدارک ہے اور اعلان کی ضرورت اور عدمِ ضرورت میں بھی۔ چنانچہ ترک نماز سے توبہ کے لیے ضرور ہے کہ نمازیں قضا کریں۔ (اسی طرح روزہ وغیرہ کی قضا کریں)۔ عاصی معلن کے لیے توبہ کا اعلان ضرور ہے اخلاص اور ندامت بھی شرائط میں سے ہیں یعنی اس طریقہ سے توبہ کریں تو خوب کامل ہو پس یہ نفس توبہ کا طریقہ نہیں بلکہ کمالِ توبہ کا طریق ہے۔

(۲) گذشتہ[1] گناہوں پر ندامت و معذرت ظاہر کریں اور جو حقوق العباد واجب الادا ہیں۔ فی الحال ان کے ادا کا عزم کریں اور فی المآل ان کے ادا کا اہتمام کریں۔ یا اہلِ حقوق سے معاف کرائیں۔

(۳) اگر گناہ صادر ہو جائے تو فوراً دو[2] رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں پھر توبہ کریں۔ زبان سے بھی توبہ کریں اور رونے کی شکل بنا کر خدا تعالیٰ سے خوب معافی مانگیں اس طرح توبہ کرنے میں ظاہر میں متعدد مصلحتیں ہیں۔

(ا) إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ نیکیاں گناہوں کو زائل کرتی ہیں۔

(ب) نماز میں توبہ کرنے میں دل حاضر ہوگا اور قبول توبہ کے لیے حضور قلب ضروری ہے۔

(ج) چونکہ نفس کو نماز شاق ہے اس لیے نفس گناہوں سے گھبرائے گا کہ کہاں کی علت سر لگی بلکہ شیطان بھی گناہ کرانا چھوڑ دے گا کیونکہ وہ دیکھے گا کہ میں اس سے (مثلاً) دس گناہ کراؤں گا تو یہ بیس[۲۰] رکعتیں پڑھے گا۔ گناہ تو توبہ سے معاف ہو جاویں گے اور یہ بیس[۲۰] رکعتیں اس کے پاس نفع میں رہیں گی۔

(۴) توبہ کے لیے تو گناہوں کو یاد کرے۔ اس کے بعد جی بھر کے توبہ کر لے مگر اس کو جان جان کر یاد نہ کرے کہ اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے جس کا اثر یہ ہوگا کہ وہاں سے بھی عطا میں کمی ہوگی کیونکہ جزا اور ثمرات کا ترتب عمل پر ہوتا ہے۔ توبہ نصوح کے بعد اگر از خود پرانا گناہ یاد آ جاوے تو پھر تجدید

---

[1] انفاسِ عیسٰی ص ۱۹۴، ۱۹۲،

توبہ کرکے کام میں لگ جاوے۔ اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے۔

(۵) استغفار[1] اور توبہ کے وقت معاصی کے تذکرہ و استحضار میں ایک قسم کا توسط ہونا چاہیئے یہ ضروری نہیں کہ سب گناہوں کی پوری فہرست پڑھنے بیٹھ جائے۔ صرف اجمالی طور پر سب گناہوں سے توبہ کرلے۔ ہر گناہ کا نام لینا ضروری نہیں۔ حدیث میں ہے وما انت اعلم بہ منی (اور اس گناہ سے بھی توبہ کرتا ہوں جس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اور فرمایا۔ و اتوب الیہ من الذنب الذی اعلم ومن الذنب الذی لا اعلم اور اس کی طرف اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں جس کو میں جانتا ہوں اور اس گناہ سے بھی جس کو میں نہیں جانتا) اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ اس میں سب گناہ آگئے اگرچہ یاد نہ آئیں کیونکہ اس سوچ میں وقت ضائع کرنا مطالعہ محبوب سے غافل ہونا ہے۔ البتہ جو خود یاد آجاوے اس سے بالخصوص توبہ کرلیں خواہ[2] مخواہ کرید کرید کر تلاش کرنا یہ خود ایک مشغلہ مانع حضور ہے۔ بس سب گناہوں سے اجمالاً مغفرت مانگ لیں اور توبہ کرکے اپنے کام میں لگیں کیونکہ[3] مقصود بالذات خدا کی یاد ہے نہ گناہوں کی یاد مقصود بالذات ہے نہ طاعت کی یاد۔ گناہوں کی یاد سے توبہ مقصود ہے۔ جب وہ حاصل ہے تو اب قصداً گناہ کو یاد کرکے اس کی یاد کو مقصود بالذات نہ بنائیں۔ اور خود بخود یاد آجاوے تو پھر توبہ و استغفار کرلیں جیسے حدیث شریف میں ہے کہ مصیبت خود بخود یاد آجائے تو اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ لیں کہ اس وقت اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے کا وہی ثواب ہوگا جو عین مصیبت کے وقت پڑھنے کا ثواب تھا۔ شیخ اکبرؒ کا قول ہے کہ ذکر معصیت کو مقصود بالذات نہ بنائیں۔ کیونکہ اس سے یہ خیال ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں اور یہ خیال خطرناک ہے۔

طریقِ تحصیل قرآن[4] مجید و حدیث شریف میں گناہوں پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کو یاد کرنا اور سوچنا۔ اس سے گناہ پر دل میں سوزش پیدا ہوگی۔ یہی توبہ ہے۔

---

[1] سیرۃ الصوفی ص۱۵ ۔ [2] مقالات حکمت نمبر ص۳۲ [3] السبر بالصبر ص۱۰
[4] تعلیم الدین ص۷۴ ۔

دسویں[1] فصل۔ توحید کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ	اللہ[2] ہی نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے عملوں کو پیدا
وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ	کیا اور تم نہیں چاہتے ہو کسی چیز کو مگر یہ کہ اللہ
اللّٰہُ ۔ الآیہ ۔	چاہے ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

وَ اعلم ان الامة لو اجتمعت	جان لو کہ اگر سب متفق ہو جائیں اس پر کہ تم کو
علی ان ینفعوك لم ینفعوك	کچھ نفع پہنچائیں ہرگز نفع نہ پہنچائیں گے مگر
الا بشئ قد کتبه الله لك و	اس چیز کا جو اللہ نے لکھ دی ہے اور اگر سب
لو اجتمعوا علیٰ ان یضروك	متفق ہو جائیں کہ تم کو ضرر پہنچائیں ہرگز ضرر
الا بشئ قد کتبه الله علیك	نہ پہنچائیں گے مگر اس چیز کا جو اللہ نے لکھ
(رواہ احمد و الترمذی)	دی ہے ۔

توحید کی حقیقت یہ یقین کر لینا کہ بدوں ارادۂ خداوندی کے کوئی کچھ نہیں کر سکتا (توحید ہے ۔ مزید تفصیل کے لیے فصل وحدۃ الوجود ملاحظہ ہو ۱۲)۔

طریق تحصیل مخلوق کے عجز اور خالق کی قدرت کو یاد کرنا اور سوچنا اس کا طریق تحصیل ہے۔

---

[1] تعلیم الدین ص۶۷ ، [2] یہاں توحید سے مراد توحید افعالی ہے ۔ ۱۲

گیارھویں فصل۔ توکّل کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ آیہ — اور چاہیئے کہ ایمان والے اللہ ہی پر توکل کریں

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

واذا سالت فاسئل الله واذا استعنت فاستعن بالله۔ — اور جب کچھ مانگو تو اللہ ہی سے مانگو۔ اور جب مدد چاہو تو اللہ ہی سے مدد چاہو۔

رواہ الترمذی واحمد

توکّل کی حقیقت

صرف وکیل یعنی کارساز پر قلب کا اعتماد کرنا (توکل ہے) اس[1] کی حقیقت وہی ہے جو توکیل کی ہے وکیل بنانے کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کام کو خود نہیں سمجھ سکتے اس کو دوسرے کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بتلانے کے موافق کرتا رہے پس توکل بھی یہی ہے کہ خدا کے سپرد کام کر کے تدبیر کریں اور جو وہ بتائیں کرتے جائیں (یعنی شریعت کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ہر کام میں اسباب کے ماتحت کوشش کریں)۔

توکّل[3] کی دو قسمیں ہیں، علماً و عملاً۔ علماً تو یہ کہ ہر امر میں متصرف حقیقی و مدبّر تحقیقی حق جل و علا شانہ کو سمجھے اور اپنے کو ہر امر میں ان کا محتاج اعتقاد کرے۔ یہ توکل تو ہر امر میں عموماً فرض اور جزو عقائد اسلامیہ ہے۔ اسباب کو مثل حکماء طبعیین و منکرین قدر کے مستقل بالتاثیر سمجھنا یہ اعتقاد شرعاً حرام و باطل ہے البتہ تاثیر غیر مستقل کا اعتقاد رکھنا یہ مسلک اہل حق کا ہے جس کا انکار اور نفی کرنا جبر مذموم ہے۔

---

[1] تعلیم الدین ص۲۶ ، [2] وعظ تقوی ص۱۳ ، ص۱۴ [3] التکشف ص۸۶، ۸۷

قسم دوم توکّل عملاً۔ اس کی حقیقت ترکِ اسباب ہے پھر اسباب کی دو قسمیں ہیں۔ اسبابِ دینیہ اور اسبابِ دنیویہ۔ اسبابِ دینیہ، جن کے اختیار کرنے سے کوئی نفع دینی حاصل ہو۔ ان کا ترک کرنا محمود نہیں بلکہ کہیں گناہ اور کہیں خسران و حرمان ہے اگر وہ امرِ دین واجب ہے تو اس کے اسباب اختیار کرنا واجب ہے اور اگر مستحب ہے تو اس کے اسباب اختیار کرنا، مستحب ہے اور یہ (ترکِ اسباب) شرعاً توکل نہیں۔ اگر لغتہً توکّل کہا جاوے تو یہ توکل مذموم ہے اور اسبابِ دنیویہ جن سے دنیا کا نفع حاصل ہو اس نفع کی دو قسمیں ہیں۔ حلال، حرام۔ اگر حرام ہو تو اس کے اسباب کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل فرض ہے اور اگر حلال ہو، اس کی تین قسمیں ہیں یقینی، ظنی، وہمی۔ اسبابِ وہمیہ جن کو اہل حرص و طمع اختیار کرتے ہیں جس کو طولِ امل کہتے ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل واجب ہے اور اسبابِ یقینیہ جن پر وہ نفع عادۃً ضرور مرتب ہو جاوے۔ جیسے کھانے کے بعد آسودگی ہو جانا۔ پانی پینے کے بعد پیاس کم ہو جانا اس کا ترک کرنا جائز نہیں اور نہ شرعاً یہ توکّل ہے اور لغتہً توکّل کہا جاوے تو یہ توکل ناجائز ہے اور اسبابِ ظنیہ جن پر غالباً نفع مرتب ہو جاوے مگر بارہا تخلف بھی ہو جاتا ہو جیسے علاج کے بعد صحت کا ہو جانا، یا نوکری و مزدوری کے بعد رزق ملنا ان اسباب کا ترک کرنا وہ ہے جس کو عرفِ اہل طریقت میں اکثر توکل کہتے ہیں۔ اس کے حکم میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لیے تو جائز نہیں اور قوی النفس کے لیے جائز ہے۔ بالخصوص جو شخص قوی النفس بھی ہو اور خدمتِ دین میں مشغول ہو اس کے لیے مستحب بلکہ کسی قدر اس سے بھی مؤکد ہے پس خلاصہ یہ ہوا کہ توکل علمی تو مطلقاً اور عملی میں بمعنی ترکِ اسباب حرام و ترک اسباب، نفع دنیوی موہوم، فرض۔ و بمعنی ترک اسباب دینیہ و بمعنی ترکِ اسباب دنیویہ مباحہ یقینیہ، حرام و مذموم۔ بمعنی ترکِ اسباب مباحہ دنیویہ، ظنیہ، ضعیف النفس کو حرام اور قوی النفس کو مستحب، پس تین قسمیں فرض اور دو قسمیں حرام۔ اور ایک بعض اوقات میں حرام اور بعض اوقات میں مستحب۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ جو توکل شرعاً ناپسند ہے اس میں اور طاعت میں تنافی ہے ورنہ کوئی منافات نہیں۔ واللہ اعلم۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال سے تو یہاں تک اس اعتدال کا پتہ

---

[1] نہایات الدعاء صفحہ ۱۱

چلتاہے کہ معجزات میں بھی جوکہ بالکل بطور خرق عادت ظہور میں آئے ہیں ان میں بھی تدبیر اور اسباب کی صورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ حضرت جابر رضؓ کی دعوت کا قصہ اس کا شاہد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہانڈی چولہے سے نہ اتارنا، پھر اس میں آپ نے آب دہن ملا دیا اور وہ چند آدمیوں کی خوراک لشکر کے لشکر کو کافی ہوگئی۔ اسی طرح صورتِ اسباب کو حجاب بنایا گیا ورنہ ویسے بھی کھانا بڑھ سکتا تھا۔ یہ توکل اور تدبیر کے آداب ہیں۔ ان کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنا چاہیئے۔

طریق کار

دینی خدمت[1] سے بہتر کوئی کام نہیں۔ البتہ یہ ضروری بات ہے کہ توکل صرف اللہ پر ہو۔ لوگوں کے ہدایا و تحائف کی طرف نفس کا اشراف نہ ہو حدیث میں من غیر اشراف النفس کی قید آتی ہے ورنہ وہ توکل علی اللہ نہیں اور بدوں اشراف کے اگر توکل ہو تو محمود ہے اور جو توکل کے شرائط نہ ہوں تو تدبیر مسنون ہے بالجملہ افراط و تفریط دونوں سے برکنار رہے اور اعتدال اختیار کرے ؎

گر توکل میکنی در کار کن ؛ کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

گفت پیغمبر باواز بلند ؛ بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

(سو[2]) اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا۔ تدبیر کرکے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ تدبیر مباح ہو اور اس میں انہماک نہ ہو۔

طریق تحصیل

اللہ تعالیٰ[3] کی عنایتوں اور وعدوں اور اپنی گذشتہ کامیابیوں کو یاد کرنا اور سوچنا اس کی تحصیل کا طریق ہے۔

---

[1] مہمات الدعا ص۸۰ [2] انفاس عیسیٰ ص۲۲۰ [3] تعلیم الدین ص۷۶

بارھویں فصل خشوع کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

ھُمْ فِیْ صَلٰوتِہِمْ خَاشِعُوْنَ[1] الآیۃ وہ نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

فیصلّی رکعتین مقبلا علیھما پھر دو رکعت نماز اس طرح پڑھے کہ اپنے

بقلبہ و وجھہ (رواہ مسلم) دل اور چہرہ سے اس کی طرف متوجہ رہے

حقیقتِ خشوع کسی نیک عمل میں بطور مقصودیت کوئی غیر اللہ قلب میں حاضر نہ ہونا۔ اور قلب کا التفات بطور تخیل بھی کسی جانب نہ ہونا۔

(خشوع ہے) خشوع[2] لغۃً مطلق سکون ہے اور شرعاً سکونِ جوارح ۔ جس کی حقیقت ظاہر ہے اور سکونِ قلب جس کی حقیقت، حرکتِ فکریہ کا انقطاع ہے اور جس طرح سکون جوارح کی تکلیف بقدرِ قدرت ہے مثلاً صحیح قوی سوی، اس پر قادر ہے کہ نماز میں کوئی حرکت نماز کے علاوہ صادر نہ ہونے دے۔ وہ اس کا مکلف ہوگا اور جو کسی درد میں مبتلا ہے۔ غلبۂ درد کے وقت اس پر قابو نہیں۔ جب درد اٹھے گا بے چین ہوکر پیچ و تاب کھائے گا۔ اس لیے وہ اس درجہ سکون کا مکلف نہ ہوگا۔ البتہ جب درد تھم جاوے وہ از سر نو اس سکون کا مکلف ہوگا۔ اسی طرح سکونِ قلب کی تکلیف بقدرِ قدرت ہوگی مثلاً جو شخص تشویش کے تمام اسباب سے محفوظ ہو، وہ حرکاتِ فکریہ کے کلی انقطاع پر قادر ہے اس لیے وہ اس کا مکلف ہوگا۔ اور جو تشویش کے اسباب میں مبتلا ہو۔ وہ ایسے جمع خاطر پر قادر نہیں۔ اس لیے وہ اس درجہ کا مکلف بھی نہ ہوگا۔ البتہ جتنا وقت تشویش سے سکون کا میسر ہوگا یعنی وہ تشویش متخیلہ پر غالب نہ ہو اس وقت میں اس کا مکلف ہوگا" یہ تو کلام کلی ہے۔ اب اس مقام پر ایک دقیق جزئی ہے جو زیادہ قابلِ اعتناء

---

[1] التکشف ص۴۴۱، ۶۹۰۔ [2] بوادر النوادر ص۸۰۵

ہے اور اس میں زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے اگر صاحبِ معاملہ کو ایسی بصیرت نہ ہو تو کسی مصلح تجربہ کار سے مشورہ کی حاجت ہے وہ یہ کہ اس قطعِ حرکتِ فکریہ کا طریق کیا ہے کیونکہ یہ قطع براہِ راست حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ اپنے قلب کو کسی محمود چیز کی طرف قصداً متوجہ کر دیا جائے جو وضعِ صلوٰۃ کے خلاف نہ ہو مثلاً ذاتِ حق کی طرف برابر متوجہ رہے اگر خیال نہ جمنے کی وجہ سے اس پر قادر نہ ہو تو یہ تصور کرے کہ میں کعبۂ حسنیٰ کی طرف رخ کیے ہوئے ہوں یا نماز میں جو اذکار و قرأت پڑھ رہا ہے ان کی طرف توجہ رکھے کہ میں یہ الفاظ پڑھ رہا ہوں یا ان کے معانی کی طرف توجہ رکھے چونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا اس لیے یہ توجہ دوسرے خطرات کے آنے سے مانع ہو جاوے گا یہ ہے وہ طریق۔

اب اس میں ایک غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر شخص کی استعداد جدا ہے کسی کے لیے ایک تصور نافع ہے تو کسی کے لیے دوسرا تصور بعض اوقات صاحبِ معاملہ بوجہ عدمِ بصیرت و عدمِ تجربہ اپنے لیے ایک طریق کو اختیار کرتا ہے اور وہ طریق اس کی طبیعت کے مناسب نہیں ہوتا اس لیے اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اور بار بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اس غلط گمان میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خشوع فعلِ اختیاری نہیں اس لیے بالکل اس کا اہتمام چھوڑ بیٹھتا ہے اور اس مامور بہ کی برکت سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے اپنے مناسب طریق کی تعیین کے لیے سخت اہتمام کی حاجت ہے۔

دوسری غلطی اس سے اشد یہ ہوتی ہے کہ تعیین کے بعد جس طریق کو اختیار کیا گیا ہے اس میں کاوش زیادہ کرنے لگتا ہے اور اس کا منتظر اور متوقع رہتا ہے کہ دوسرا کوئی خیال اصلاً نہ آنے پائے اور اس کے لیے طبیعت پر زور ڈالتا ہے۔ حتیٰ کہ نوبت کلال و ملال کی پیش آتی ہے جس کا نتیجہ وہی یاس کے بعد ترک کر دینا ہے سو اس لیے ترکِ کاوش کی ضرورت ہے بس سرسری معتدل توجہ کافی ہے اگر اس توجہ کے ساتھ کوئی دوسرا خطرہ آ جاوے وہ غیر اختیاری ہوگا اور مضر نہ ہوگا جیسے کسی خاص صفحہ میں سے کسی خاص نقطہ پر قصداً نظر کی جاوے تو یقینی بات ہے کہ وہ شعاعیں بلا قصد دوسرے کلمات پر بھی پہنچ جاتی ہیں مگر وہ نظر قصدی نہیں ہوتی۔

اور ایک غلطی سب سے بڑھ کر ہوتی ہے کہ دوسرے خیال کے آنے کے ساتھ یہ سوچنے لگتا ہے

کہ یہ خیال قصداً آیا یا بلا قصد، سو یہ فیصلہ محض بیکار ہے۔ اگر فرضاً یہی تحقیق ہو جاوے کہ قصداً آ گیا تو اب گذشتہ کا تو اعدام ہو نہیں سکتا۔ آئندہ کے لیے تدارک ہی کیا جاوے گا۔ سو اگر اس فیصلہ کے بدوں بھی اس تدارک میں مشغول ہو جاوے تو کیا ضرر ہے اور وہ تدارک بفور تنبہ کے تجدید ہے اس توجہ مقصود کی، اور نیت و ارادہ جو کہ مترادف ہیں قبل اختیار ہوتے ہیں جو بدوں اختیار کیے ہوئے ماموربہ کے کافی نہیں۔ جیسے نماز کی نیت کرے مگر فعل صلوٰۃ کو اختیار نہ کرے ناکافی ہے۔

اصل[1] میں جو توجہ خطرات کی قاطع ہے وہ دو[2] قسم کی ہے ایک مع الخوض اگرچہ اشیاء مختلفہ کی طرف ہو۔ دوسری شے واحد کی طرف اگرچہ بلا خوض ہو۔ اب جس شخص کو آیات واذکار کے معانی بلا خوض کے ذہن میں آجاتے ہوں وہاں نہ خوض ہے نہ جس چیز میں فکر سے کام لیا جا رہا ہو وہ شے واحد ہے اس لیے توجہ کی کوئی قسم نہ پائی گئی۔ لیس وہ قاطع خطرات بھی نہ ہوگی۔ بخلاف اس شخص کے جس کو سوچنے سے معنی یاد آتے ہیں۔ اس شخص کی توجہ قاطع خطرات ہوگی پس ایسے شخص کے لیے دوسری توجہ کی ضرورت ہوگی یعنی شے واحد کی طرف خواہ وہ شے واحد کچھ ہو۔ ذات حق ہو یا رویت حق للعبد یا نظر الی الکعبہ یا کچھ اور۔ اور توجہ الی الحق یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کا اجمالاً تصور رکھے، جس طریق سے بھی بے تکلف ذہن میں آجائے۔ زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں یا ان کے کسی فعل کا تصور رکھے مثلاً وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔

✓ توجہ الی الشئ الواحد کا ایک طریق میں نے تجویز کیا ہے جو غایت درجہ سہل بھی ہے اور بے حد نافع بھی ثابت ہوا۔ وہ یہ کہ اپنی تمام طاعات صلوٰۃ و تلاوت و اذکار بلکہ مباح افعال میں بھی اس کا تصور رکھے کہ یہ سب عنقریب حق تعالیٰ کے اجلاس میں پیش ہوں گے تو ان میں کوئی ایسا اختیاری فعل نہ ہو کہ یہ پیشی کے قابل نہ ہو بس اتنا تصور کافی ہے۔ ابتداً تو استحضار ضعیف ہوگا مگر مدارست (یعنی کوشش) کے بعد اس میں دوام ہو جاوے گا۔

حدیث[2] شریف میں ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اور نماز میں آپ کو کچھ خطرہ ہوا (الحدیث اخرجہ الترمذی) اس حدیث سے (خشوع کا) عدم اشتراط صاف

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۲۸۰ [2] التکشف صفحہ ۳۴۰

معلوم ہوگیا (اور ان لوگوں کی غلطی کا ازالہ ہوگیا کہ جو) لوگ کمال صلوٰۃ کے لیے خطرات کے نہ آنے کو شرط سمجھتے ہیں لیکن باختیارِ خود کسی لایعنی بات میں فکر و غور کرنا البتہ منافی کمال صلوٰۃ ہے غرض خطرات کا لانا تو اختیاری ہے اور خطرات کا آنا غیر اختیاری ہے اور امر اختیاری مخل کمال ہوتا ہے اور غیر اختیاری کا نہ تو وجود مخل کمال ہے اور نہ عدم مکمل صلوٰۃ ہے بلکہ عدم خطرہ ایک قسم کا استغراق ہے جو فی نفسہ حالت محمودہ ہے مگر مقصودہ نہیں بلکہ بعض اوقات خطرہ والی نماز بے خطرہ والی نماز سے افضل و اکمل ہوتی ہے کہ خطرات کو دفع اور قلب کو جمع کرنے میں مشقت لاحق ہوتی ہے اور مدار فضل و اجر کا عمل و مشقت ہے۔

غرض کمال توجہ کے منافی وہ وساوس و خیالات ہیں جو اختیاری ہوں۔ اب اگر وہ وساوس اختیاریہ مباحات کے درجے میں ہیں تو ان سے گناہ تو نہ ہوگا۔ البتہ ذکر ناقص ہوگا اور اگر تصوراتِ محرمہ ہیں تو ان سے گناہ بھی ہوگا۔ چنانچہ نص میں وارد ہے وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وساوس پر بھی مؤاخذہ ہوگا لیکن حدیث سے تفسیر معلوم ہوئی کہ مراد وساوسِ اختیاریہ ہیں جو درجۂ عزم میں ہوں اور اس کے بعد لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا نے بالکل صاف کر دیا کہ وسعت سے زیادہ کی تکلیف نہیں۔ اور وساوسِ اضطراریہ وسعت سے خارج ہیں بس وساوسِ غیر اختیاریہ سے بالکل مطمئن رہیں۔ کیونکہ شیطان ضابطہ سے کام کرتا ہے جن سے گناہ بلاواسطہ نہیں کرا سکتا اور یہ اتقیاء ہیں ان کو وہ عبادت کے وقت وساوس میں مبتلا کرتا اور اس طرح سے پریشان کرتا ہے تاکہ وساوس سے گھبرا کر یہ عبادت ترک کر دیں مگر جو محقق ہیں وہ اس سے نہیں گھبراتے وہ تو وساوس آنے کے وقت کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ دشمن کی سب چالیں ختم ہو کر وسوسہ پر رہ گئیں (بلکہ وہ گھبرانے کی بجائے) شیطان سے کہتے ہیں کہ آپ جتنے وسوسے ڈال سکے ڈال دے ہمارا کچھ ضرر نہیں۔ عام لوگ اس کے دفع کی کوشش کرتے ہیں مگر محققین فرماتے ہیں کہ دفع کے قصد سے بھی اسکی طرف توجہ نہ کریں بلکہ جب وسوسہ آئے اس وقت مقصود کی طرف توجہ کی تجدید کریں

لے الرغبۃ المرغوبہ صہ۱۰ ملخصاً

اور وسوسہ کے نہ احضار کا قصد کریں نہ دفع کا کیونکہ دفع بدوں توجہ کیسے ہوگا نہیں۔ تو دفع وسوسہ کا قصد کرنے سے اس کی طرف اور توجہ بڑھے گی گھٹے گی نہیں۔ پھر جب شیطان اس کو وسوسہ کی طرف متوجہ پائیگا تو اور زیادہ وسوسے ڈالے گا۔

ضرورتِ خشوع

اللہ تعالیٰ[1] نے ارشاد فرمایا:۔

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ	کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ ان کے
تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ	دل اللہ کی یاد اور جو دینِ حق نازل ہوا ہے اس
وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا	کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ
كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	ہو جائیں جن کو پہلے کتاب ملی تھی پھر ان پر زمانہ
مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ	کا ز گزر گیا پس ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت
الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ	سے ان میں نافرمان ہو گئے۔
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ	

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آگئیں۔ اس خشوع کے نہ ہونے پر کیسی وعید ہے یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے کہ ایسے نہ بنو جس سے ظاہر ہو کہ ترکِ خشوع کیسی بُری چیز ہے جس کے باعث آدمی کافروں سے مشابہ ہو جاتا ہے اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا کہ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (پس ان کے دل سخت ہو گئے) یہ قساوتِ قلبی ایسی بُری چیز ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ:۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ	یعنی تباہی و ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے
مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ	جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ الآیۃ	وہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

---

[1] تصوف و سلوک صد ۲۳

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

انّ ابعد شئی من اللہ بے شک سب سے زیادہ دور اللہ سے

القلب القاسی ۔ الحدیث قساوت والا دل ہے ۔

پس خشوع حاصل کرنے کی تاکید کرنا جیسا کہ آیت میں ہے اور (اس کی ضد یعنی) قساوت کی برائی کرنا جیسا کہ (قرآن اور) حدیث میں ہے ۔ اس کے ضروری اور واجب ہونے کیلئے (کھلی دلیل ہے) پس ہر اک کے لیے لازم ہے کہ وہ دل میں خشوع پیدا کرے ۔

طریق کار

اگر صفتِ خشوع موجود ہے تب تو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت موجود نہیں تو خود اس کے حاصل کرنے کے لیے (چار اسباب ہیں) ایک سبب تو یہ ہے کہ اس کے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے اور اس کے ظاہری آثار یہ ہیں (کہ) جب چلے گردن جھکا کر چلے ۔ بات چیت میں معاملات میں سختی نہ کرے ۔ غصہ اور غضب میں آپے سے باہر نہ ہو بلکہ سینے کی نکریں نہ رہے ۔ اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا ہو اور آواز پست ہو ۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اہلِ خشوع کی صحبت اختیار کی جائے ۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھایا جائے ۔ اس خوف کو پیدا کرنے کے لیے یہ تدبیر کی جائے کہ کوئی مناسب وقت تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی نافرمانی کی حالت اور پھر خداوند کریم کی نعمتیں سوچے کہ نافرمانی کے سبب کہیں موقوف نہ ہو جائیں ۔ اور عذابِ آخرت اور قیامت کی ہولناک باتوں ، پلصراط میزان دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا جائے تو انشاء اللہ بہت فائدہ ہو کیونکہ اس کو خوف کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خوف سے خشوع پیدا ہوگا ۔

چوتھا سبب خشوع کے پیدا ہونے کا یہ ہے (اور یہ کتابوں وغیرہ سے بھی فراغت کے بعد ضروری ہے) کہ اگر ظاہری علم کے حاصل کرنے میں دس سال ختم کیے ہیں تو باطن کی

ؔ عالموں کو عمل کی ضرورت صفحہ ۱۶ ، ۲۴ ، ۱۷ ، ۲۳ ، ۲۵

درستی ہیں فی سال ایک مہینہ ہی خرچ کر دیجئے، یعنی کم از کم دس مہینے ہی کسی کامل بزرگ کی صحبت میں خرچ کیجئے اور اس کے ارشاد کے مطابق عمل کیجئے۔ خداوند کریم کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے خشوع کی دولت عطا فرماتے ہیں۔

طریقِ خشوع فی الارادہ

خشوع[1] کے لیے عمل کی ابتدا میں توجہ کافی ہے ہر ہر لفظ پر ضروری نہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے یہ خیال کریں کہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے تلاوت کرتا ہوں، یہ کافی ہے ہر ہر حرف پر ایسی توجہ ضروری نہیں۔ کیونکہ یہ تکلیف مالایطاق ہے مگر اس میں یہ قید بھی ہے کہ جب تک اس کی مضاد توجہ محقق نہ ہو اس وقت تک اسی پہلی توجہ کو حکماً باقی سمجھا جائے گا جیسا کہ انسان چلنے سے پہلے یہ ارادہ دل میں کرے کہ جامع مسجد کی طرف چلتا ہوں بس اتنا کافی ہے ہر ہر قدم پر یہ ارادہ ضروری نہیں ورنہ چلنا دشوار ہو جائے گا۔ ہاں اگر کسی دوسری جانب ایسی توجہ، جو اس توجہ کے مضاد ہو، پائی جاوے تو پھر پہلی توجہ معدوم ہو جائے گی۔

طریقِ خشوع فی الاعمال

طبیعت[2] کو مجبور کرنے سے اعمال مثلاً نماز میں خشوع حاصل ہوتا ہے۔ بس انسان اسی کا مکلف ہے اور مجبور کرنا مجاہدہ ہے اور عمل مع المجاہدہ، عنداللہ عمل بلا مجاہدہ سے افضل ہے جس کو مبتدی طلب کرتا ہے۔ اگر غفلت سے ادھر اُدھر کے پریشان خیالات موجود ہوں پھر بہ تکلف نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور یہی مجاہدہ ہے اور خود آسانی مطلوب نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

الذی یتعتع فیه وھو	جو شخص پڑھنے میں رکتا ہے اور وہ اس
علیه شاق له اجران ط	پر دشوار بھی ہے تو اس کو دوہرا ثواب ہوگا۔

(یعنی ایک ثواب تو پڑھنے کا اور دوسرا محنت اور مجاہدہ کا)

تواب[3] خشوع کا طریقہ سمجھیں کہ (پختہ) حافظوں کی طرح نہ پڑھا کریں بلکہ ایسے ناظرہ خواں یا حافظ کی طرح جس کا قرآن کچا ہو تو جس طرح ایسا ناظرہ خواں یا حافظ ہر لفظ کو دیکھ کر یا سوچ کر ادا

---

[1] الکلام الحسن ص۸۴ [2] انفاسِ عیسیٰ ص۲۴۳ [3] ایوار الیتامیٰ ص۲۳

کرتا ہے اور لفظ لفظ پر دھیان کر کے پڑھتا ہے۔ اسی طرح نماز میں ہر ہر لفظ پر مستقل توجہ اور ارادہ کیا کریں اور جو قول[1] و فعل نماز میں سادر ہو وہ توجہ اور قصد سے ہونا چاہیئے۔ محض مشق اور یاد سے نہ ہو مثلاً زبان سے سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ کہا تو اس کی طرف مستقل توجہ ہو کہ میں زبان سے کہہ رہا ہوں پھر وَبِحَمْدِکَ کہا تو اسی طرح اس کی طرف توجہ اور قصد ہو۔ اسی طرح آخر نماز تک۔ پس اس طرح کرنے سے برابر ساعاتِ نماز میں توجہ الی الطاعت رہی۔ اور ایک طرف جب توجہ ہوتی ہے تو دوسری طرف نہیں ہوتی پس لامحالہ اس سے غیر صلوٰۃ کی طرف توجہ نہ ہوگی۔ پس حضورِ کامل میسّر ہوگا اور حضور کے لیے کفِ جوارح بھی ضرور ہے۔ ورنہ چہرہ پھیرنے سے بواسطہ نگاہ خیالات منتشر ہوں گے۔

طریق تحصیل یہ تصور رکھیں کہ میں خداوند کریم کے سامنے ہوں اور خداوند کریم سن رہا اور دیکھ رہے ہیں۔ لقاء[2] رب اور رجوع الی اللہ کا استحضار کریں۔ اس طریقہ سے خشوع جلد حاصل ہو جائیگا۔

تیرھویں فصل خوف کا بیان

اللہ[3] تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

وَاخْشَوْنِیْ ۔ الآیۃ — اور مجھ سے ڈرو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

من خاف ادلج ومن ادلج	جو ڈرتا ہے رات ہی سے چلتا ہے اور
بلغ المنزل الا ان سلعۃ	جو رات سے چلتا ہے وہ منزل پر پہنچ جاتا
اللہ غالیۃ الا ان سلعۃ	ہے سن لو۔ اللہ کا سودا گراں ہے
اللہ الجنۃ ۔ رواہ الترمذی	آگاہ رہو اللہ کا سودا جنت ہے۔

---

[1] انکشافن صا ۴۴ ، [2] الصبر و الصلوٰۃ صد ۳۸ ، [3] تعلیم الدین صد ۷۵

خوف کی حقیقت اور اسکے درجات

قلب کا دردناک ہونا ایسی چیز کے خیال میں جو ناگوارِ طبع ہو اور آئندہ واقع ہونے کا اندیشہ ہو (اس کو خوف کہتے ہیں۔ اور شریعت کے اعتبار سے) خوف[1] کی حقیقت احتمالِ عذاب ہے کہ انسان کو اپنے متعلق احتمال ہو کہ شاید مجھے عذاب ہو اور یہ احتمال مسلمانوں میں ہر شخص کو ہے اور یہی مامور بہ ہے اور اسی کا بندہ مکلف کیا گیا ہے یہ تو شرطِ ایمان ہے اور اس کا نام "خوفِ عقلی" ہے اس میں ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ تقاضائے معصیت کے وقت وعید اور عذابِ خداوندی کو یاد کر کے سوچ سوچ کے گناہوں سے بچا جائے۔ یہ درجہ فرض ہے اس کے فقدان سے کفر تو نہ ہوگا۔ ہاں گناہ ہوگا اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ مراقبات واشغال سے آیاتِ وعید اور عظمت وجلال حق کو ہر دم مستحضر اور پیشِ نظر رکھا جاوے۔ یہ درجہ مستحب ہے اور سب درجات مکتسب ہیں جو کسب سے حاصل ہو جاتے ہیں اور ان کے آگے ایک درجہ اور ہے جو اختیار سے باہر ہے وہ یہ کہ آثارِ خوف اس قدر غالب ہو جائیں کہ اگر ان کو کم کرنا یا بھلانا بھی چاہیں تو اختیار و قدرت سے باہر ہو۔ یہ محض وہبی ہے جو درجاتِ سابقہ مکتسبہ کے حاصل کرنے کے بعد محض عطائے حق سے بعض کو حاصل ہو جاتا ہے (جو اگرچہ محمود تو ہے مگر مقصود نہیں)

(ایک قسم خوف کی وہ ہے جس کے متعلق بعض واعظین[2] کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو غیر خدا کا تو خوف ہے۔ حاکم کا ڈر ہے۔ سانپ بچھو اور شیر کا ڈر ہے مگر خدا کا ایسا خوف نہیں ہے یہ ان کی غلطی ہے۔ کیونکہ ان اشیاء کا خوف طبعی ہے اور خدا تعالیٰ سے خوف طبعی ہونا ضروری نہیں بلکہ عقلی خوف ہونا چاہیئے اور خوفِ عقلی کا حاصل یہ ہے کہ احتمال کے درجہ میں یہ خیال ہو کہ شاید مجھے سزا ہو۔ یہ ایسا خوف ہے کہ اس کے ساتھ رجا بھی ہے کیونکہ اس کو یہ بھی احتمال ہو گا کہ شاید بدوں سزا ہی مغفرت ہو جائے اور ایمان اسی کا نام ہے کہ خوف بھی ہو اور رجا بھی ہو۔

---

[1] اشرف المسائل ص ۷۶، ۷۷ [2] العید والوعید ص ۱۳ تا ۱۵ ملخصاً۔

حق تعالیٰ نے انبیاء کی بابت فرمایا ہے۔ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ کہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور حضرت موسیٰ کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ اژدہا سے ڈر گئے تھے تو وہ خوف طبعی تھا اور نص میں خوفِ عقلی مراد ہے اور خوفِ عقلی انبیاء کرام کو خدا کے سوا کسی سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کہ بدون خدا کے حکم کے کوئی چیز ضرر نہیں دے سکتی۔ وہ ضار و نافع حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں۔ یہاں سے ان سالکین کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو تربیت میں مختلف لوگوں کے غلبۂ خوف و بکار کو دیکھ کر افسوس کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ایسے ایسے حالات نہیں ہوتے۔ رونا نہیں آتا۔ تو وہ سن لیں کہ یہ طبعی گریہ ہے جو بعض کو پیش آتا ہے اور یہ مطلوب نہیں مطلوب عقلی گریہ ہے اور وہ تم کو بھی حاصل ہے کیونکہ نہ رونے پر افسوس ہونا یہ خود گریہ ہے۔

خوفِ مطلوب اور اس کی ضرورت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرماتے ہیں:۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ ۔	اے اللہ ہم آپ سے خوف میں سے اس قدر مانگتے ہیں کہ اس سے آپ ہم میں اور معصیت میں حائل ہو جائیں۔

تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت، معصیت سے بچنے کے لیے مطلوب ہے بالذات مطلوب نہیں ورنہ خَشْيَتَكَ (تیرا خوف) مطلق فرماتے۔ کسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد بیان فرما دی کہ اس قدر چاہیے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں خوف مع الرجاء ہی ہے اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجاء نہ رہے اور نا امیدی تک نوبت پہنچ جائے

لہ وعظ میرٹھ صـ۱۳

تو یہ کفر ہے۔

خوف کا ایک درجہ[1] یہ ہے کہ محض خوف کا غلبہ ہو تو غلبۂ خوف سے تعطل ہو جاتا ہے اور تعطل سے ترقی نہیں ہوتی اور مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے بعضا بچہ امتحان کے وقت غلبہ خوف سے سب پڑھا پڑھایا۔ یاد کیا ہوا بھول جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک درجہ خوف کا یہ ہے جس سے سارے مصالح فوت ہو جائیں محض خوف ہی خوف باقی رہ جائے یہ درجہ مطلوب نہیں اور ایک درجہ خوف کا وہ ہے جس کے ساتھ دوسرے مصالح بھی باقی رہ جائیں مگر وہ سب تابع ہوں اور خوف سب پر غالب رہے۔ یہ مطلوب اور محمود ہے۔

حق تعالیٰ[2] کا خوف جملہ نیک کاموں میں رغبت کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے خوف کرنیوالوں کی شان میں حق تعالیٰ نے ہدایت، رحمت، علم اور رضا کی محمود خصلتیں جمع فرمائی ہیں جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس سے ہر شے ڈرنے لگتی ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "کسی بندہ کو دو خوف نصیب نہ ہوں گے" یعنی جو بندہ دنیا میں خوفِ خدا رکھے گا وہ آخرت میں بے خوف ہوگا اور جو دنیا میں نڈر رہا اس کو آخرت میں امن و اطمینان نصیب نہ ہوگا۔

رسول اللہ[3] صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر آنکھ روتی ہوگی بجز اس آنکھ کے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو دیکھنے سے رو کی گئی اور وہ آنکھ جس نے اللہ کے راستہ میں پہرہ دیا تھا اور وہ آنکھ جس میں خوف الٰہی کی وجہ سے مکھی کے سر کے برابر آنسو نکل آیا (نیز مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے ایک دوسری روایت میں ہے کہ خداوند کریم قیامت کے دن فرشتوں سے فرمائے گا کہ آگ میں سے اس شخص کو نکال دو جو کسی مقام پر مجھ سے ڈرا ہے)۔

(الغرض) خشیت مؤمن کے لیے لازم ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو مآل میں احتمال کہ شاید کوئی اختیاری کوتاہی ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ شاید کوئی اختیاری کوتاہی فی الحال ہو گئی ہو جس کا علم بھی التفات سے ہو سکتا تھا اور التفات میں کوتاہی ہوئی ہو کہ یہ بھی اختیاری ہے۔

1- ودار النعلات ص۱۸۱ 2- تبلیغ دین ص۹۲ 3- کمالات اشرفیہ ص۲۶۰۳

ڈاکو سزا[1] کے خوف سے ڈاکہ نہیں ڈالتا۔ بچہ پٹنے کے خوف سے شرارت سے رُکتا ہے جرمانہ کے خوف سے لوگ جرائم سے باز رہتے ہیں۔ آدمی سُبکی کے خوف سے محفل میں تہذیب سے بیٹھتا ہے خوف ہی تو اُٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن نہیں رہتا (گویا کہ) خوف جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہے اور خوف ہی جملہ طاعات کا ذریعہ ہے۔

طریقِ کار اس کا طریق مراقبہ ہے کہ پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] منٹ دیر میں سویا کریں اور بیٹھ کر یا لیٹ کر یاد کیا کریں کہ آج کیا کیا گناہ کئے۔ فہرست گناہ تیار کریں پھر دل میں خیال جمائیں کہ گویا میدانِ قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے۔ اپنا مددگار کوئی بھی نہیں دشمن بہتیرے ہیں حیلہ کوئی نہیں چل سکتا۔ زمین تانبے کی طرح کھول رہی ہے آفتاب سر پر ہے دوزخ سامنے ہے اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ جب یہ حالات پیشِ نظر ہوں گے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کریں گے کہ بیشک خطاوار ہیں۔ کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں۔ رات کو یہ کریں اور صبح اٹھ کر یاد رکھیں کہ فلاں فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا ہے۔ سو آج وہ گناہ نہ ہونے پائیں۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ یک لخت نہ چھوٹ جائیں گے تو کمی تو ہو ہی جائے گی۔ غرض یہ تدبیر ایسی ہے کہ چند ہی روز کرنے سے آدمی معاصی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

طریقِ تحصیل اللہ تعالیٰ[2] کے قہر و عتاب کو یاد کرنا اور سوچنا طریقِ تحصیل ہے۔

چودھویں فصل۔ دعا کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي[3]	اور تمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو
أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ	پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا جو

---

[1] وعظ مبرھۃ ص۲۲ [2] تعلیم الدین ص۷۵ [3] مہمات الدعا ص۱۳ تا ۱۸ ملخصا۔

يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں
سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں
دَاخِرِيْنَ۔ الآیہ گے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الدعاء مخ العبادة۔ الحدیث دعا عبادت کا مغز ہے۔

دعا کی حقیقت

(اس کی حقیقت نیازمندی ہے یعنی اپنی حاجت اور احتیاج کو پیش کرنا کہ اے اللہ! ہمیں یہ دیدے) آیت و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا عین عبادت ہے۔ خواہ کسی قسم کی ہو۔ دینی ہو، یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لیے نہ ہو۔ خواہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی۔ حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالیٰ سے مانگا کرو اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لیے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں مگر دعا ایک ایسی عبادت ہے کہ یہ اگر دنیا کے لیے ہی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے۔ مثلاً مال مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے۔ جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا حدیث شریف میں ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں (اور یہی آیت بالا سے بھی مفہوم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو برابر مانگتا رہے اس سے خوش ہوتے ہیں)۔

ہر تدبیر[1] میں انسان اپنے جیسے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قالاً یا حالاً۔ اور دعا میں ایسے سے مانگتا ہے جو سب سے زیادہ کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور عقل بھی یہی کہے گی کہ جو سب سے زیادہ قادر تر ہے اسی سے مانگنا اکمل و انفع ہے۔ پس یقیناً یہ تدبیر (دعا) ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اور تدبیر بھی حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ تو جو شخص حق تعالیٰ سے

---

[1] انفاس عیسیٰ ص ۷۹

مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

دعا[1] صرف امورِ غیر اختیاریہ کے ساتھ خاص نہیں۔ جیسا کہ عام خیال ہے کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے۔ بلکہ امورِ اختیاریہ میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے۔ اصل کام تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ اسباب و علامات محض عباد کی تسلی و دیگر حکمتوں کے لیے مقرر فرمائے ہیں ؎

این سببہا در نظر پردہاست ٭ درحقیقت فاعلِ ہر شے خداست

ضرورتِ دعا

کوئی[2] شخص ایسا نہ ہوگا جس کو صلاح و فلاح کی ضرورت نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دارین کی صلاح و فلاح کے واسطے اسباب و ابواب موضوع فرمائے کہ اہلِ حاجت ان سے مدد لیں۔ اور عقبات و مہالک سے نجات پائیں۔ ان اسباب میں سے بجز دعا کے جتنے اسباب ہیں ان کے مسببات خاص خاص امور میں۔ چنانچہ اسبابِ طبعیہ کا (مثل زراعت و تجارت و طبابت کے) اصلی مقصود فلاحِ دنیوی بنایا گیا ہے گو بواسطہ معینِ دین بھی ہو اور اسبابِ شرعیہ کا (مثل صوم و صلوٰۃ و حج کے) مقصود بالذات فلاحِ دینی ٹھہرایا گیا ہے گو بالعرض نافعِ دنیا بھی ہو۔ مگر صرف دعا ایک ایسی چیز ہے کہ فلاحِ دین و فلاحِ دنیا دونوں کے لیے بالمساوات ایک مرتبہ میں مشروع و موضوع ہے۔ جس سے اس جامعیت کے اس کی وقعت و عظمت ظاہر ہے اس لیے قرآن مجید و حدیث میں نہایت درجہ اس کی ترغیب و فضیلت و تاکید جابجا وارد ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص کو دعا کی توفیق ہوگئی اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھل گئے۔ ایک روایت میں ہے۔ جنت کے دروازے کھل گئے۔

اور ارشاد فرمایا کہ قضا کو صرف دعا ہٹا دیتی ہے۔ احتیاط و تدبیر سے نہیں ٹلتی۔ اور

---

[1] برکات الدعا، صفحہ ۲۲،۲۰۔ [2] دیباچہ مناجات مقبول طبع دیوبند

دعا نازل شدہ بلا سے بھی نافع ہے اور اس بلا سے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور کبھی بلا نازل ہوتی ہے اور ادھر سے دعا پہنچ کر اس سے ملتی ہے اور دونوں میں قیامت تک کشتی ہوتی رہتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ قبل مصیبت بھی دعا کرتا رہے۔ اس کی برکت سے مصیبت نہیں آتی اور کبھی اسکی وجہ سے مصیبت ٹل جاتی ہے۔

اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز قدر و منزلت کی نہیں اور جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں کے وقت اس کی دعا قبول فرما لیا کریں اسکو چاہیئے کہ خوشی اور عیش کے وقت کثرت سے دعا مانگا کرے۔

اور ارشاد فرمایا کہ دعا مسلمان کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمان کا نور ہے۔

دعا[1] میں خاصیت ہے کہ اس سے تدبیر ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے۔

دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف ہوائی ہوتا ہے۔

دعا میں ایک نفع یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں معذور سمجھا جائیگا۔ کیونکہ جب اس سے سوال ہوگا کہ تم نے حق کا اتباع کیوں نہیں کیا تو یہ کہہ دیگا کہ میں نے طلبِ حق کیلئے بہت سعی کی اور اللہ تعالیٰ تو ایک ہی تھے۔ میں نے ان سے بھی عرض کر دیا تھا کہ مجھ پر حق واضح ہو جاوے۔

بعض[2] دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا و زاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔

---

[1] انفاس عیسیٰ صنہ۸۱ [2] مہمات الدعاء ص۲۵ دوم

قبولیتِ دعا اور اس کا طریقِ کار

احادیث[1] شریف میں دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ سب سے بڑی چیز ہے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر تدبیر ہے۔ بلکہ حقیقت میں اس کا درجہ تدبیر سے بڑھ کر ہے اس کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست ہے جس کے قبضہ میں تقدیر ہے۔ سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے۔ بجز اس کے کہ دو تین دعائیں یاد کرلی ہیں۔ نماز کے بعد آموختہ کے طور پر ان کو پڑھ کے منہ پہ ہاتھ پھیر لیتے ہیں (نہ خشوع ہے نہ خضوع ہے) یہ تو عملی غلطی ہے اور دوسری علمی غلطی یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شیطان یہ دھوکا دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو سب تدبیروں سے کمتر ہے۔ دیکھو (اتنا عرصہ دعا کرتے ہوگیا قبول ہی نہ ہوئی) مگر[2] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی ایسا مسلمان نہیں جو دعا میں اٹھائے اور پھر عطا نہ ہو۔ خواہ سردست اس کو دیدیں یا آئندہ کے لیے جمع کردیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا قبول ضرور ہوتی ہے مگر صورتیں اس کی مختلف ہیں۔ کبھی[3] تو وہی مل جاتا ہے جو مانگا تھا اور کبھی اس سے افضل چیز عطا ہوتی ہے اور کبھی دنیا میں کچھ عطا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر آخرت میں جمع کرکے اس کو دیا جائے گا۔ اس وقت ثواب کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ کاش! ہماری سب دعائیں آخرت ہی میں ذخیرہ رہتیں۔ دنیا میں ایک بھی نہ ملتی پس یقین کرلینا چاہیئے کہ ہماری سب دعائیں بالمعنی الاعم قبول ہی ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمتِ موہوبہ (جس کی تم درخواست کررہے ہو) تمہارے لئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔ جیسے[4] اگر کوئی طبیب سے درخواست کرے کہ میرا علاج مسہل سے کردیجیے تو اصل منظوری تو علاج کا شروع کردینا ہے گو مسہل نہ دے اور دوسری منظوری مسہل دینا ہے اس میں یہ شرط

---

[1] الاصابہ ص۵، [2] دیباچہ مناجاتِ مقبول مطبوعہ دیوبند۔ [3] انفاس عیسیٰ ص۸۲،
[4] الاصابہ ص۷ تا ۱۱ ملخصاً۔

ہے کہ مصلحت بھی سمجھے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اور اس پر توجہ کرتے ہیں بے توجہی نہیں کی جاتی تو جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہوا تو ضرور پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا۔ سو یہ تو عین کامیابی ہے پس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست کا لے لینا اور اس پر توجہ کرنا ہے۔ یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جاوے۔ اس کا وعدہ نہیں (اگرچہ ممکن ہے)۔

احادیثِ معتبرہ میں دعا کے لیے مفصلہ ذیل آداب کی تعلیم فرمائی گئی ہے جن کو ملحوظ رکھ کر دعا کرنا بلاشبہ کلیدِ کامیابی ہے اور جن کی رعایت کے بعد دعا مقبول نہ ہونا عادۃ اللہ کے خلاف ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت ان تمام یا بعض آداب کو جمع نہ کر سکے تو یہ نہیں چاہیئے کہ دعا ہی چھوڑ دے بلکہ دعا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے اور ہر حال میں حق تعالیٰ سے قبول کی امید ہے۔

(۱) وضو کرنا۔ (۲) قبلہ رخ ہونا۔ (۳) دو زانو بیٹھنا۔ (۴) دعا کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا۔ (۵) اخلاص اور ادب و تواضع کے ساتھ دعا کرنا۔ (۶) دعا کے اوّل و آخر حمد و ثنا اور درود شریف پڑھنا۔ (۷) حرام مال سے بچنا۔ (۸) اپنی محتاجی اور عاجزی کو ذکر کرنا۔ (۹) دعا کے وقت انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مقبول بندوں کے ساتھ توسّل کرنا یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما۔ (۱۰) ان دعاؤں کے ساتھ دعا کرنا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ (۱۱) رغبت و شوق اور عزم کے ساتھ دعا کرنا۔ یعنی یوں نہ کہے کہ یا اللہ اگر تو چاہے تو میرا کام پورا کر دے بلکہ قبولِ دعا کی امید قوی رکھے۔ (۱۲) کسی ناجائز چیز، گناہ اور محال چیز کی دعا نہ کرے۔ (۱۳) اپنی سب حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اور مخلوق پر بھروسہ نہ کرے۔ (۱۴) دعا کے آخر میں آمین کہہ کر دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرے۔ (۱۵) مقبولیتِ دعا میں

لہ از کام الدعا منسلکہ مناجات مقبول مطبوعہ دیوبند۔

جلدی نہ کرے۔ یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی اب تک قبول نہیں ہوئی۔

اعتدال اصل طریقۂ نبویہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت فرمائی ہے کہ نہ دعا کے بھروسہ اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا منہمک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے۔

معمولی چیز بھی خدا ہی سے مانگیں اور یہ نہ سمجھیں کہ چھوٹی چیز مانگنے سے حق تعالیٰ ناخوش ہوں گے کیونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہر بڑی چیز چھوٹی ہی ہے۔ ان کے نزدیک عرش اور نمک کی ڈلی برابر ہے۔

دعا میں اگر دل نہ لگتا ہو تو اس طرح سمجھا دیں کہ دنیا میں نفع موہوم پر بھی ہمت سے کام لیتے ہیں۔ گو آخر میں خسارہ ہی ہو جاوے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے اور دعا میں خسارہ کا احتمال ہی نہیں۔ پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے۔

طریقِ تحصیل

اپنی احتیاجوں اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کو سوچنا اور اس پر غور کرنا طریقِ تحصیل ہے۔

پندرھویں فصل ۱۵ - رجا کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ الآیۃ — اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لو یعلم الکافر ما عند اللہ من الرحمۃ ما قنط من — اگر کافر بھی اللہ کی رحمت کا حال جانے تو اس کی جنت سے ناامید نہ ہو۔

---

[1] تعلیم الدین ص۶۵

جنتہٖ احدٌ ۔ متفق علیہ۔

رجا کی حقیقت

محبوب چیزوں یعنی فضل و مغفرت اور نعمت و جنت کے انتظار میں قلب کو راحت پیدا ہونا اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کی تدبیر اور کوشش کرنا (رجا ہے) سو جو شخص رحمت و جنت کا منتظر رہے اور اس کے حاصل کرنے کے اسباب یعنی عملِ صالح و توبہ وغیرہ کو اختیار نہ کرے اس کو مقام رجا حاصل نہیں۔ وہ دھوکے میں ہے جیسے کوئی شخص تخم پاشی نہ کرے اور غلہ پیدا ہونے کا منتظر رہے، صرف ہوسِ خام ہے۔[1]

رجا کے درجات

(جیسے خوف کی حقیقت اور درجات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں) رجا کے بھی درجات ہیں۔ ایک شرطِ ایمان بمعنی احتمالِ نجات۔ اور ایک درجہ فرض ہے اور ایک درجہ مستحب ہے۔ ایک درجہ رجا میں بھی ایسا ہے جو اختیار سے خارج ہے مکتسب نہیں۔ بلکہ محض وہب سے عطا ہوتا ہے (جو مطلوب نہیں تفصیل کے لیے خوف کی حقیقت ملاحظہ ہو)۔[2]

طریق تحصیل

اللہ تعالیٰ کی وسعتِ رحمت اور عنایت کو یاد کرتے رہنا۔ اور سوچتے رہنا (طریقِ تحصیل ہے)۔[3]

سولھویں فصل۔ رضا کا بیان[4]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ۔ الآیہ[3]

اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لہ اشرف السائل ص۷، ۲ہ تعلیم الدین ص۵، ۳ہ تعلیم الدین ص۷۔ ۴ہ انفاس عیسیٰ ص۲۳۳

من سعادۃ ابن ادم رضاہ بما قضی اللہ لہ ۔ رواہ الترمذی واحمد
آدمی کی سعادت سے ہے راضی رہنا اس پر جو اس کیلئے اللہ نے مقرر کر دیا ہو ۔

رضا کی حقیقت

رضا کی حقیقت ، ترك الاعتراض علی القضاء (یعنی) قضا پر اعتراض نہ کرنا ہے ۔ نہ زبان سے نہ دل سے بعض اوقات اس کا یہاں تک غلبہ ہوتا ہے کہ تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی ہے پس اگر الم کا احساس ہی نہ ہو تو رضا طبعی ہے ۔ اور اگر الم کا احساس باقی رہے تو رضا عقلی ہے اوّل سال ہے جس کا عبد مکلف نہیں اور ثانی مقام ہے جس کا عبد مکلف ہے ۔

قضا پر راضی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہو مگر چونکہ عقل نے اس کے بہتر انجام یعنی ملنے والے ثواب پر مطلع کر دیا ہے اس لیے طبیعت اس تکلیف کو بلا کلفت گوارا کرتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لیے تلخ دوا بتائے ۔ یا (اپریشن کرانے یا) فصد کھلوانے کی ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا (اپریشن کرانا) اور فصد کھلوانا تکلیف کی باتیں ہیں مگر چونکہ اس کے ساتھ ہی عمدہ نتیجہ یعنی صحت و تندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے لہٰذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی بلکہ اس کا احسان مند و ممنون رہتا ہے اسی طرح جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کیے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجر مرحمت ہوگا اور ہر مصیبت و صدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہوگا جس کے مقابلہ میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں ہے تو وہ ضرور مسرور اور شاداں ہوگا ۔

جس وقت مولائے حقیقی سے جو عطا ہوتا ہے اس وقت کے وہی مناسب ہوتا ہے ۔ اس کے خلاف کی تمنا نہ چاہیئے ۔ جب اللہ تعالیٰ (بظاہر) ہمارے نقصانات ہی کو بہتر سمجھ رہے ہیں تو ہم کو اس میں صدمہ کی کونسی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ

لہ تبلیغ دین صفہ ۱۲۰ ۔ ۲ہ کمالات اشرفیہ صفہ ۱۴۳ ، ۱۲۰

نے جیسا بنادیا ہے اس کیلئے وہی مناسب تھا۔ گو ہر شخص دوسرے کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ میں ایسا ہوتا اور اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی لیکن غور کر کے دیکھے اور سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ میرے لیے مناسب وہی حالت ہے جس میں خدا نے مجھ کو رکھا ہے (البتہ[1] دعا کرنا خلافِ رضا نہیں۔ اہل اللہ محض حکم کی وجہ سے اظہارِ عبدیت کے لیے دعا کرتے ہیں اس واسطے دعا نہیں کرتے کہ جو ہم نے مانگا ہے وہی مل جاوے بلکہ ہر حال میں خدا کی رضا پر راضی رہتے ہیں خواہ قبول ہو یا نہ ہو (قبول نہ ہونے سے شاکی اور تنگدل نہیں ہوتے۔ یہی رضا کی علامت ہے دعا کی حقیقت دعا کے بیان میں ملاحظہ ہو اور اگر اس موقع پر صبر کا بیان بھی دیکھ لیا جاوے تو مفید ہوگا۔)

طریقِ تحصیل یہ آثارِ محبت[2] میں سے ہے۔ اس کی تحصیل کا جداگانہ طریق نہیں (سو حصولِ محبت کے ساتھ ہی رضا بھی حاصل ہو جاتی ہے)۔

سترھویں[3] فصل۔ زہد کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا	تاکہ فوت شدہ چیز پر افسوس نہ کرو۔
فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا	اور جو تم کو دیا ہے اس پر خوشی سے اترا
آتَاكُمْ ۔ الآیۃ	نہ جاؤ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اول صلاح ھذہ الامۃ الیقین	اول بہتری اس امت کی یقین اور زہد
والزھد و اول فسادھا	ہے اور اول بگاڑ اس امت کا بخل اور
البخل والامل (رواہ البیھقی)	طولِ امل ہے۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص۲۳۲، [2] تعلیم الدین ص۸۶، [3] تعلیم الدین ص۸۵،

فی شعب الایمان)

زہد کی حقیقت

کسی رغبت کی چیز کو چھوڑ کر اس سے بہتر چیز کیطرف مائل ہونا مثلاً دنیا کی رغبت علیحدہ کر کے آخرت کی رغبت کرنا زہد ہے۔

حضرتؔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زہد فی الدنیا یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو حرام کر لیا جاوے اور نہ یہ ہے کہ مال کو اڑا دیا جائے۔ لیکن زہد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قبضہ میں جو چیز ہے اس پر اپنا اعتماد اور وثوق بہ نسبت اس چیز کے زیادہ ہو جو کہ تمہارے قبضہ میں ہے اور نیز زہد یہ ہے کہ تم پر جب کوئی مصیبت آوے تو تم کو اس کے ثواب کی زیادہ رغبت ہو۔ بہ نسبت اس کے کہ مصیبت باقی رہے (ترمذی شریف)۔

اس حدیث میں زہد کی حقیقت کی شرح ہے جو کہ اخلاق میں سے ہونے کے سبب علامات میں سے بھی ہے اور اس میں بڑی غلطی رفع کر دی ہے۔ اکثر عوام اپنے اعتقاد میں زاہد اسی کو سمجھتے ہیں جو تمام لذاتِ مباحہ سے اس طرح مجتنب ہو جیسے ان کو حرام سمجھتا ہو اور اس کے پاس جو کچھ آتا ہو سب کو فوراً خرچ کر ڈالے گو غیر مصرف ہی میں سہی۔ اور جو بلا و مصیبت کے زوال کی تدبیر نہ کرتا ہو بس ان کے نزدیک بزرگی کی شرط یہی ہے اس حدیث میں بتلا دیا گیا ہے کہ یہ امور شرط نہیں بلکہ اپنے مقبوضات سے زیادہ حق تعالےٰ پر اعتقاد ہونا۔ اور مصیبت گو خود مرغوب فیہ نہ ہو مگر ثواب مرغوب فیہ ہونا یہ ضروری ہے پس مصیبت پر خوشی اس لیے ہے کہ وہ ثواب کا سبب ہے اور آیت سے استدلال ظاہر ہے۔

زہدؔ کی اصل وہ نور اور علم ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا ساز و سامان

لے التکشف ص۳۲۶ ۲ے تبلیغ دین ص۹۵

مکھی کے پر سے بھی زیادہ حقیر اور آخرت ہی بہتر و پائدار ہے جس وقت یہ نور حاصل ہو جاتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلہ میں اتنی بھی وقعت نہیں رہتی جتنی کسی بیش قیمت جواہر کے مقابلہ میں پھٹے پرانے چیتھڑا کی ہوا کرتی ہے اور زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدر ضرورت وکفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے پس زاہد اتنی مقدار پر کفایت کیا کرتا ہے جتنا کسی مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

زہد کے کئی درجے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نفس اگرچہ دنیا کی طرف مائل ہو مگر جبراً بے التفات بنایا جائے اور دنیا حاصل کرنے سے زبردستی روکا جائے۔ اس حالت کو زہد کہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ نفس دنیا سے اتنا متنفر ہو کہ اس کی طرف مائل ہی نہ ہو اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ دنیا کے مال ومتاع کا عدم اور وجود برابر ہو جائے پس اگر مل جائے تو کچھ مسرت نہیں اور اگر نہ ملے یا آیا ہوا ہاتھ سے چلا جائے تو کچھ حسرت نہیں اس درجہ میں نفس نہ تو دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے متنفر ہوتا ہے اور یہی زہد کے کمال کا درجہ ہے۔

(حاصل کلام یہ ہے کہ) زہد[1] ترکِ لذات کا نام نہیں بلکہ محض تقلیل لذات، زہد کے لیے کافی ہے یعنی لذات میں انہماک نہ ہو نفیس نفیس کھانوں، کپڑوں کی فکر میں رہنا یہ زہد کے منافی ہے ورنہ بلا تکلف وبلا اہتمام خاص کچھ لذات میسر ہو جائیں تو حق تعالیٰ کی نعمت سے شکر کرنا چاہیئے نفس کو خوب آرام میں رکھے لیکن اس سے کام بھی لے ؎

کہ مزدور خوشدل کند کار بیش

(حقیقت یہ ہے کہ) جس کی نظر اللہ اور ما عند اللہ پر ہے اس کی نظر میں سونا اور چاندی تو کیا دنیا ومافیہا بھی کچھ نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لیے دنیا کو پسند نہیں کیا (لہٰذا) مخلوق[2] کے ہاتھ میں جو کچھ ہے۔ متاع دنیا ہے۔ سب سے امید قطع کر دی جائے جو شخص ایسا کرے گا اس کا قلب راحت میں رہیگا

---

[1] کمالات اشرفیہ ص۳۰۵، ۳۱۱ ، [2] انفاس عیسیٰ ص۱۷۸ ، [3] حُبِ دنیا کا بیان ملاحظہ ہو۔

کیونکہ زہد، قلب اور بدن دونوں کو راحت دیتا ہے۔

طریقِ تحصیل دنیا کے[1] عیوب اور مضرتوں اور فنا ہونے کو اور آخرت کے منافع اور بقا کو یاد کرنا اور سوچنا (طریق تحصیل ہے)

اٹھارہویں[18] فصل شکر کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَاشْكُرُوا لِي[2] ۔ الآیۃ اور میرا شکر کرو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ان اصابته سراء شکر اگر اس کو خوشی پہنچی ۔ شکر کیا۔

(رواہ مسلم)

شکر کی حقیقت نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنا اور اس سمجھنے سے دو باتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسری اس کی خدمت گذاری اور امتثالِ اوامر میں سرگرمی کرنا (یعنی) جو حالت[3] طبیعت کے موافق ہو خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری ہو۔ اس حالت کو دل سے خداوند کریم کی نعمت سمجھنا اور اس پر خوش ہونا اور اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا اور زبان سے خداوند کریم کی تعریف کرنا اور اس نعمت کا (جوارح یعنی اعضاء وغیرہ سے) گناہوں میں استعمال نہ کرنا (بلکہ اس نعمت[4] کو اس کی رضامندی میں استعمال کرنا شکر ہے) اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ مخلوق کی پیدائش کے اغراض و مقاصد اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ کیا کیا چیز کس کس کام کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً

---

[1] تعلیم الدین ص۵۰ ، [2] تعلیم الدین ص۴۰ ، [3] انفاسِ عیسیٰ ص۲۱۸ ، [4] تبلیغ دین ص۱۰۴

آنکھ اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس کا شکریہ یہ ہے کہ اس کو اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید اور علم دین کی کتابوں کے دیکھنے اور آسمان و زمین جیسی بڑی مخلوق کے اس غرض سے مشاہدہ کرنے میں صرف کرے کہ عبرت حاصل ہو اور خالق برتر کی عظمت و کبریائی سے آگاہی ہو۔ نیز ستر کے دیکھنے اور عورت پر نظر ڈالنے (اور دیگر ممنوعات) سے روکے رکھے۔ اسی طرح **کان** ایک نعمت ہے اور اس کا شکریہ یہ ہے کہ اس کو ذکر الہی اور ان باتوں کے سننے میں استعمال کرے جو آخرت میں نفع دیں اور بیہودہ لغو اور فضول کلام سننے سے روکے۔ **زبان** کو یاد خدا حمد و ثنا اور اظہار شکر میں مشغول رکھے اور تنگدستی یا تکلیف میں شکوہ و شکایت سے باز رکھے کہ اگر کوئی حال بھی پوچھے تو شکایت کا کلمہ نہ نکلنے پائے کیونکہ شاہنشاہ کی شکایت ایسے ذلیل و بے بس غلام کے سامنے زبان سے نکلنی جو کچھ نہیں کر سکتا بالکل فضول اور معصیت میں داخل ہے اور اگر شکر کا کلمہ نکل گیا تو طاعت میں شمار ہوگا۔

یہ (زبانی) الحمد للہ کہنا محض درجۂ عنوان میں ہے یہ چھلکا ہے جس میں گری نہیں یعنی الفاظ شکر ہیں معنی شکر نہیں اور جب معنی شکر نہیں تو شکر نہیں۔ جیسے کوئی بادام خریدے اور اس میں مغز نہ نکلے اور نرا چھلکا ہو تو بادام نہ کہے گا۔ اسی طرح ہر عمل کا ایک مغز اور روح ہے اور ایک پوست اور صورت ہے پس شکر کی روح یہ ہے کہ منعم اور نعمت کی دل سے قدر ہو۔ ابتدائی درجہ تو مرتبۂ عقلی ہے کہ حق تعالیٰ کو منعم حقیقی جانے اور نعمتوں کی قدر پہچانے اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ اس کا اثر طبع اور جوارح اور حرکات و سکنات میں نمایاں ہو (یعنی تمام اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق اور معاشرات وغیرہ شریعت کے مطابق ہوں)

شکر کا محل نعمت ہے اور نعمت کی حقیقت یہ ہے اَلنِّعْمَۃُ حَالَۃٌ مُلَائِمَۃٌ لِلنَّفْسِ (نعمت وہ حالت ہے جو کہ نفس کے لیے خوشگوار ہو) حالات جو اس کی مرضی کے موافق ہیں موقع شکر ہیں۔ یہ کہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف سے جانے اتراوے نہیں۔

لہ : الشکر ص ۱۲۰،۱۱،۴

اپنا کمال نہ سمجھے۔ غافل اور ناسی (بھولنے والا) نہ ہو اور نعمت میں مشغول ہو کر رب نعمت کو نہ بھولے۔ بلکہ یہ نعمت اس کے لیے زیادہ موجب تذکر ہو جاوے۔ یہ نعمت عام ہے خواہ کھانا ہو یا پانی ہو یا کوئی کپڑا ہو یا یہ کہ کوئی ناگوار حالت نہ ہو۔

حالات کی دو قسمیں ہیں گوارا و ناگوار۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اختیاری وغیر اختیاری۔ یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں۔ اور مومن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے۔ اس لیے مومن کسی حالت میں نقصان میں نہیں بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے اس لیے حدیث شریف میں ہے:

ان اصابته سرآء شکر و — اگر اس کو راحت پہنچتی ہے شکر کرتا ہے اور

ان اصابته ضرآء صبر — اگر تکلیف پہنچتی ہے صبر کرتا ہے پس اس

فکان خیرًا له — کے لیے بہتر ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امورِ غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیاراً اس وقت مومن سے صادر ہوتے ہیں۔ یعنی راحت میں شکر کرنا اور وہ ایک عمل ہے جو اس نے حق تعالےٰ کے حضور میں پیش کیا ہے اس کے عوض اجر ملتا ہے اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے جس پر اجر ملتا ہے اور پس دونوں صورتوں میں نعم البدل اسی عمل پر ملا جو اختیاری ہے پس جس طرح اعیان کے اعطاء و اخذ کے عوض میں انسان کے اوپر کچھ حقوق ہیں یعنی شکر و صبر مثلاً حق تعالیٰ بندہ کو نعمتِ مال عطا فرمائیں یا نعمتِ اولاد دیا کوئی دوسری نعمت) تو اس کے عوض میں اس کے اوپر شکر واجب ہے یا اس سے مال و اولاد کو لے لیں تو اس پر صبر واجب ہے اسی طرح اعراض و اعمال پر بھی یہ حقوق ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ کی توفیق عطا فرمائیں یا ذکر میں انوار و علوم عطا فرمائیں تو اس پر شکر لازم ہے اور اگر ذکر میں انوار و

ؔ الجبر بالصبر صلا

کیفیات سلب ہوجائیں تو اس پر صبر لازم ہے اور یہاں خود اعمال پر بھی اجر ملتا ہے اور ان کا شکر ادا کرنے پر بھی اجر ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔[1]

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ اور وہ وقت یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے تم کو اطلاع فرمادی کہ اگر (میری نعمتوں کا) تم شکر کروگے تو تم کو خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کی) ناشکری کروگے تو یہ سمجھ رکھو کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے (یعنی) ناشکری میں اس کا احتمال ہے (کہ اللہ تعالیٰ عذاب میں مبتلا فرمادیں) لہذا لازم ہے کہ ہم ہر حال میں شکر گزار رہیں نیز اس لیے بھی کہ) شکر[2] سے محبت پیدا ہوگی اور محبت سے قرب حق کا تقاضا ہوگا (جو کہ مقصود اصلی ہے)۔

طریق تحصیل حق[3] تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچنا اور یاد کرنا اور ہر نعمت کو اس کی طرف سے جاننا (اس سے) رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی محبت ہوگی اور شکر کا درجۂ کاملہ نصیب ہو جائے گا۔

انیسویں فصل شوق کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ[4] كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ۔ الآیہ — جو اللہ کی ملاقات کا امیدوار ہے تو اللہ کی مدت (یعنی موت) تو آنے والی ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اسئلك النظر الى وجهك — تجھ سے تیرے وجہ مبارک کی زیارت اور

---

[1] بیان القرآن پ۱۳ [2] اکمال العدۃ ص۲۲ [3] تعلیم الدین ص۴۲، [4] تعلیم الدین ص۷۷۔

و الشوق الی لقائک ۔ رواہ النسائی — تیری ملاقات کا شوق مانگتا ہوں۔

حقیقتِ شوق

جس محبوب چیز کا من وجہ علم ہو اور من وجہ علم نہ ہو اس کو بکمالہٖ جاننے اور دیکھنے کی خواہش طبعی ہونا (شوق کہلاتا ہے)

ابتداء[۱] میں محبت شوق کے رنگ میں ہوتی ہے اور بعد میں انس کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وقت وہ کیفیتیں نہیں رہتیں جو شوق کے وقت ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً بات بات پہ رونا اور استغراق کا غلبہ ہونا وغیرہ۔ مگر لوگ انہی آثار کو مقصود سمجھتے ہیں اور انس کی حالت میں جب یہ آثار کم ہو جاتے ہیں تو پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں حالانکہ یہ مقصود نہیں کہ ہر وقت شوق غالب رہے اور تقاضائے طبعی مرغوبات نفسانیہ کا کبھی نہ ہو۔ نہ یہ مقصود ہے کہ دل میں حرکت پیدا ہو جائے۔

آنحضرت[۲] صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق کی ایک حد بیان فرمائی ہے اسئلک شوقا الی لقائک من غیر ضراء مضرۃ ولا فتنۃ مضلۃ (یعنی یا اللہ! میں آپ سے آپ کی ملاقات کا شوق، بغیر کسی تنگی میں پڑنے کے جو نقصان دینے والی ہو اور بغیر کسی گمراہ کن آزمائش میں مبتلا ہونے کے طلب کرتا ہوں) چونکہ شوق اور عشق کا غلبہ کبھی ہلاکت اور مضرت کی نوبت پہنچاتا ہے جس سے اعمال میں خلل پڑ جاتا ہے اور اصل مقصود اور ذریعۂ قرب، اعمال اور امتثالِ اوامر ہی ہے اور کبھی غلبۂ شوق میں ادب کی حد سے گزر جاتا ہے اور مستلزم بے ادب، جیسے اکثر عشاق غلبۂ حالت میں کہتے ہیں، کہنے لگتے ہیں اور یہ بے ادبی موجب ضرر دین ہے۔ گو غلبہ کی حالت میں عفو (یعنی معاف) ہے مگر کمال نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادب و طاعت اور محبت کے جامع ہیں اس لیے (مذکورہ بالا) دعا فرماتے ہیں اس سے ضرر اول کی بھی نفی ہو گئی جو سبب انقطاع اعمال ہو جاوے اور ضرر ثانی کی بھی نفی ہو گئی جو بے ادبی کی طرف مفضی ہو جائے۔

---

[۲] مقالات حکمت نمبر ۳۰۳ [۱] اشرف المسائل ص [illegible]

طریقِ تحصیل محبّت[1] کا پیدا کرنا (اس کی تحصیل کا طریق ہے) کیونکہ محبّت کے لیے شوق لازم ہے۔

بیسویں[20] فصل صبر کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا - الآیہ[2] — اے ایمان والو! صبر کرو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

عجباً لامرء مؤمن ان امرہ کلہ خیر ولیس ذالك لاحد الا للمومنین ان اصابتہ سرآء شکر وان اصابتہ ضرآء صبر فکان خیراً لہ - رواہ مسلم

مومن پر تعجب ہے کہ اس کی ہر بات بہتر ہے اور یہ کسی کو میسر نہیں مگر مومن ہی کو۔ اگر اس کو خوشی پہنچی شکر کیا اور اگر اس کو سختی پہنچی صبر کیا۔ پس اس کے لیے بہتر ہے۔

صبر کی حقیقت انسان کے اندر دو قوتیں ہیں۔ ایک دین پر ابھارتی ہے دوسری ہوائے نفسانی پر سو محرک دینی کو محرک ہوی پر غالب کر دینا صبر ہے۔ اور اس[3] کی حقیقت ہے حَبْسُ النَّفْسِ عَمَّا تَكْرَهُ یعنی ناگوار بات پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا۔ آپے سے باہر نہ ہونا اور وہ ناگوار امر خواہ کچھ ہو۔ اب[4] کہیں تو حبس کے ساتھ کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے اور کہیں محض حبس ہی حبس ہوتا ہے اور کچھ نہیں کرنا پڑتا تو اس عنوان سے) ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر[5] کی تین قسمیں ہیں (۱) صبر علی العمل (۲) صبر فی العمل (۳) صبر عن العمل۔ صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا۔ یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے

---

[1] تعلیم الدین ص۲۰۰ [2] تعلیم الدین ص۲۰۰ [3] التشرف ص۳ [4] الجمعین ص۱
[5] ... تعلیم الدین ص۲۰۰ ...

رہنا اور صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا، طاعات بجالانے کے وقت ان کے حقوق وآداب کو سکون واطمینان سے ادا کرنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالانا۔ مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھادیا کہ تم اتنی دیر تک سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کرسکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے۔ اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے تیسری قسم ہے صبر عن العمل۔ یعنی نفس کو، ماںہی اللہ عنہ (جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ان) سے روکنا اور شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکنا (اس کے علاوہ ہر ممنوع امر سے رکنے کو صبر ہی کہا جاوے گا۔ مثلاً) صبر عن الشہوت شہوت میں شہوت رجال و نساء و شہوتِ لباس و شہوت طعام و شہوتِ کلام (وغیرہ) بھی داخل ہے اسی طرح تمام معاصی سے نفس کو روکنا یہ بھی صبر میں داخل ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ	وہ صبر کرنے والے ہیں باسآء میں اور
وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ	ضرآء میں اور باس کے وقت۔

باسآء سے مراد فقر و تنگدستی۔ حاصل یہ ہے کہ فقر اور تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے نہ ان سے توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہو گئی اور ضرآء سے مراد مطلق بیماری۔ خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ظاہری بیماری میں صبر یہ ہے کہ لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے۔ خدا سے دل میں مکدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہو گئی اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرے۔ عمل سے ان کا مقابلہ کرے اور باس سے مراد مطلق شدت و پریشانی جو بھی لاحق ہو اس پر مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے پس اب صبر کا حاصل یہ ہو گا کہ مُوَحِّد کامل بن جائے۔ جب مقامِ صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے۔ پس یہ ایسا جامع خلق ہے

کہ بہت سے اخلاق اس کے اندر داخل ہیں۔ اسی لیے حدیث شریف میں ہے الصبر نصف الایمان (یعنی صبر نصف ایمان ہے) تو صبر فی نفسہ تمام اعمال شرعیہ کو عام ہے[1] یعنی جس وقت جس کام کا امر ہو اس پر ثابت قدم رہنا صبر ہے۔ پس اگر کسی وقت معمولات کے ترک کا امر ہو تو اس وقت ترکِ معمولات ہی صبر ہو گا۔

حالات[2] دو قسم کے ہیں۔ نعمت اور مصیبت۔ نعمت سے مسرت ہوتی ہے اور مسرت کی وجہ سے منعم کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے بخلاف مصیبت کے کہ اس میں ناگواری ہوتی ہے اور صبر[3] کا موقع مصیبت ہے اور مصیبت کہتے ہیں حَالَۃٌ غَیْرُ مُلَائِمَۃٍ لِلنَّفْسِ ہے (مصیبت وہ حالت ہے جو نفس کو ناگوار ہو) اس[4] کی دو[4] قسمیں ہیں۔ ایک صورت مصیبت اور ایک حقیقتِ مصیبت۔ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے (اور حقیقت میں مصیبت ہے) اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہو۔ عارفین[5] کو مصیبت کا احساس تو ہوتا ہے بلکہ بوجہ ادراک لطیف ہونے کے دوسروں سے زیادہ احساس ہوتا ہے مگر ان کا رنج و غم حد سے نہیں بڑھتا کیونکہ اس میں ان کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اور ان حکمتوں پر بھی جو[6] خدا نے مصائب میں رکھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ مسلمان کو جو ایک کانٹا لگتا ہے وہ بھی اس کیلئے حسنہ ہے ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں چراغ گل ہو گیا۔ آپؐ نے انا للہ پڑھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ بھی مصیبت ہے فرمایا ہاں! جس چیز سے مسلمان کو تکلیف ہو۔ وہ مصیبت ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے۔

مشاہدہ[7] سے یہ امر ثابت ہے کہ جیسے مصیبت کے اندر ناگواری ہوتی ہے عبادت کے اندر بھی ہوتی ہے۔ پس صبر کا تعلق دو چیزوں سے ہوا۔ مصیبت سے بھی اور عبادت سے

---

[1] الجمعین ص۲۱ [2] ماعلیہ الصبر ص۲ [3] السبر بالصبر ص۳ [4] الشکر ص۲ [5] اکبر الاعمال ص۱۴، ۱۵ [6] السبر بالصبر ص۱۲، ۱۳ [7] الشکر ص۲، ۴، ۶، ۱۴، ۵

بھی۔ مصیبت میں تو صبر یہ ہے کہ جزع فزع نہ کرنا اور عبادت میں صبر یہ ہے کہ باوجود ناگواری کے نفس کو اس پر جمانا اور ناگواری کی پرواہ نہ کرنا۔ چنانچہ دونوں کی نسبت ارشاد ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا — اے ایمان والو! خود صبر کرو، مقابلہ میں

وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا۔ الآیۃ — صبر کرو اور مقابلہ کیلئے مستعد ہو۔

"اِصْبِرُوْا" تو مصائب میں صبر کرو۔ اور "صَابِرُوْا" دوسروں کو صبر کی تعلیم دینا۔ اور "رَابِطُوْا" عبادت کے اندر جما رہنا۔ چنانچہ رباط کی تفسیر حدیث میں یہ آئی ہے کہ ایک نماز پڑھ کر دوسری کے انتظار میں بیٹھے رہنا اور یہی مفہوم صبر کا بھی ہے کہ معصیت میں اس کا نام صبر ہو اور عبادت میں اسی کو رباط سے تعبیر فرمایا اور صرف عبادت کے متعلق ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا — اے ایمان والو! صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ

بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ الآیۃ — مدد چاہو۔

یہاں دونوں (صبر اور نماز) کا جمع کر کے بیان کرنا قرینہ اس کا ہے کہ صبر و صلوٰۃ کا مجموعہ ایک ہی چیز ہے یعنی صبر علی الصلوٰۃ (نماز پر صبر کرنا) اور یہ اسی قید سے محکوم علیہ ہے۔ "لَكَبِيْرَةٌ" کا ... صلوٰۃ میں کوئی گرانی نہیں اور اس مضمون پر حدیث اسباغ الوضوء علی المکارہ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کی علامت وضو کو باوجود ناگواریوں کے کامل کرنا، دال ہے یعنی جاڑے کے دن ہیں۔ سردی بہت ہو رہی ہے۔ جی نہیں چاہتا مگر اس حالت میں بھی وضو کو پورا پورا کیا۔ حدیث شریف میں "مکارہ" کا لفظ ہے جس سے ناگواری کا عموم صاف معلوم ہوتا ہے۔

(اب یہ سوال رہ گیا کہ صبر پر جو وعدہ ثواب کا ہے وہ کس صورت میں ہے یعنی کوئی شخص کسی سے انتقام لینے یا تکلیف کے دور کرنے پر قادر ہے اور نہ کرے بلکہ صبر

لے کمالات شرفیہ ص ۹۵

کرے، تب اجر ملے گا یا اگر قادر ہی نہ ہو۔ پھر صبر کرے۔ اس پر اجر ملے گا؟

(جواب یہ ہے کہ) بے صبری کی متعدد صورتیں ہیں (۱) انتقام بالمثل لینا۔ اس کا ترک کرنا صبر ہے۔ یہ قدرت کے ساتھ مشروط ہے (۲) زبان سے برا بھلا کہنا، سامنے یا پسِ پشت بد دعا دینا اور اس پر غیر قادر علی الانتقام بھی قدرت رکھتا ہے اس کے لیے اس کا ترک صبر ہے اسی طرح اہلِ میت گو مدافعت پر قادر نہیں لیکن نوحہ و شکایت پر تو قادر ہیں۔ لہٰذا ان کے حق میں اس کا ارتکاب بے صبری اور اس سے رکنا صبر ہے اور جو کسی فعل پر بھی قادر نہ ہو جیسے اندھا کہ دیکھنے پر بالکل قادر نہیں لیکن تصور یا عزم بصورتِ ابصار یا تمنّائے ابصار للابصار (یعنی کسی ناجائز امر کو دیکھنے کے لیے ارادہ کرنا کہ اگر نظر ہوتی تو دیکھتا یا دیکھنے کے لیے نظر کی خواہش کرنے) پر تو قادر ہے لہٰذا اس کی بیصبری یہی ہے اور اس کا ترک صبر ہے۔ ان سب صورتوں میں ہر شخص کو اس کے مناسب صبر پر اجر ملتا ہے۔

تفصیل (بالا) تو اجرِ صبر میں ہے اور ایک اجر خود تکلیف پر بھی ہوتا ہے اس میں صبر کی قید نہیں۔ اگر صبر کیا تو دو اجر ملیں گے، ایک صبر کا، دوسرے تکلیف کا اور اگر صبر نہ کیا تو تکلیف کا اجر ملے گا اور بے صبری کا گناہ ہوگا۔

ضرورت صبر

يَا أَيُّهَا[1] الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ ○

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اے ایمان والو! (طبیعتوں میں سے غم ہلکا کرنے کے بارہ میں) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو۔ بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنیوالوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

اس[2] آیت میں صبر کی (ضرورت اور اس کی) فضیلت بیان ہوئی ہے کہ حق تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ایک یہ کہ معیت سے اعانت و مدد

---

[1] بیان القرآن ص۸۷ ج ۱ [2] الصبر والصلوٰۃ ص۳، ۴

کی معیت مراد ہو۔ یعنی تم صبر کر کے دیکھو۔ دشوار نہ رہیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی اور انکی مدد کے بعد کوئی دشوار، دشوار نہیں۔ دوسرے یہ کہ معیت سے حالیہ مراد ہو۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ صبر کی دشواری کو اس مراقبہ سے آسان کرو کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہیں۔ اس مراقبہ کے بعد صبر میں دشواری نہ رہے گی نیز فرمایا[۱] وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوْبِكُمْ اس کا حاصل یہ ہے کہ نفس ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے یا نہیں اور مصیبت کے ذریعہ سے ایمان کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے یعنی مصیبت کے ذریعہ سے وساوس و معاصی کا میل دھو دیا جاتا ہے اور دعویٰ اور غرور و تکبر کم ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقت منکشف ہو کر سمجھ آجاتی ہے۔

استحضارِ عظمتِ حق ہوتا ہے۔ پس انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے۔

مصائب[۲] سے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے بعض دفعہ حق تعالیٰ اپنے بندہ کو خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرمانا چاہتے ہیں جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ اس درجۂ عالیہ کو پالیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت میں اہل مصائب کو دیکھ کر اہلِ نعم کہیں گے۔ یالیت جلودنا قرضت بالمقاریض فنعطی مثل ما اوتوا لیعنی "کاش ہماری کھالیں دنیا میں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں تاکہ آج ہم کو بھی یہ درجات ملتے" (جو اہل مصائب کو عطا کیے گئے ہیں)۔

حدیث[۳] شریف میں ہے جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں۔ کبھی دنیا میں مزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں۔

۱؎ السیر بالقبر ص ۱۳،۱۵ ، ۲؎ انفاس عیسیٰ ص ۲۱۳ ۳؎ کمالات اشرفیہ ص ۸

طریق کار

حق تعالیٰ[1] فرماتے ہیں اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ یعنی مصیبت اور غم کے وقت زبان کو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کے ورد میں مشغول کیا جائے اور دل کو اس کے معنی کے تصور میں کہ ہم اللہ ہی کی ملک ہیں اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اپنے مملوک میں اختیار ہے (غلام کو چاہیئے کہ مالک کے تصرف پر راضی رہے۔ اس لیے اس موقع پر تصرفِ حق پر راضی رہنا چاہیئے۔ واقعۂ (مصیبت) کو از خود نہ سوچیں بلکہ اپنے کام میں لگیں۔

مصیبت[2] کے وقت اول تو اپنے گناہوں کو یاد کریں تاکہ اپنی خطا کا استحضار ہو کر مصیبت سے پریشانی نہ ہو کیونکہ اپنی خطا پر جو سزا ہوتی ہے اس سے دوسرے کی شکایت نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان خود نادم ہوتا ہے کہ میں اسی قابل تھا پھر اجر کو یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے پس ثواب کو یاد کر کے غم کو ہلکا کریں اور مصیبت میں ثابت قدم رہیں۔ خدا کی شکایت نہ کریں۔ کوئی بات ایمان (اور اسلام) کے خلاف زبان و دل پر نہ آئے اور یہ[3] مت سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہ خیال خطرناک ہے۔ اس سے تعلق ضعیف ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے۔ (مصائب کو گناہوں کی سزا سمجھیں یا ایمان کی آزمائش سمجھیں اور اس کے ثواب کو یاد کریں۔ شریعت[4] نے مصیبت کے وقت صبر و تحمل کی تعلیم دی ہے (اس پر کاربند رہیں) اور یہ[5] بات سمجھ لیں کہ ہر مصیبت پر نعم البدل ملتا ہے اور اس میں نفع ضرور ہوگا۔ آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔ اگرچہ دنیوی نفع ابھی سمجھ میں نہ آوے۔

طریقِ تحصیل

قوتِ[6] ہوی (یعنی خواہشات و جذبات نفسانی) کو ضعیف اور کمزور کرنا (طریقِ تحصیل ہے)۔

---

[1] الصبر والصلاۃ صہ ۳۴ [2] الصبر بالصبر صہ ۱۲ ، [3] انفاس عیسیٰ صہ ۲۱۵

[4] کمالات اشرفیہ صہ ۹۷ [5] الاجر بالعنبر صہ ۳۷ ، ۳۸ [6] آداب الدین: ۲۷

اکیسویں فصل ۲۱ صدق کا بیان

صدق[1] سے مراد یہاں خاص قسم کا صدق ہے۔ یعنی مقامات میں صادق ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔

مومن تو وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں پھر کچھ تردد نہیں کیا اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ پورے سچے ہیں۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

مرّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بابی بکرؓ وھو یلعن بعض رقیقہ فالتفت الیہ فقال لعانین و صدیقین الی قول ابی بکر لا اعود۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابو بکرؓ پر گذر ہوا وہ اپنے غلام پر لعنت کر رہے تھے۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ لعنت کرنے والے اور پھر صدیق۔ پھر حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ اب ایسا نہ کروں گا۔

حقیقتِ صدق

جس مقام کو حاصل کرے کمال کو پہنچا دے، اس میں کسر نہ رہے (صدق کہلاتا ہے) اور اس[2] کے معنی پختگی کے

[1] تعلیم الدین ص۷۹، [2] التکمال فی الدین ص۸۷۔

ہیں اور اسی سبب سے ولیِ کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال وافعال واقوال میں مرتبۂ رسوخ حاصل کرچکتا ہے۔ شریعت میں صدق عام ہے۔ افعال کو بھی، اقوال کو بھی، احوال کو بھی۔ اقوال کا صدق تو یہ ہے کہ بات سچی ہو یعنی واقع کے مطابق ہو۔ جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔ اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو۔ حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے اور احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوالِ کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال وکیفیات سنت کے موافق ہوتے ہیں۔ اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدقِ احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحبِ حال پر باقی رہے۔ یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہوگئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا۔ یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیئے کہ جو حالت طاری ہو۔ وہ مقام ہوجائے۔

محققین[1] نے حقیقت صدیقیت کی یہ بیان کی ہے کہ عقائد شرعیہ نظریہ کا اس کو ذوقاً ادراک ہونے لگے اور اعمالِ شرعیہ اس سے طبعاً صادر ہونے لگیں۔ پس نظریات اس کے نزدیک بدیہیات ہوجائیں اور عبادات، عادات ہوجادیں۔ اول ثمرہ ہے قوتِ قدسیہ کا۔ اور ثانی کمال خلق کا ثمرہ ہے اور صرف ثانی میں اکمل ہونا شہادت ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ الآیۃ — اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو۔

اس آیت میں اول تقویٰ کا امر ہے۔ متقی کے معنی کامل فی الدین (تقویٰ کے بیان میں)

---

[1] التکشف صفحہ ۴۰ [2] اکمال فی الدین صفحہ ۲۰۴، ۲۰۳۔

ثابت ہو چکے ہیں کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ سے مقصود مذکور کے طریق کا بیان ہے، کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے۔ پس صادقین سے معنی مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالےٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے (جیساکہ اس آیت میں ہے):-

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔

اور اسی صدیقیت کا درجہ نبوت کے بعد ہے پھر شہداء وصالحین کا درجہ ہے۔

(خلاصہ یہ کہ) جس طاعت[1] کا ارادہ ہو۔ اس میں کمال کا درجہ اختیار کرنا مثلاً نماز کو اس طرح پڑھنا جس کو شریعت نے صلوٰۃ کاملہ کہا ہے۔ یعنی اس کو مع آداب ظاہرہ و باطنہ کے ادا کرنا۔ علیٰ ہذا تمام طاعات میں جو درجہ کمال کا شریعت نے بتلایا ہے اس کا اختیار کرنا صدق ہے۔

طریق تحصیل

صدق مابہ الکمال کے جاننے پر موقوف ہے۔ (لہذا) ہمیشہ[2] نگراں رہے اگر کچھ کمی ہو جاوے تو اس کا تدارک کرے۔ اسی طرح چند روز میں کمال حاصل ہو جاوے گا۔ (یہی صدق کا طریق تحصیل ہے)۔

بائیسویں[3] فصل محبت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (الآیہ)۔ اللہ ان کو دوست رکھتا ہے اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں۔

---

[1] بہشتی زیور ... ص ۲۳۳، ۲۳۵ [2] تعلیم الدین ص ۷۹، [3] تعلیم الدین ص ...

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

من احبّ لقاءَ اللہِ احبّ	جو اللہ کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے
اللہ لقاءہ ومن کرہ لقاءَ	اللہ اس کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے۔
اللہِ کرہ اللہ لقاءہٗ۔	اور جو اللہ کی ملاقات کو برا سمجھتا ہے اللہ اس
متفق علیہ	کی ملاقات کو برا سمجھتا ہے۔

حقیقتِ محبّت

طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس سے لذت حاصل ہو محبت کہتے ہیں، یہی میلان اگر قوی ہو جاتا ہے اس کو عشق کہتے ہیں۔ محبت کا یہ درجہ طبعی ہے اور غیر مامور بہ ہے مگر نعمت ہے اور وہبی ہے پھر اس میلان کے آثار میں رضائے محبوب کو رضائے غیر پر ترجیح دینا ہے اور یہ محبت عقلی ہے (جو فرض اور واجب ہے) پھر اس ترجیح کے باعتبار محل ترجیح کے اقسام ہیں چنانچہ ایک قسم ایمان کو کفر پر ترجیح دینا ہے۔ اور یہ محبت کا ادنیٰ درجہ ہے۔ بدوں اس کے بندہ مومن نہیں ہے اور دوسرے اقسام میں دوسرے احکام کو غیر احکام پر ترجیح دینا ہے اور احکام کے درجات کے اعتبار سے اس کے درجات ہیں۔ کوئی اوسط اور واجب۔ کوئی اعلیٰ و مستحب۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ	اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ
وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ	اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری
وَاَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ	بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے اور وہ
تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ	تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا اندیشہ ہو اور وہ
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ	گھر جنکو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ	اور رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے
فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی	سے زیادہ پیاری ہوں۔ تو تم منتظر رہو ۔

ے کمالات اشرفیہ ص۔ بیان القرآن ص۱۱۳ ن ۴

يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ الآیہ

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم یعنی سزا بھیج دیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنیوالوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

(ان مذکورہ بالا) اشیاء کا زیادہ پیارا ہونا جو بُرا ہے مراد اس سے وہ محبت ہے جو احکام الٰہیہ دینیہ پر عمل کرنے سے باز رکھے۔ میلانِ طبعی مراد نہیں ہے (مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکموں پر عمل کرنا دوسری سب چیزوں سے زیادہ محبوب اور پیارا ہونا چاہیئے ورنہ اللہ کی ناراضگی اور عذاب کا باعث ہوگا)۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔

اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ سے محبت میں بہت مضبوط ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اس آیت میں بلا تخصیص سب مسلمانوں کی ایک شان اور حالت کو بیان فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اللہ کی محبت میں نہایت مضبوط ہوں۔ اگر پورے طور سے مضبوط ہیں تو کامل ایمان ہوگا۔ ورنہ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجہ کا ایمان ہوگا مثلاً ایک مضبوطی کا درجہ یہ ہے کہ خداوند کریم کے متعلق سن کر بے چین ہوجائے دوسرا درجہ یہ ہے کہ محض خداوند کریم کا ذکر سن کر دل میں ایک ولولہ اور جوش پیدا ہو اور نافرمانی کے چھوڑنے کی فکر ہوجائے۔ اور اطاعت کرنے کے خیالات پیدا ہوجائیں۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس خیال کے ساتھ ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ یعنی نافرمانی کے سامان کو الگ کر دیا اور یہ پختہ قصد کر لیا کہ اب کوئی حرکت حکم کے خلاف نہ کریں گے اور اس قصد کو نباہ دیا (اور شریعت کے تمام احکام پر پابندی کے ساتھ عمل کرنا بھی شروع کر دیا) یہ درجہ سب سے بڑھ کر ہے (اور یہی مقصود ہے)۔[2]

محبت کی دو قسمیں ہیں۔ محبتِ طبعی اور محبتِ عقلی۔ محبتِ طبعی اختیاری نہیں۔۔

---

[1] محبت کے آثار ص ۱۸۱، ۱۸۰ [2] الامید والوعید ص ۱۶۱ ملخصاً۔

اس کا حدوث و بقا بالکل غیر اختیاری ہے اور امر غیر اختیاری پر بعض اوقات دوام نہیں ہوتا۔ بخلاف محبتِ عقلی کے کہ اس کا حدوث و بقا اختیاری ہے تو اس پر دوام بھی ہوتا ہے اس لیے محبتِ عقلی افضل و راجح ہے۔ محبتِ طبعی کا منشا جوشِ طبیعت ہے اور جوش ہمیشہ نہیں رہا کرتا۔

محبت[1] کے تین سبب ہوا کرتے ہیں یا تو یہ[1] کہ کوئی ہم پر احسان کرتا ہے اور اس کے احسان کی وجہ سے ہمیں اس سے محبت ہو۔ یا یہ[2] کہ وہ خود نہایت حسین و جمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف میلانِ خاطر ہو۔ یا یہ[3] کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو۔ اور وہ کمال باعثِ محبت ہو۔ سو انعام و نوال (حسن) و جمال اور فضل و کمال علیٰ وجہ الکمال خدا تعالیٰ ہی میں پائے جاتے ہیں تو جب تک (یہ) کمالات باقی ہیں اس وقت تک محبت بھی رہے گی اور محبوبِ حقیقی کے کمالات ختم نہیں ہو سکتے تو ان کی محبت بھی ختم نہ ہوگی اور چونکہ خداوند کریم کے سوا کسی میں بھی بالذات کمالات نہیں اس لیے کاملین کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے حبِ عقلی نہیں ہو سکتی۔ ہاں حبِ طبعی یعنی عشق غیر خدا سے بھی ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ جس محبت کا امر ہے وہ حبِ عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ اسی لیے نصوص میں حبِ طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ حبِ طبعی مطلوب نہیں بلکہ حبِ عقلی مطلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حبِ عقلی والوں (یعنی کاملین) میں حبِ طبعی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حبِ عقلی کو ہوتا ہے باقی جن پر حبِ عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبت طبعیہ بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبتِ طبعیہ کا غلبہ ہے۔ مگر وہاں محبت طبعیہ پر حبِ عقلی غالب ہوتی ہے اس لیے جوش دبا رہتا ہے۔ لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی حبِ طبعی کا غلبہ ہو جاتا ہے بہر حال کاملین تو حبِ طبعی و عقلی دونوں کے جامع ہوتے ہیں مگر ان میں غلبہ عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین

---

[1] اشرف المسائل ص۲۰۔ [2] شش۔ [3] العید والوعید ص۱۱ تا ۱۶ ملخصاً۔

میں حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے اور یہ گو کمالِ مطلوب نہیں مگر محمود ضرور ہے اور جو دونوں سے کورا ہے وہ خطرہ میں ہے۔ پس محبت کا ہونا ضروری ہے بغیر محبت کے نری طاعات و عبادات کافی نہیں۔ کیونکہ ان کا بھروسہ کچھ نہیں۔ بقولِ محققین کے شیطان اسی لیے گمراہ ہوا کہ اس کو حق تعالیٰ سے محض ضابطہ کا تعلق تھا۔ محبت و عشق نہ تھا۔ اور ملائکہ میں عشق و محبت کا اثر موجود تھا اس لیے حکم کے ساتھ ہی سب فوراً سجدہ میں گر پڑے۔ اسی لیے عراقی رحمہ اللہ طریق محبت کی تمنا کرتے ہیں ؎

صنمارہِ قلندر سزدار بمن نمائی + کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

راہِ قلندر سے مراد طریقِ عشق ہے اور رسم پارسائی سے طریقِ عبادت رسمی۔ مطلب یہ ہے کہ طریق عبادتِ رسمی بہت دور دراز ہے اس میں وصول دیر سے ہوتا ہے کیونکہ خودی دیر سے نکلتی ہے۔ فنا جلدی نصیب نہیں ہوتی اور طریقِ عشق سے بہت جلد فنا حاصل ہو جاتی ہے اور فنا محبت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ (تفصیل کے لیے باب احوال میں فنا کا بیان ملاحظہ ہو۔)

خلاصۂ[1] طریق یہ ہے کہ وہ اعمال اور محبت کا جامع ہوتا ہے۔ عمل اور محبت کے تفاوت کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کا بدوں بھاپ کے دھکیلنے سے چلنا اور بھاپ سے چلنا۔ اگر انجن میں بھاپ نہیں تو دھکیلنے سے بھی چلے گی تو ضرور مگر کتنی؟ (یعنی بہت مختصر سا راستہ طے کرے گی) اور اگر انجن میں بھاپ ہے تو بس چھوٹتے ہی اڑ گئی۔ تو عمل مثل ریل گاڑی کے ہے اور محبت گویا بھاپ ہے جو بمنزلہ گاڑی کی روح کے ہے تو اصل چیز ریل میں بھاپ ہی ہوتی ہے کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے ٹھیلتے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ کسی سبب سے پہیے لائن سے اتر گئے۔ اس لیے اترتے ہی کھڑی ہو جاوے گی اور اگر خدانخواستہ بھاپ کے زور سے اڑی چلی جا رہی تھی کہ پہیے لائن سے اتر گئے تو پرزے پرزے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ڈرائیور مع سواریاں ہلاک ہو گیا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی تو بس

---

[1] طریق القلندر ص ۱۹

اگر بھاپ ہونے کی صورت میں یہ لائن پر رہی تو مسافت امن اور تیزی سے قطع کرتی رہے گی اور اگر لائن کو چھوڑ دیا تو تہس نہس ہو جاوے گا۔ اس مثال میں گویا تین حالتیں ہوئیں ایک یہ کہ بھاپ نہیں لیکن لائن پہ ہے۔ اس صورت میں رفتار ضرور کم ہوگی لیکن خطرہ نہیں دوسری صورت یہ ہے کہ بھاپ تو ہے لیکن لائن پر نہیں۔ یہ حالت نہایت خطرناک ہے۔ اور ایک حالت نور علی نور ہے کہ بھاپ بھی ہو اور لائن پر بھی ہے (تو) وہ بھاپ محبت ہے اور لائن صراطِ مستقیم شریعت کی ہے جس نے محبت تو پیدا کر لی لیکن اعمالِ شریعت کو رخصت کر دیا تو وہ قطعِ طریق تو کیا کرتا الٹا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت باطنی میں ڈال دیا اور جس نے محبت تو پیدا نہیں کی لیکن شریعت پر عمل کرتا رہا تو رفتار گو نہایت سست ہوگی مگر کوئی خطرہ نہیں۔ عمل اور محبت کو جمع کر لو۔ یہ البتہ وہ ریل ہوگی جس میں بھاپ بھی ہے پہیے بھی درست ہیں اور لائن پر بھی ہے۔ پھر دیکھو کیسی جلدی مسافت قطع ہوتی ہے۔

محبت کو جو کہا ہے کہ اصل چیز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط محبت ہی کافی ہے۔ عمل کی ضرورت نہیں بلکہ بھاپ (محبت) کے اصل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہی پہیوں کی تیزی کا ذریعہ ہے لیکن اگر سرے سے پہیے ہی نہ ہوں تو نری بھاپ کیا کر سکتی ہے اسی لیے جس میں محض جوش و خروش ہو۔ اس میں سوائے اس کے کہ "حق حق اور الا اللہ" کے نعرے لگا لئے اور بھی کچھ ہے؟ نفع کیا؟ یہ جوش و خروش تو ایسا ہے جیسا اس ریل کا جس کے انجن میں آگ اور بھاپ بھی دہک رہی ہے مگر پہیے ٹوٹ گئے ہیں تو یہ بیچاری سوائے اس کے کہ کھڑی دھواں دیئے جاوے۔ اور "ٹیں ٹاں ٹیں ٹاں" کیے جاوے اور کیا کر سکتی ہے (کیا مسافت قطع کرے گی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ الٹا شور سے پریشان کرے گی) کاش جس گاڑی میں بھاپ تھی۔ پہیے بھی ہوتے اور لائن پر بھی ہوتی (یعنی جس میں محبت اور جوش تھا اس میں شریعت کے مطابق عمل بھی ہوتا) تب لطف تھا (کہ سفر کتنا جلدی اور اطمینان سے طے ہوتا)۔[1]

محبت[2] وعشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی قول اور

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص۱۹۹، ۲۰۳

فعل میں کوئی شبہ اور وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔ تمام مصائب محبین کو آسان ہو جاتے ہیں کہ نہ قید خانہ سے ان کو تکلیف ہوتی ہے نہ فاقہ سے کلفت۔ ان کی شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں مگر خوش ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی وہ آغوشِ محبت میں رضائے محبوب ہے لذتِ طاعت ہے۔ لذتِ مناجات ہے۔ لذت قرب ہے (اس لیے کہ) محبت[۱] سے معرفت بڑھتی ہے طاعت و فرمانبرداری میں لطف آنے لگتا ہے۔

طریقِ کار

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

قُلْ[۲] اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ	آپ لوگوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود)
اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ	خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا
اللّٰهُ ۔ الآیہ ۔	اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگینگے۔

محبت[۳] گو خود غیر اختیاری ہے مگر اس کا طریقہ اختیاری ہے جس پر محبت کا پیدا ہونا عادۃً ضروری ہے اور اختیاری کاموں میں خدا تعالیٰ نے ہر کام کی تدبیر بتلائی ہے اس کی تدبیر یہ ہے کہ چند باتوں کی پابندی کریں۔ انشاء اللہ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ سے محبت کامل ہو جائے گی (جس کو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ)

(۱) دین کا علم سیکھیں (۲) اعمال[۴] میں ہمت کر کے ظاہراً بھی اور باطناً بھی شریعت کے پابند رہیں۔ (۳) شقِ راحت کو اختیار کریں۔ بشرطیکہ کوئی محذور شرعی لازم نہ آئے کیونکہ راحت میں حق تعالیٰ سے محبت پیدا ہوتی ہے (۴) خداوند[۵] کریم کے احکام کی پوری طرح اطاعت کریں۔ کیونکہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے۔ اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے (۵) نیک عمل میں بہ نیتِ ازدیادِ محبت، استقامت کے ساتھ مشغول رہیں۔ (۶) تھوڑی دیر خلوت

---

[۱] کمالات اشرفیہ صد ۶۹ ، [۲] بیان القرآن صد ۱۲ ج ۲ [۳] محبت کے آثار صد ۱۹ [۴] کمالات اشرفیہ صد ۲۰ ، ۶۹
[۵] تصوف و سلوک صد ۱۳۶ ۔

میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر لیا کریں۔ (۷) محبانِ خدا سے علاقہ پیدا کریں اور ان کی صحبت اختیار کریں اور یہ بہت ضروری ہے اگر آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی رکھیں۔ (۸) تنہائی میں کسی وقت خدا کی نعمتوں کو سوچا کریں۔ پھر اپنے برتاؤ پر غور کیا کریں۔ (۹) خدا تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ محبت عطا فرمائیں۔ (۱۰) یہ[۱] مراقبہ کیا کریں کہ حق تعالیٰ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھ کو چاہتے ہیں اس سے بندہ کے قلب میں بھی محبت پیدا ہوگی اور بندہ خواہ کیسی ہی مصیبت اور پریشانی میں ہو۔ ساری پریشانی (دور ہو جائے گی)۔

طریقِ تحصیل دنیا[۲] کے علائق کو قطع کرنا یعنی غیر اللہ کی محبت کو دل سے نکالنا کیونکہ دو محبتیں ایک دل میں جمع نہیں ہوتیں اور اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف و انعامات کو یاد کرنا اور سوچنا (طریقِ تحصیل ہے)۔

---

[۱] القول الجلیل ص۱۹ [۲] تعلیم الدین ص۷۶۔

باب سوم اخلاقِ ذمیمہ کا بیان

اخلاقِ[۱] رذیلہ (ذمیمہ) مذموم نہیں ہیں ہاں عمل بمقتضی الاخلاق الرذیلہ مذموم ومنہی عنہ ہے (یعنی اخلاقِ ذمیمہ کے تقاضہ کے مطابق عمل کرنا منع ہے) مثلاً غصہ کا وجود مذموم نہیں لیکن اس کو بے محل صرف کرنا ناجائز ہے یا مثلاً بخل اگر کسی اچھی جگہ کیا جاوے تو برا ہے اور اگر کسی بری جگہ کیا جاوے تو برا نہیں۔ مثلاً ناچ (وغیرہ) میں چندہ دینے سے بخل کیا۔ (مزید معلومات کے لیے شریعت کے عنوان کے تحت اخلاق کا بیان اور باب دوم متعلق اخلاق ملاحظہ ہو)۔

اخلاقِ[۲] ذمیمہ چند چیزیں ہیں۔ آفاتِ[۱] لسان (کذب وغیبت وغیرہ) اسراف[۲]، بخل[۳] بغض[۴]، تکبر[۵]، حبِ جاہ[۶]، حبِ دنیا[۷]، حرص[۸]، حسد[۹]، ریا[۱۰]، شہوت[۱۱]، عجب[۱۲]، غضب[۱۳] وغیرہ۔ ان چیزوں کا زائل کرنا سالک کو ضرور ہے۔ ان کو الگ الگ فصلوں میں ذکر کیا جائے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

طریق کار

رذائل[۳] کا امالہ کافی ہے۔ ازالہ کی فکر ضروری نہیں۔ اضمحلال بھی کافی ہے مگر اضمحلال کے لیے مشق کی ضرورت ہے اور مشق کثرتِ تکرار سے ہوتی ہے کثرتِ تکرار کی خاصیت ہے کہ ایک دن انشاء اللہ تعالیٰ یہ رذیلہ کمزور ہو جائیگا۔ مجاہدات و کثرتِ مخالفت سے اخلاقِ رذیلہ گو معدوم نہیں ہوتے مگر کالعدم ضرور ہو جاتے ہیں اور یہ طریقہ ایسا آسان ہے جو ہر شخص کے اختیار میں ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے رذائل کی مخالفت کیا کرے۔

معالجہ

اخلاق رذیلہ کا مختصر علاج یہ ہے "تأمل و تحمل" یعنی جو کام کریں سوچ کر کریں کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اور جلدی نہ کریں بلکہ تحمل سے کام کیا کریں یا "اطلاع و اتباع" یعنی اپنے احوال و اعمال سے شیخ کو مطلع کرتے رہیں اور اس کی تجویز پر عمل کریں۔ یا

۱؎ اشرف المسائل ص۶۶ ۲؎ تعلیم الدین صفحہ ۸۰ ۳؎ کمالات اشرفیہ ص۷

" انقیاد و اعتماد" یعنی اپنے شیخ کی اطاعتِ کاملہ کریں اور وہ جو کچھ کہے اس پر اعتماد کریں۔

پہلی فصل آفاتِ لسان کا بیان[1]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :۔

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ الآیۃ۔ وہ کچھ بات نہیں بولتا ہے مگر اس کے نزدیک نگہبان تیار رہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

من صمت نجا رواہ احمد الترمذی جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔

حقیقت آفاتِ لسان

انسان[2] جتنے کام یا کلام کرتا ہے بظاہر اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱ :۔ مفید۔ جس میں کوئی دین یا دنیا کا فائدہ ہو۔

۲ :۔ مضر۔ جس میں دین یا دنیا کا کوئی نقصان ہو۔

۳ :۔ نہ مفید نہ مضر۔ جس میں نہ کوئی فائدہ ہو نہ نقصان۔

اس تیسری قسم کو حدیث میں لایعنی کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے لیکن جب ذرا غور سے کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی درحقیقت دوسری قسم یعنی مضر میں داخل ہے کیونکہ وہ وقت جو ایسے کام یا کلام میں صرف کیا گیا اگر اس میں ایک دفعہ سبحان اللہ کہہ لیتا تو میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا۔ کوئی اور مفید کام کرتا تو گناہوں کا کفارہ اور نجات آخرت کا ذریعہ یا کم از کم دنیا کی ضرورتوں سے بےفکری کا سبب بنتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کا اسلام درست و صحیح ہونے کی ایک علامت

---

[1] تعلیم الدین صد ۸۔ [2] گناہ بے لذت صد ۹ ، [3] رواہ الترمذی و ابن ماجہ۔

یہ ہے کہ بے فائدہ کاموں اور باتوں کو چھوڑ دے۔

احیاء العلوم میں ہے کہ لایعنی کلام کا حساب ہوگا اور جس چیز کا حساب و مواخذہ ہو اس سے خلاصی یقینی نہیں۔

گالی گلوچ کرنا

گالی اور فحش کلامی سے مراد یہ ہے کہ ایسے کام جن کے اظہار سے آدمی شرماتا ہو۔ ان کو صریح اور کھلے الفاظ سے ظاہر کرنا پھر اگر وہ واقع کے مطابق اور صحیح ہو تو ایک گناہ گالی دینے کا ہے اور اگر واقعہ کے خلاف ہو تو دوسرا گناہ بہتان و افترا کا بھی ہے۔ جیسے کسی شخص یا اس کی ماں بہن کی طرف کسی فعلِ حرام کی نسبت کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے اور (ایک دوسری) حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی شخص کو عیب لگانے کے لیے ایسی بات کہے جو اس میں نہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں اس وقت تک روکے رکھیں گے جب تک وہ اپنے کہے کی سزا نہ بھگت لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشرکین کفار کو بھی گالی دینے سے منع فرمایا جو غزوہ بدر میں مارے گئے تھے اور فرمایا "ان کو گالی دینے سے ان تک تو کچھ اثر نہیں پہنچتا۔ زندوں کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے۔"

احادیث مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ گالی دینا کسی کافر یا جانور کے حق میں بھی حرام ہے۔

لعنت کرنا

لعنت کے معنی ہیں کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور، یا غضب و قہر میں مبتلا، یا دوزخی کہنا، یا بطور بددعا کے یہ کہنا کہ اس کو اللہ اپنی رحمت سے دور کرے، یا اس پر غضبِ الٰہی نازل ہو، یا دوزخ میں جائے وغیرہ۔

لعنت کے تین درجے ہیں۔

؎ گناہ لذت ص ؎ صحیح بخاری و مسلم ؎ الطبرانی ؎ تخریج الاحیاء۔

ایک[۱] جن اعمال و خصائل پر قرآن مجید و حدیث شریف میں لعنت وارد ہوئی ہے ان اوصاف عام کے ساتھ لعنت کرنا جیسے لعنۃ اللہ علی الکافرین یا لعنۃ اللہ علی الظالمین۔ یہ صورت بالاتفاق جائز ہے۔

دوسرے[۲] کسی مخصوص فرقۂ ضالہ پر اس کے وصف ضلالت کے ساتھ لعنت کرنا مثلاً یہ کہنا کہ یہود و نصاریٰ پر لعنت، یا روافض و خوارج پر لعنت یا سود خوروں، شرابیوں وغیرہ پر لعنت جس میں کسی شخص یا جماعت کی تعیین خاص نہیں ہے یہ صورت بھی جائز ہے۔

تیسری[۳] صورت یہ ہے کہ کسی خاص شخص زید و عمر پر یا کسی جماعتِ خاص مثلاً فلاں شہر کے رہنے والے یا فلاں قبیلے کے لوگ یا فلاں پیشہ والے یا فلاں قوم پر لعنت یہ سخت خطرناک معاملہ ہے۔ اس سے بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ جن اعمال کی وجہ سے کوئی شخص لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔ اول تو اس کی تحقیق کامل اکثر یقینی نہیں ہوتی کہ فلاں قوم یا فلاں شخص نے وہ اعمال کئے ہیں۔ اکثر اس میں بدگمانی یا غلط خبر دل کو دخل ہوتا ہے اور بلا تحقیق محض گمان پر لعنت کرنا حرام ہے۔ دوسرے ان اعمال پر بھی لعنت کا مستحق اس وقت ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے توبہ نہیں کی اور آئندہ مرتے وقت تک بھی توبہ نہیں کرے گا اور ظاہر ہے کہ یہ علم یقینی بجز وحی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ حق صرف نبی اور رسول کو حاصل ہے (احیاء العلوم)۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص پر لعنت کی جاتی ہے اگر وہ لعنت کا مستحق نہیں ہوتا تو یہ لعنت اس کہنے والے پر لوٹتی ہے اور فرمایا "کہ مومن پر لعنت کرنا ایسا گناہ ہے جیسے اسکو قتل کر دیا" (بخاری، مسلم، ابوداؤد و ترمذی وغیرہ)

لعنت کرنا جیسے مسلمان پر جائز نہیں۔ کسی جانور اور معین کافر پر بھی جائز نہیں۔

دل لگی و تمسخر کرنا

قرآن کریم میں حکم ہے۔

ـ ابوداؤد و مسند احمد ـ صحیح بخاری و مسلم

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ۔ (الآیہ)

کوئی جماعت[1] کسی جماعت کے ساتھ ٹھٹھا نہ کرے۔ شاید وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ اور عورتیں عورتوں سے تمسخر نہ کریں شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔

تمسخر کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی اہانت وتحقیر اور اس کے عیب کا اظہار اس طرح کیا جائے جس سے لوگ ہنسیں یا دل لگی کریں۔ جس سے دوسرے کو ایذا پہنچے اس میں بہت سی صورتیں داخل ہیں۔ مثلاً

۱:۔ کسی کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، بولنے ہنسنے وغیرہ کی نقل اتارنا۔ یا قدوقامت شکل وصورت کی نقل اتارنا۔

۲:۔ اس کے کسی قول وفعل پر ہنسنا۔

۳:۔ آنکھ یا ہاتھ پیر کے اشارہ سے اس کے عیب کا اظہار کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ دوسرے لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں آخرت میں ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا اور اس کی طرف بلایا جائے گا۔ جب وہ سرکتا سسکتا ہوا وہاں تک پہنچے گا تو بند کردیا جائے گا۔ اسی طرح برابر جنت کے دروازے کھولے اور بند کئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہوجائے گا اور بلانے پر دروازۂ جنت کی طرف نہ جائے گا۔

ایک شخص کی ریح صادر ہوگئی۔ لوگ ہنسنے لگے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں اس پر تنبیہ فرمائی اور فرمایا جو کام تم سب خود بھی کرتے ہو اس پہ سے کیوں ہنستے ہو۔

بعض لوگ ناواقفیت یا غفلت سے تمسخر کو مزاح (خوش طبعی) میں داخل سمجھ کر اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مزاحِ جائز جو آنحضرت صلی اللہ

---

[1] گناہِ بے لذت صفحہ ۱

علیہ وسلم سے ثابت ہے اس کی شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی بات خلافِ واقعہ زبان سے نہ نکلے اور کسی کی دل آزاری نہ ہو اور وہ بھی مشغلہ اور عادت نہ بنے کبھی کبھی اتفاقاً ہو جائے اور جس تمسخر میں مخاطب کی دل آزاری یقینی ہے وہ باجماع حرام ہے اس کو مزاح جائز میں داخل سمجھنا گناہ بھی ہے اور جہالت بھی۔

چغلخوری کسی شخص کا عیب یا ایسا قول و فعل جس کو وہ چھپانا چاہتا ہے دوسروں پر ظاہر کرنا چغلی ہے کھانا کبیرہ گناہ ہے پھر اگر وہ عیب واقعی اور صحیح بات ہے تو صرف چغلی کا گناہ ہوگا اور اگر واقعہ کے خلاف ہے۔ یا اپنی طرف سے اس میں کچھ کمی زیادتی کی یا برے عنوان، برے طرز سے نقل کیا تو افترا و بہتان بھی ہے جو مستقل کبیرہ گناہ ہے اور جس کی طرف سے چغلی کی گئی ہے اگر اسکے کسی عیب کا اظہار ہے تو غیبت بھی ہے جو تیسرا گناہِ کبیرہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ چغلی لے کر ادھر سے ادھر جاتے ہیں جو دوستوں میں باہم فساد ڈلواتے ہیں اور جو بے قصوروں کے عیب ڈھونڈتے ہیں بدترین انسان ہیں[1] اور فرمایا چغلخور جنت میں نہیں جائے گا۔ چغلی عذابِ قبر ہے[2]۔

کذب (جھوٹ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ الآیہ — جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

عَلَیْکُمْ بالصدق و ایاکم والکذب متفق علیہ — ہمیشہ سچ بولو اور جھوٹ مت بولو۔

(خلافِ واقعہ بات کہنا کذب ہے) بے تحقیق[3] کسی بات کا نقل کرنا۔ اور سنی سنائی بات کو بدوں تحقیق کے فوراً زبان سے نکال دینا بھی گناہ ہے۔

---

[1] گناہِ بے لذت صفہ [2] انفاسِ عیسیٰ صفہ ۱۸ [3] تخریج احیاء سنت بخاری و مسلم عن ... تمی از ترغیب۔

كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع ۔ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے بیان کر دے۔

حضور[1] اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جھوٹ بولنے سے بچو کہ جھوٹ اور فجور ساتھ ساتھ ہیں اور یہ دونوں جہنم میں ہیں اور فرمایا۔ جھوٹی شہادت تین مرتبہ شرک کے برابر ہے۔ نیز[2] حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک زنبور ہے (زنبور چمٹے کے مانند ایک آلہ ہے جس کے اگلے سرے مڑے ہوئے ہوتے ہیں) اور اس بیٹھے ہوئے کے کلے کو چیر رہا ہے۔ یہاں تک کہ گدی تک جا پہنچتا ہے۔ پھر وہ کلا درست ہو جاتا ہے پھر اس کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھی (جبرائیل ؑ) سے پوچھا تو کہا کہ وہ شخص جھوٹا ہے اس کے ساتھ قیامت تک یوں ہی کرتے رہیں گے۔ (یعنی قبر میں عذاب ہوتا رہے گا)۔

غیبت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَا[3] يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ الآیہ اور کوئی کسی کی غیبت نہ کیا کرے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الغيبة اشد من الزنا غیبت زنا سے سخت تر ہے۔

کسی[4] کی پیٹھ پیچھے اس کی ایسی بات کہنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار ہو۔ اگرچہ وہ بات اس کے اندر موجود ہی ہو اور اگر وہ بات اس میں نہیں تو وہ غیبت سے بڑھ کر بہتان ہے۔ اسی طرح کسی کی نقل اتارنے سے، مثلاً آنکھ دبا کر دیکھنا، لنگڑا کر چلنا بھی (غیبت ہے) بلکہ یہ زیادہ برا ہے۔

---

[1] کنز دب لذت صد ۳۹۰/۱ نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد و ترمذی۔ [2] بہشتی زیور جلد اول۔ [3] منصدی اللغیر صد ۹ [4] تعلیم الدین صد ۱۰۲

غیبت[1] کا مذموم ہونا (قرآن اور حدیث سے) ظاہر ہے۔ اس کی مضرت دین و دنیا دونوں میں ہے۔ دنیا کی مضرت تو یہ ہے کہ اس سے باہمی تشویش و نا اتفاقی ہوتی ہے۔ آپس میں فساد ہو جاتا ہے اور دین کی مضرت یہ ہے کہ قیامت کے دن غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس کو مل جائیں گی جس کی غیبت کی تھی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ غیبت حق العبد ہے جب وہ معاف کرے گا تب معاف ہو گا۔

غیبت گناہِ جاہی ہے (یعنی حب جاہ سے پیدا ہوتی ہے) اس کے بعد ندامت نہیں ہوتی بلکہ فخر کرتا ہے جو موجب عجب بھی ہوا۔ اور عجب اس میں لازم ہے کیونکہ غیبت آدمی جبھی کرتا ہے جبکہ اپنے آپ کو پاک سمجھے۔ نیز[2] غیبت جب کبھی ہوتی ہے تو کسی ایسی بات کے بعد ہوتی ہے جو خلافِ طبع ہو۔ جب وہ بات ناگوار ہوتی ہے تو اس کا ذکر زبان پر آجاتا ہے اور یہ شکایت اور غیبت غصہ ہی کا نتیجہ ہے۔ اگر غصہ نہ آئے یا آدمی اس ناگواری خاطر کو منضبط کرلے تو شکایت ہی نہ ہو۔ نیز مشاہدہ[3] ہے کہ غیبت کے وقت دین کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ نہ ایذا سے دریغ ہوتا ہے، نہ جھوٹ اور فریب سے۔

یاد رکھو[4]۔ غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں برابر ہیں۔ البتہ چند صورتوں میں خاص لوگوں کی غیبت کرنا جائز ہے۔

اوّل[1]۔ مظلوم شخص، ظالم کی شکایت اگر افسر اعلیٰ تک پہنچائے اور اپنے اوپر سے ظلم رفع کرنے کی نیت سے اس کے مظالم بیان کرے تو گناہ نہیں۔ البتہ ظالم کے عیوب ایسے لوگوں سے بیان کرنا جنہیں اس کو سزا دینے یا مظلوم کے اوپر سے ظلم رفع کرنے کی طاقت نہ ہو بدستور غیبت میں داخل اور حرام ہے۔

دوم[2]:۔ کسی شخص سے کوئی بدعت یا خلاف شرع امر کے رفع کرنے میں، دینی یا کسی کو اس کے فتنہ سے بچانا ہو تو اس سے بھی ان بدعتی لوگوں کا حال بیان کرنا اگرچہ غیبت ہے مگر جائز ہے۔

---

۱ التصدی للغیر صہ ۸ تا ۱۰ ۔ ۲ الحفا ۔ ۲ فوائل الغضب صہ ۲ ۔ ۳ کمالات اشرفیہ صہ ۹ ۔ ۴ تبلیغ دین صہ ۳۲ تا ۴۴ ۔ ۱ صحا

سوم:۔ مفتی سے فتویٰ لینے کے لیے استفتاء میں امر واقعی کا اظہار کرنا بھی جائز ہے اگرچہ اس اظہارِ حال میں کسی کی غیبت ہوتی ہو۔

چہارم:۔ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح یا خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے اور تم کو علم ہوا کہ اس معاملہ میں ناواقفیت کی وجہ سے اس کا نقصان ہوگا تو اس کو نقصان سے بچانے کیلئے اس کا حال بیان کر دینا بھی جائز ہے۔

پنجم:۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے نام ہی سے مشہور ہو گیا جس میں عیب ظاہر ہو۔ مثلاً کانا، لنگڑا۔ تو اس نام سے اس کا پتہ بتلانا غیبت میں داخل نہیں ہے پھر بھی اگر دوسرا پتہ بتلا دو تو بہتر ہے تاکہ غیبت کی صورت بھی پیدا نہ ہو۔

مدح سرائی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مجمع میں اپنے دوست کی تعریف کی تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نفس میں خودی و بڑائی پیدا کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔ دوم اپنی تعریف سن کر نفس پھولتا ہے اور اعمالِ خیر میں سست پڑ جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "مسلمان بھائی کو کند چھری سے ذبح کر دینا اس سے بہتر ہے کہ اس کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے" اس لیے کہ ممدوح مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو قابلِ تعریف سمجھنے لگتا ہے حالانکہ یہ اس کی ہلاکت و تباہی کی جڑ ہے۔

اکثر دنیا دار مسلمانوں کی عادت ہے کہ وہ مالدار اور صاحبِ جاہ لوگوں کی تعریف کرتے ہیں (اس میں) اکثر باتیں ایسی بیان کی جاتی ہیں جو واقعہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ یہ صریح جھوٹ اور کبیرہ گناہ ہے۔

دوم: محبت کا لمبا چوڑا اظہار کرتے ہیں حالانکہ دل میں خاک بھی محبت نہیں ہوتی اور یہ صریح ریا اور نفاق ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

سوم۔ اٹکل کے تیر چلائے جاتے ہیں اور جو باتیں یقینی طور پر معلوم نہیں محض تخمین اور گمان کی بنا پر ان کو واقعی ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ آپ بڑے متقی ہیں۔ نہایت منصف ہیں۔ حالانکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی کی مدح کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میرا گمان

یہ ہے کہ آپ ایسے ہیں۔ کیونکہ ظنی باتوں کو واقعی بنانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

چہارم :- اگر ظالم اور فاسق کی تعریف کی جاتی ہے اور وہ تعریف سے خوش ہوتا ہے تو فاسق کو خوش کرنے والا مداح بھی فاسق اور نافرمان ہوا۔ حدیث میں آیا ہے کہ فاسق کی تعریف سے حق تعالیٰ کا عرش کانپ اٹھتا ہے۔

البتہ ان مضرتوں کا جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اندیشہ نہ ہو تو کچھ حرج نہیں۔ بلکہ بعض اوقات مستحب اور باعثِ اجر ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کی مدح فرمائی ہے چونکہ صحابہ میں خود پسندی اور کوتاہی عمل کا اندیشہ نہ تھا اس لیے ان میں نشاط پیدا کرنے کے لیے یہ مدح مستحب تھی کہ ان کی طاعات میں ترقی کا وسیلہ تھیں

اگر کسی شخص کی کوئی مدح کرے تو پھر اس کو چاہیئے کہ اپنے اعمال اور خطرات و وساوس کا دھیان کرے اور سوچے کہ خدا جانے میرا انجام کس حالت پر ہونا ہے؟ واقعی یہ خوبیاں جو یہ شخص بیان کر رہا ہے اگر مجھ میں موجود ہیں تو بھی ان کا کیا اعتبار؟ نیز اپنی باطنی بیماریوں اور عیوب پر نظر کرے اور خیال کرے کہ یہ پوشیدہ عیب ایسے ہیں کہ اگر اس مداح کو معلوم ہو جائیں تو میری مدح کبھی نہ کرے۔ غرض مسلمان کو چاہیئے کہ اپنی تعریف سن کر خوش نہ ہو بلکہ اس کو مکروہ سمجھے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "مداح کے منہ میں مٹی بھر دو" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جب مدح ہوتی تھی تو یوں دعا مانگتے پھرتے تھے کہ بارِ الٰہا: میرے جو گناہ انھیں معلوم نہیں ہیں وہ بخش دیجئے اور جو یہ کہہ رہے ہیں اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے۔ اور مجھے ان کے گمانوں سے بہتر بنا دیجئے۔ میں جیسا ہوں آپ ہی خوب جانتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے۔

(ان امورِ مذکورہ بالا کے علاوہ اور بھی) بہت سی آفتیں ہیں[1]۔ مثلاً خلاف شرع باتیں کرنا۔ ناحق بحث مباحثہ کرنا، جھگڑا کرنا، کلام میں بناوٹ اور تکلف کرنا، کسی کا راز ظاہر کرنا کسی کی زیادہ خوشامد کرنا۔ ذات و صفات میں محض اٹکل پچو گفتگو کرنا۔ علماء سے فضول باتیں پوچھنا (وغیرہ)۔

---

[1] تعلیم الدین ص ۱۰۰

طریقِ کار

حدیث شریف میں ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضائے بدن[1] زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا۔ اگر تو ٹھیک رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بگڑ جائیں گے۔ (لہٰذا لازم ہے کہ ہر ممکن طریق سے زبان کی حفاظت کریں اور ان باتوں کی سختی سے پابندی کریں)۔

بولنے[2] میں احتیاط رکھیں (بدوں سوچے کوئی بات نہ کیا کریں) اگر کبھی کوئی بات خلاف شریعت ہو جائے تو فوراً خوب توبہ کرلیں۔ (اگر کسی کو گالی دی ہو یا کسی سے تمسخر کیا ہو یا چغلخوری یا غیبت کی تو) توبہ کے بعد اس سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے اور جن لوگوں کے سامنے (چغلی یا) غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی مدح و ثنا بھی کریں اور پہلی بات کا غلط ہونا ظاہر کردیں اور اگر وہ بات سچی ہے تو کہدیں کہ بھائی مجھے خود اس بات پر اعتماد نہیں رہا۔ یہ توریہ ہوگا کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدوں وحی کے نہیں ہو سکتا اور اگر کسی[3] وجہ سے معاف کرانا دشوار ہو تو ادنیٰ درجہ کا علاج یہ ہے کہ اس شخص کے لیے اور اس کے ساتھ اپنے لیے استغفار کرتے رہیں اس طرح اللّٰھم اغفرلنا ولہ (اے اللہ! ہماری اور اس کی مغفرت فرما)۔

اکثر[4] اوقات زبان کو ذکر اللہ اور تلاوت میں مشغول رکھیں جس کو جو آسان ہو۔ جو بات کہیں سوچ کر کریں۔ اگر جواز و عدمِ جواز میں شبہ ہو تو اس کو کسی عالم سے پوچھ لیں۔ پھر جو وہ کہے اس کے موافق عمل کریں ؎

مزن بے تامل بگفتار دم ٭ نکو گوئی گر دیر گوئی چہ غم

طریقِ علاج

بجز[5] استحضار قبل الوقت وہمت در عینِ وقت و تدارک بعد الوقت ہیچ علاج نیست (یعنی بات[6] کرنے سے پہلے تھوڑی دیر تامل کرنا، اور سوچنا کہ اس بات سے اللہ تعالیٰ جو کہ سمیع و بصیر ہیں۔ ناخوش تو نہ ہوں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی بات گناہ کی منہ سے نہ نکلے گی اور اگر پھر بھی طبیعت میں ایسی بات کرنے کا تقاضا ہو

---

[1] نفس کا بھونا ص۲۳ [2] انفاس عیسیٰ ص۱۴۴، ۱۴۶ [3] تعلیم الدین ص۶۳ [4] انفاس عیسیٰ ص۲۸۰
[5] کمالات اشرفیہ ص۲۵ [6] تعلیم الدین ص۹۰

تو اس وقت ہمت سے کام لیں اور اگر کوئی بات ایسی منہ سے نکل جائے تو اس کا تدارک اسطرح کریں جیسا کہ طریقِ کار میں بیان ہوا ہے)۔

دوسری[۲] فصل اسراف کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ۔ الآیۃ — اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن اضاعۃ المال۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کے ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حقیقتِ اسراف — بے[۱] ضرورت کوئی چیز خریدنا یا خرچ کرنا اسراف ہے اور[۲] اس کی حقیقت تجاوز عن الحد (یعنی حدِ ضرورت سے بڑھ جانا) ہے۔

اور[۳] ضرورت ۲ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک واقعی اور ایک فرضی۔ واقعی ضرورت (وہ ہے جس کے بغیر دینی یا دنیوی کام رک جائے یا اس میں سخت دقت اور پریشانی ہو۔ یہ تو اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق مباح ہے اور بعض صورتوں میں ضروری بھی ہے مگر اس) کی تو انتہا ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت (جس کا دوسرا نام حرص ہے اس) کی کوئی انتہا نہیں (اس کو پورا کرنے کے لیے) دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی۔ تناہی ہوگی۔ پھر متناہی، لامتناہی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے (مطلب یہ کہ کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ تو یہ) اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال اُخروی تو آخرت میں ہو گا۔ مگر دنیا میں بھی نتیجہ دیکھ لیجئے کہ خاندان

---

[۱] دعوات عبدیت صـ۱۲۴ [۲] کمالات اشرفیہ صـ۳۴ ، [۳] وعظ میرٹھ صـ۱۸

کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہو گئے۔

طریق کار اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ؕ

(اور حلال چیزوں کو) خوب کھاؤ۔ اور پیو۔ اور حد (شرعی) سے مت نکلو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

(آیت بالا میں اللہ تعالیٰ کے حکم میں غور کریں اور امور ذیل کی پابندی کریں۔ یعنی) خرچ کرنے کے قبل دوامر کا التزام کریں۔ ایک یہ کہ پہلے سوچا کریں کہ اگر اس جگہ خرچ نہ کروں تو آیا کچھ ضرر ہے یا نہیں۔ اگر ضرر نہ ہو اس کو ترک کر دیں۔ اور اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو پھر کسی منتظم سے مشورہ کریں کہ یہ خرچ خلاف مصلحت اور نامناسب تو نہیں۔ وہ جو بتلا دے اس پر عمل کریں۔ ضرر سے مراد ضرر واقعی اور حقیقی ہے۔ جس کا معیار شریعت ہے۔ وہمی و خیالی ضرر مراد نہیں۔ اہل اللہ کا مذہب (یعنی طریق) رکھیں۔ وضعداروں کا نہ رکھیں۔ رسم و رواج کے ذرا بھی مقید نہ ہوں۔ سب سے پہلے انتخاب گھر کا کریں جتنی چیزیں کام میں آتی ہیں رہنے دیں اور جتنی چیزیں کام میں نہ آئیں خارج کر دیں یا بیچ دیں یا مساکین کو دے دیں۔ نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی میں دے دیں۔

طریق علاج اس کا طریق علاج بھی وہی ہے جو حب دنیا اور حرص کا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جاوے۔

---

[1] انفاس عیسیٰ ص۱۸۵۔

تیسری فصل۔ بخل کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ الآیۃ[1] — اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

والبخیل بعید من اللہ بعید من الجنۃ بعید من الناس قریب من النار رواہ الترمذی۔ — کنجوس اللہ سے دور ہے جنت سے دور ہے لوگوں سے دور ہے۔ دوزخ کے قریب ہے۔

حقیقتِ بخل

جس چیز کا خرچ کرنا شرعاً یا مروۃً ضروری ہو اس میں تنگدلی کرنا بخل ہے اس[2] میں دو درجے ہیں۔ ایک خلاف مقتضائے شریعت اور یہ معصیت ہے۔ دوسرا خلافِ مقتضائے مروّت۔ اور یہ معصیت نہیں (لیکن خلاف اولیٰ ہے) فضیلت تو یہ ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔ اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ اس مقتضا کی مخالفت کی جاوے لیکن اگر ہمت نہ ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں (اور اگر باوجود استطاعت کے اس پر عمل کیا تو بعض کے نزدیک یہ بھی بخل ہے اسلئے کہ) جو ضرورتیں[3] اتفاقیہ پیش آجائیں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ "جس مال کے ذریعہ سے آدمی اپنی آبرو کو بچائے وہ بھی صدقہ ہے" مثلاً کسی مالدار کو اندیشہ ہو کہ یہ شاعر (یا ڈوم یا ہیجڑا) میری ہجو کرے گا اور اگر میں اس کو کچھ دیدوں تو اس کا منہ بند ہو جائیگا اور باوجود اس علم کے اگر اس کو کچھ نہ دے تو وہ شخص بخیل سمجھا جائیگا۔ کیونکہ اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھنے کی تدبیر نہ کی اور بدگو کو بدگوئی کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

---

[1] تعلیم الدین صـ۱۲ [2] کمالات اشرفیہ صـ۲۸ [3] تبلیغ دین صـ۵۲

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ	اور ہرگز خیال نہ کریں ایسے لوگ جو (مفروری
يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ	موقعوں پر) ایسی چیز (کے خرچ کرنے) میں
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ	بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے ان کو اپنے
خَيْرًا لَّهُمْ ط بَلْ	فضل سے دی ہے کہ یہ بات ان کے لیے
هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ط	کچھ اچھی ہوگی (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بات ان
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ	کیلئے بہت ہی بری ہے (کیونکہ اس بخل کا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط ـ	انجام یہ ہوگا کہ وہ لوگ قیامت کے روز طوق
	پہنا دیئے جاویں گے۔ اس (مال) کا سانپ
	بنا کر جس میں انھوں نے بخل کیا تھا۔

اس طوق پہنائے جانے کی کیفیت حدیث بخاری میں آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ جس کو خداوند کریم مال دے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس کا وہ مال قیامت کے روز ایک زہری سانپ بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت (بالا) پڑھی۔ پس حدیث میں تخصیص زکوٰۃ کی تمثیلاً ہے۔ حصراً نہیں۔ اس سے ایسے ہی حقوق واجبہ (مثل) زکوٰۃ وغیرہ مراد ہیں۔ چنانچہ روح المعانی میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں ایسی ہی وعید ذی رحم کو نہ دینے پر آئی ہے۔ کیونکہ ذی وسعت پر ذی رحم عاجز کی اعانت بھی واجب ہے۔[1]

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بخل کی وجہ سے لوگ حرام کو حلال کر لیا کرتے ہیں بخل کے سبب سے فسق وفجور پھیلتا ہے اور فرمایا اسلام کو جتنا بخل مٹاتا ہے اتنی کوئی اور چیز نہیں مٹاتی)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ کہ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا[2] پس مسلمان کو شایاں نہیں کہ بخل کرے اور جہنم میں جائے اور چونکہ بخل درحقیقت مال کی محبت

---

[1] تفسیر بیان القرآن صفحہ ج ۲ [2] تبلیغ دین صفحہ ۴۹۔

ہے اور مال کی محبت دنیا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جس سے اللہ کی محبت کا علاقہ ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہے اور بخیل مرتے وقت حسرت بھری نظروں سے اپنا جمع کیا ہوا محبوب مال دیکھتا اور جبراً و قہراً آخرت کا سفر کرتا ہے اس لیے کہ اس کو خالق جل جلالہٗ کی ملاقات محبوب نہیں ہوتی ۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ "جو شخص مرتے وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہ کرے وہ جہنمی ہے"۔

طریقِ کار بخل[1] کے نقصانات معلوم کریں کہ آخرت کی تباہی اور دنیا کی بدنامی دونوں اس سے پیدا ہوتی ہیں ۔ خوب سمجھ لیں کہ مال بخیل کے ساتھ جانے والا نہیں ہے ۔ دنیا میں جو مال انسان کو دیا گیا ہے وہ صرف اس غرض سے دیا گیا ہے کہ وہ اس کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کیا کرے (لہٰذا) جو چیز[2] اپنی ضرورت سے زیادہ ہو اپنی طبیعت پر زور ڈال کر وہ چیز کسی کو دیدیا کریں ۔ اگرچہ نفس کو تکلیف ہو مگر ہمت کر کے اس تکلیف کو سہار لیں ۔ جب تک کہ کنجوسی کا اثر بالکل دل[3] سے نہ نکل جائے یوں ہی کیا کریں ۔

طریقِ علاج مال[4] کی محبت دل سے نکالیں طریقِ علاج حب دنیا میں مذکور ہے ۔

چوتھی[5] فصل بُغض یعنی حقد اور کینہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ — معاف کر دینے کو اختیار کر و اچھی بات کا

وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ الآیہ — حکم کر و اور جاہلوں سے منہ موڑ لو ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

---

[1] تبلیغ دین صہ ۵۳ ۔ [2] بہشتی زیور حصہ ہفتم ۔ [3] تعلیم الدین صہ ۶۲ [4] تعلیم الدین صہ ۸۱ ۔

لا تباغضوا متفق علیہ ۔ آپس میں بغض نہ رکھو۔

حقیقتِ بغض

جب غصہ میں بدلہ لینے کی قدرت نہیں ہوتی تو ضبط کرنے سے اس شخص کی طرف سے دل پر ایک قسم کی گرانی ہو جاتی ہے اس کو حقد یعنی کینہ (اور بغض) کہتے ہیں۔ اس کا منشا غصہ[1] ہے اور میٹھے غصہ میں ہوتا ہے اور میٹھے غصہ میں دو عیب ہیں ایک عیب تو خود وہ غصہ تھا اور دوسرا عیب یہ کینہ ہے تو کینہ صرف ایک عیب نہیں بلکہ بہت سے گناہوں کا تخم ہے جب غصہ نکلا نہیں تو اس کا غبار دل میں بھرا رہتا ہے اور بات بڑھتی اور رنجید گیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

کینہ وہ[2] ہے جو اختیار اور قصد سے کسی کی برائی اور بدخواہی دل میں رکھی جاوے اور اس کو ایذا پہنچانے کی تدبیر بھی کرے۔ اگر کسی سے رنج کی کوئی بات پیش آوے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباضِ طبعی ہے جو گناہ نہیں (حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ کینہ پرور بخشا نہیں جاتا۔ اور فرمایا۔ اللہ پیر اور جمعرات کو جب بندوں کے نامۂ اعمال اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ تو ہر استغفار کرنے والے کی مغفرت کر دیتا ہے لیکن اہلِ کینہ کی نجات نہیں ہوتی نیز فرمایا ان دو آدمیوں کی بخشش نہیں ہوتی جن کے درمیان عداوت اور کینہ ہو بشرطیکہ عداوت کا مبنی دنیاوی امور ہوں لیکن اگر کسی مسلمان کو کسی سے دین کے متعلق خدا کے واسطے دشمنی ہو تو یہ عداوت مستحسن اور قابلِ اجر ہے جیسا کہ حدیث میں الحب للّٰہ و البغض للّٰہ کا امر ہے۔)

قیامت[3] کے دن حق تعالیٰ آواز دے گا کہ "کہاں ہیں وہ جو خاص میرے واسطے باہم محبت کرتے تھے؟ آج جبکہ میرے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہیں میں ان کو اپنے سایہ میں لوں گا" یاد رکھو کہ ایمان کے بعد اللہ واسطے کی محبت کا درجہ ہے اور اس میں بھی دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ تم کو کسی شخص سے اس بنا پر محبت ہو کہ تم کو اس کے ذریعہ سے ایسی چیز حاصل ہوتی ہے جو آخرت میں مفید ہے۔ مثلاً شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ علمِ دین حاصل کرنے کے سبب سے

---

[1] غوائل الغضب صـ۲۱، [2] انفاسِ عیسیٰ صـ۱۹۱، [3] تبلیغِ دین صـ۲۶۔

اور مرید کو اپنے مرشد سے راہِ طریقت معلوم کرنے کی وجہ سے محبت ہے اور استاد کو اپنے شاگرد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ بھی اسی بنا پر ہوتی ہے کہ علمِ دین کا سلسلہ اس کی وجہ سے مدتوں تک میری طرف منسوب ہو کر جاری رہیگا اور مجھ کو آخرت میں صدقہ جاریہ کا ثواب ملے گا۔ پس یہ سب اللہ ہی کے واسطے کی محبت ہے کہ کوئی دنیوی غرض اس محبت میں سے مقصود نہیں مگر پھر بھی چونکہ خالص اللہ کی ذات مطلوب نہیں۔ اس لیے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی اللہ کے پیارے اور نیک بندہ سے بغیر کسی دینی غرض کے صرف اس وجہ سے محبت ہو کہ یہ شخص اپنے محبوب یعنی حق تعالیٰ کا محبوب ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلق یہاں تک قوی ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے ساتھ اپنے نفس کا سا برتاؤ ہونے لگتا ہے بلکہ اپنے نفس پر بھی ان کو ترجیح ہوتی ہے۔ پس جتنا بھی یہ علاقہ مضبوط ہوگا اسیقدر کمال میں ترقی ہوگی۔

ایسا ہی بغض کا حال ہے کہ حق تعالیٰ کے نافرمان بندوں سے عداوت ہونی چاہیئے۔ جن کو یہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ کے نافرمان بندوں کے پاس اٹھنا بیٹھنا اور ان سے بات کرنا تک چھوڑ دیتے ہیں اگر ان کی صورت نظر آتی ہے تو آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے کہ "خداوندا! کسی فاسق شخص کا مجھ پر احسان نہ کرائیو کہ اس کے احسان کی وجہ سے میرے دل میں اس کی محبت آجائے" حُبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ اسی کا نام ہے اور جس مسلمان میں یہ نہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ اس شخص کے ایمان میں ضعف ہے۔

طریقِ کار اپنے[1] مخالف کو کوئی نقصان کسی سے پہنچ جائے اور قلب میں فرحت محسوس ہو تو عقلاً اور اعتقاداً اس کا استحضار کیا جاوے کہ یہ فرحت قابلِ دفع ہے اور دعا بھی کی جاوے کہ اس فرحت کو اللہ تعالیٰ دفع فرمادیں۔ (اس لیے کہ) ؎

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن ۔۔۔ آئینِ ماست سینہ چو آئینہ داشتن

بعض[2] اوقات کسی سے اتنا انتقام لینا جیسا کہ کسی سے کوئی رنج پہنچا ہو تو انتقاماً یہ کہہ

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص ۱۷۰، [2] کمالاتِ اشرفیہ ص ۴۷۔

دیناکہ ہاں تمہاری اس حرکت سے مجھے رنج ضرور ہے) اچھلنا اس سے دل صاف ہو جاتا ہے البتہ زیادہ پیچھے پڑنا نہ چاہیئے۔

طریق علاج (جس شخص سے کینہ ہو) اس کا قصور معاف کر کے اس سے میل جول شروع کریں۔ گو بتکلف سہی۔ چند روز میں کینہ دل سے نکل جاوے گا۔[1]

پانچویں فصل۔ تکبّر کا بیان[5]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِيْنَ الآیہ[2] تحقیق اپنی بڑائی کرنیوالوں کو اللہ تعالےٰ پسند نہیں کرتا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

لا يدخل الجنة احد فی قلبه مثقال حبة من خردل من كبر رواہ مسلم جس کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہو جنت میں نہیں جائے گا۔

حقیقت تکبر اپنے آپ کو صفات کمال میں دوسرے سے بڑھ کر سمجھنا (تکبر ہے) اس[3] کے اقسام اس کثرت سے ہیں کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی (یعنی بے شمار ہیں) اور اکثر ان میں ادق و اغمض اس قدر کہ بجز محقق کے کسی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ اور اس میں علماء ظاہر کو بھی اس محقق کی تقلید بلا تفحص حقیقت کرنی پڑتی ہے۔

تکبّر[4] کا حاصل یہ ہے کہ کسی کمالِ دنیا یا دینی میں اپنے آپ کو باختیار خود دوسرے سے اس طرح بڑا سمجھنا کہ دوسرے کو حقیر سمجھے تو اس میں دو جزو ہوں گے۔ اپنے کو بڑا سمجھنا اور دوسرے[2]

---

[1] تعلیم الدین صہ ۸۱ ، [2] تعلیم الدین صہ ۹۳ [3] انفاس عیسیٰ صہ ۱۵ [4] شمس الفضائل صہ ۵۔
[5] باریک اور مشکل [6] بلا جستجو۔

کو حقیر سمجھنا۔ یہ اس کی حقیقت ہے جو حرام اور معصیت ہے اور ایک اس کی صورت ہے کہ اس میں سب اجزاء ہیں بجز ایک جز (یعنی اختیار) کے یعنی بلا اختیار ان اجزاء کا خیال آ گیا یہاں تک تو معصیت نہیں لیکن اگر اس کے بعد اس خیال کو باختیار خود اچھا سمجھا۔ یا باوجود اچھا نہ سمجھنے کے باختیارِ خود اس کو باقی رکھا تو یہ حقیقت کبر کی ہو جائے گی اور معصیت ہو گی اور یہ جو قید لگائی ہے کہ دوسرے کو حقیر سمجھے یہ اس لیے کہ اگر کوئی واقعی بڑائی چھوٹائی کا اس طرح معتقد ہو کہ دوسرے کو ذلیل نہ سمجھے تو وہ تکبر نہیں۔ جیسے ایک شخص بیس برس کی عمر والا دو برس کے بچے کو سمجھے کہ یہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے یا ایک ہدایہ پڑھنے والا طالب علم نحو میر پڑھنے والے طالب علم کو سمجھے کہ یہ مجھ سے پڑھائی میں کم ہے۔ یا ایک مالدار آدمی کسی مسکین کو سمجھے کہ یہ مجھ سے دولت میں کم ہے مگر اس کو حقیر نہیں سمجھتا تو وہ کبر نہیں۔ البتہ اگر یہ تفاوت واقعہ کے خلاف ہو تو ایسا اعتقاد کذب ہو گا۔ اگرچہ ایسی بڑائی چھوٹائی کا اعتقاد گو کبر تو نہیں لیکن اگر وہ محل تفاوت عرفاً یا شرعاً کمال ہو تو یہ اعتقاد احیاناً مفضی الی الکبر ہو جاتا ہے۔ اس لیے سدِّ ذرائع کے طور پر اس کا بھی وہی علاج کرنا چاہیئے جو حقیقتِ کبر کا ہے۔

۱:۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تکبر کرنے والے کا بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ کبریائی میری چادر ہے۔ پس جو شخص بھی اس میں شریک ہونا چاہے گا میں اس کو قتل کر دوں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے قلب میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو گا۔ وہ جنت میں نہ جائے گا۔ (اور فرمایا۔ کبر سے بچو۔ کبر ہی وہ گناہ ہے جس نے سب سے پہلے شیطان کو تباہ کیا اور فرمایا۔ دوزخ میں اس قسم کے آتشیں صندوق ہیں جن میں متکبروں کو بند کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ سخت ترین عذاب دیا جائے گا)۔

۲:۔ تکبر سے سلب نعمت کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۳:۔ متکبرین کو کبھی اتفاق نہیں ہوتا۔

---

۵ تبلیغ دین صہ۱۰ ۲ انفاس عیسیٰ صہ ۱۵۵ ۳ کبر کی طرف پہنچانے والا

۴ :- قبولِ[1] حق اور رجوع عن الباطل سے بڑا سدِّ راہ ہے۔ ایسا[2] شخص کسی کی نصیحت کو نہیں مانتا۔ بلکہ بُرا مانتا ہے اور اس نصیحت کرنے والے کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔

طریقِ کار | وہ[3] ایک مراقبہ ہے جس کی ایسے ہر وقت میں تجدید و تکریر کرلی جائے جبکہ اس طرف التفات ہو۔

۱ :- گو میرے اندر یہ کمال ہے گو میرا پیدا کیا ہوا نہیں۔ حق تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔ اور

۲ :- عطا بھی کسی استحقاق سے نہیں ہوا بلکہ محض موہبت و رحمت سے ہوا۔ پھر

۳ :- عطا کے بعد بھی اس کا بقاء میرے اختیار میں نہیں بلکہ حق تعالیٰ جب چاہیں۔ سلب کرلیں اور

۴ :- گو اس دوسرے شخص میں فی الحال یہ کمال نہیں ہے مگر فی المآل ممکن ہے کہ میرے کمال سے زیادہ اس کو یہ کمال حاصل ہو جاوے کہ میں اس کمال میں اسی کا محتاج ہو جاؤں۔ اور

۵ :- اگر فی المآل بھی نہ ہو جیسا بعض اوقات ظاہری اسباب سے اس کا گمان غالب ہوتا ہے تو فی الحال ہی اس شخص میں کوئی ایسا کمال ہو جو مجھ سے مخفی ہو اور دوسروں پر ظاہر ہو یا سب ہی سے مخفی ہو اور حق تعالیٰ کو معلوم ہو جس کے اعتبار سے اس کے اوصاف کا مجموعہ میرے اوصاف کے مجموعہ سے اکمل ہو۔

۶ :- شاید یہ علمِ الٰہی میں مقبول ہو اور میں غیر مقبول ہوں۔ یا اگر میں بھی مقبول ہوں تو یہ مجھ سے زیادہ مقبول ہو تو مجھ کو کیا حق ہے کہ اس کو حقیر سمجھوں۔

۷ :- اور اگر بالفرض یہ سب امور میں مجھ سے کم ہی ہے تو ناقص کا کامل پر حق ہوتا ہے جیسا مریض کا صحیح پر، ضعیف کا قوی پر، فقیر کا غنی پر، تو مجھ کو چاہیئے کہ اس پر شفقت و ترحم کروں اس کی تکمیل میں کوشش کروں۔ اور اگر کسی طرح قدرت یا ہمت یا فرصت نہ ہو تو دعائے تکمیل ہی سہی۔

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۲۹۰ [2] بہشتی زیور جلد ۷ [3] شمس الفضائل صفحہ ۹

اس خیال کے بعد تکمیل میں سعی شروع کر دیں۔ تو اس تدبیر سے اس کے ساتھ تعلق شفقت کا پیدا ہو جاوے گا اور طبعی خاصہ ہے کہ جس کی تکمیل و تربیت میں سعی کیجاتی ہے اس سے محبت ہو جاتی ہے اور محبت کے بعد تحقیر نہیں ہوتی۔

۸:۔ یہ بھی نہ ہو تو اس کے ساتھ لطف و اخلاق کے ساتھ کبھی کبھی بات چیت کر لیا کریں اس کا مزاج پوچھ لیا کریں۔ البتہ اگر وہ شخص ایسا ہے کہ شرعاً اس سے بغض رکھنا مامور بہ ہے تو تدابیر[1] مذکورہ میں سے بعض کا استعمال اس عارض کے سبب نہ کیا جاوے گا مگر بعض کا پھر بھی بغض کے ساتھ اجتماع ہو سکتا ہے ان بعض کو استعمال کریں۔

۹:۔ ہر[1] وقت اہتمام اور مراقبہ رہے کہ اس ذمیمہ (یعنی تکبر) کا قرب وقوع تو نہیں ہوا۔ جب محسوس ہو۔ اس کے مقتضا کی عملاً مخالفت کی جائے۔

۱۰:۔ اگر پھر بھی وقوع ہو جائے۔ نفس کو کچھ مناسب سزا دیں۔ خواہ بدنی یا مالی۔ مثلاً دس[1] رکعت نفل جرمانہ ادا کریں۔ یا خیرات کریں اور قصداً ایسے افعال اختیار کریں جو عرفاً موجب ذلت سمجھے جاتے ہیں۔ (مثلاً) مسافروں کے پیر دبا دیا کریں۔ نمازیوں کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر دیا کریں۔

۱۱:۔ اپنے[2] عیوب کو سوچا کریں اور یوں سمجھیں کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے۔ اور دوسروں کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص یقینی معیوب ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے اس لیے مجھے اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھنا چاہیئے۔

طریقِ علاج

اللہ[3] تعالیٰ کی عظمت کو یاد کریں۔ اس کے مقابلہ میں اپنے کمالات کو ہیچ پائیں گے اور جس شخص سے اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اس کے ساتھ تواضع و تعظیم سے پیش آویں۔ یہاں تک کہ اس کے خوگر ہو جائیں۔

---

[1] انفاس عیسیٰ ص ۱۵۱ تا ۱۵۲ ملخصاً [2] المجاہدہ ص ۱۸ [3] تعلیم الدین ص ۸۳

چھٹی فصل حُبِّ جاہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ الآیۃ

وہ جو دارالآخرت ہے ہم اس کو ان ہی لوگوں کے لیے کریں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ ادو ہم مچانا۔ اور انجام کار متقیوں ہی کے لیے ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ما ذئبان جائعان ارسلا فی غنم ما فسدا من حرص المرء علی المال والشرف لدینہ رواہ الترمذی

دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جائیں اس گلے کو اتنا تباہ نہیں کرتے جتنا آدمی کی حرص مال پر اور جاہ پر اس کے دین کو تباہ کر دیتی ہے۔

حقیقتِ جاہ

لوگوں کے دلوں کا مسخر ہو جانا جس سے وہ لوگ اس کی تعظیم کریں (جاہ کہلاتا ہے) حبِّ جاہ[۱] ایسا مرض ہے کہ اس کا پتہ چلنا مشکل ہے جب کوئی واقعہ پیش آوے اور گرانی ہو تب پتہ چلتا ہے کہ افوہ! ہم میں حب جاہ کا مرض ہے۔ یہ محض وہمی انتزاعی کمال ہے اور انتزاعی بھی ایسا کہ جو دوسرے کے خیال کے ساتھ قائم ہے کیونکہ جاہ دوسروں کی نظر میں معزز ہونے کا نام ہے جس کا مدار دوسرے کے خیال پر ہے۔ وہ جب چاہے بدل دے تو ساری جاہ خاک میں مل جاتی ہے مگر طالبِ جاہ خوش ہے کہ آہا۔ لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں جیسے چوہا خوش ہوتا ہے کہ بنیئے کی دکان میں غلہ آیا ہے جی ہاں[۲] منہ تو ڈالوا بھی چولہا دان آتا ہے جس سے ساری شیخی کر کری ہو جائے گی۔

---

[۱] تعلیم الدین صلا ۹۲ [۲] کمالات اشرفیہ صد ۱۰۲، ۲۶۰، ۱۷۹، ۱۸۰، ۸۸

جس جاہ سے ضرر ہوتا ہے یہ وہ جاہ ہے جو طلب سے حاصل ہو۔ یہ وہ بلا[1] ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے۔ دینی ضرر تو یہ ہے کہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر کار اسی عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے۔ بہت لوگ اس میں آکر ہلاک ہو گئے۔ یہ تو دین کا ضرر ہوا اور دنیا کا ضرر یہ ہے کہ مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحب جاہ کا دین بھی خطرہ میں رہتا ہے اور دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں جب حق تعالیٰ کی طرف سے بدون طلب کے جاہ حاصل ہو۔ وہ نعمت ہے (کیونکہ) مال کی طرح انسان جاہ کا بھی بقدر ضرورت محتاج ہے تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور بیخوف ہو کر باطمینان قلب عبادت میں مشغول رہ سکے۔ لہٰذا اتنی طلب جاہ میں مضائقہ نہیں ہے۔

چونکہ اس کا منشا بھی تکبر ہے اس لیے اس کے اقسام۔ احکام و معالجات وہی ہیں جو تکبر میں گزرے ہیں۔

طریقِ کار

حُبِّ[2] جاہ کی جو مذمتیں اور وعیدیں وارد ہیں۔ ان کو ذہن میں حاضر کریں بلکہ زبان سے بھی ان کا تکرار کریں اور ان مضامین سے اپنے نفس کو خطاب کریں کہ تجھ کو ان سے عقاب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس کے ساتھ اپنے عیوب کا استحضار اور نفس کو خطاب کہ اگر لوگوں کو ان رذائل کی اطلاع ہو جاوے تو کتنا ذلیل اور حقیر سمجھیں تو یہی غنیمت سمجھ کہ لوگ نفرت و تحقیر نہیں کرتے نہ کہ ان سے توقع تعظیم و مدح کی رکھی جاوے اور مداح کو زبان سے منع کر دیا جائے اور اس میں ذرا اہتمام سے کام لیا جاوے۔ سرسری لہجہ سے کہنا کافی نہیں اور اس کے ساتھ ہی جو لوگ ذلیل شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تعظیم کیجاوے گو نفس کو گراں ہو۔

طریقِ علاج

یوں[3] سوچیں کہ جو لوگ میری تعظیم و اطاعت کر رہے ہیں نہ یہ رہیں گے نہ میں رہوں گا پھر ایسی موہوم و فانی چیز پر خوش ہونا نادانی ہے۔

---

[1] تعظیم العلم صـ ۶۴ [2] تبلیغِ دین صـ ۵۵ [3] انفاسِ عیسیٰ صـ ۱۷۹ [4] تعلیم الدین صـ ۸۳

ساتویں فصل حُبِّ دنیا کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ الآیہ — دنیا کی زندگانی دھوکے کی ٹٹی ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر رواہ مسلم — دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔

حقیقتِ دنیا

جس چیز میں فی الحال حظ نفس ہو اور آخرت میں اس کا کوئی ثمرہ مرتب نہ ہو۔ وہ دنیا ہے۔

دنیا لغۃً نزدیک کی چیز کا نام ہے اور عرفاً مطلق اس حالت کا نام ہے جو موت سے پہلے ہے اور شرعاً خاص اس حالت کا نام ہے جو مانع عن الآخرت ہے اور مجازاً ان احوال وامتعہ پر اطلاق کیا جاتا ہے جو اس کی مانعیت کے اسباب بن جائیں۔ پس جو احوال خواہ از قسم اقوال ہوں۔ یا از قبیل افعال واعمال یا عقائد وعلوم ہوں اسی طرح جو اموال کہ آخرت واجبۃ التحصیل سے مانع ہوں گے وہ سب دنیائے حرام ومذموم میں داخل ہیں اور ان کے مذموم ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

دنیا[۲] کے تمام جھگڑوں، بکھیڑوں اور مخلوقات اور موجودہ چیزوں کے ساتھ تعلق رکھنے کا نام دنیا کی محبت ہے۔ البتہ علم ومعرفتِ الٰہی اور نیک کام جن کا ثمرہ مرنے کے بعد ملنے والا ہے ان کا وقوع اگرچہ دنیا میں ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ دنیا سے مستثنیٰ ہے اور ان کی محبت دنیا کی محبت نہیں۔ بلکہ آخرت کی محبت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے دنیا کی تمام چیزوں کو زمین کی

---

[۱] تعلیم الدین صـ ۸۲ ، [۲] تبلیغ دین صـ ۵۶

زینت کا سامان بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمالیں کہ کون ان پر فریفتہ ہو کر آخرت کو ضائع کرتا ہے اور کون بقدر ضرورت سفر کا توشہ سمجھ کر اپنی آخرت کو سنوارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا[1]	البتہ جو لوگ ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا
وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا	کی زندگی پر خوش ہوئے اور اسی پر مطمئن ہو گئے
بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ	اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔
اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ	ایسوں کا ٹھکانہ آگ ہے بدلہ اس کا جو
النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ الآیہ	کماتے ہیں۔

ہر چند ہمارے اندر مختلف امراض پائے جاتے ہیں لیکن بنص (قرآن و) حدیث اصل تمام امراض کی صرف ایک ہی چیز حبِّ دنیا ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف لفظوں میں یوں ارشاد فرمایا حُبُّ الدُّنْيَا رَاْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ دنیا کی محبت تمام خرابیوں کی جڑ ہے (اور جڑ یعنی) اصل مرض ہی بقیہ امراض کا سبب ہوا کرتی ہے (اور) اصل کا علاج کرنے سے جملہ امراض خود ہی دفع ہو جائیں گے جس میں حبِ دنیا ہوگی اس کو آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا جب آخرت کا اہتمام نہ ہوگا۔ وہ شخص نہ تو اعمالِ حسنہ کو انجام ہی دے گا اور نہ برائیوں سے بچیگا اور ایسے ہی برعکس۔ جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے۔ کیونکہ حب دنیا میں فکر دین کم ہوتی ہے جس درجہ کی حب دنیا ہوگی۔ اسی درجہ کی فکرِ دین کم ہوگی۔ اگر کامل درجہ کی حب دنیا ہوگی تو کامل درجہ کی دین سے بیفکری ہوگی جیسا کہ کفار میں متحقق ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حبِ دنیا ہوگی اسی درجہ کی دین سے بیفکری ہے چنانچہ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا میں تصریح ہے اور وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا۔ کے بڑھانے سے معلوم ہوگیا کہ رضا بحیاتِ دنیا معصیت مذموم وہ ہے جسکے ساتھ اطمینان بھی ہو ورنہ معصیت نہیں۔ کیونکہ یہ طبعی امر ہے چنانچہ ایک دوسری آیت میں اس کی تصریح ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

---

[1] الاطمینان بالدنیا صد ۲۱،۴، ۸۶

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَ اَبْنَاۗؤُكُمْ[1]	(اے محمدؐ! آپ) کہہ دیجیے گا کہ اگر تمہارے
وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ	باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری
عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨ	بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ	کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰ	ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور وہ گھر جن (میں رہنے)
كِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ	کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ
مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ	اور اس کے رسول سے، اور اس کی راہ میں
سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى	جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر
يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ	رہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ	اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو ان کے
الآیہ	مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

ان اشیاء کا زیادہ پیارا ہونا جو بُرا ہے۔ مراد اس سے وہ محبت ہے جو احکام الٰہیہ پر عمل کرنے سے باز رکھے۔ میلان طبعی مراد نہیں (بلکہ) یہاں[2] وعید اسپر ہے کہ یہ چیزیں اللہ و رسول (اور ان کے حکموں) سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور اگر یہ چیزیں کسی درجہ میں محبوب تو ہوں لیکن اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب نہیں۔ تو ان پر وعید نہیں کیونکہ ان چیزوں کا محبوب ہونا امر طبعی ہے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کو پسند کرنا اور ان پر خوش ہونا اور مطلق رضا محل وعید نہیں البتہ حیات دنیا پر مطمئن ہونا (یعنی آخرت کی فکر نہ کرنا) محل وعید ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بُدن[3]
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(یعنی حقیقت میں) دنیا مال و دولت، زن و فرزند کا نام نہیں بلکہ دنیا کسی ذی اختیار کے ایسے مذموم فعل یا بدحالت کا نام ہے جو اللہ سے اعراض (و غافل) کرادے۔ خواہ کچھ ہو اور کبھی

---

[1] بیان القرآن ص۱۰۲ جلد ۴ پ ۱۰ [2] الطمینان بالدنیا ص۸ [3] مقالات حکمت نمبر ۱۶

اسباب غفلت کو مجازاً تسمیۃ للسبب باسم المسبب کو بھی دنیا کہہ دیتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ	اکثر لوگوں کو خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ محبت مرغوب
مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَ	چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے،
الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ	سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے،
الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ	نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے)
الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ	مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب
ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ج	استعمال کی چیزیں ہیں۔ دنیوی زندگانی کی۔ اور
وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ۔	انجام کار کی خوبی ... تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس
الآیہ	ہے (جو بعد موت کام آوے گی)۔[1]

یہ جو فرمایا کہ ان چیزوں کی محبت خوشنما معلوم ہوتی ہے اس کا حاصل میرے ذوق میں یہ ہے کہ یہ محبت و میلان غالب حالات میں موجب فتنہ ہو جانے کی وجہ سے ڈر کی چیز ہے مگر اکثر لوگ اس کو سبب ضرر نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس میلان کو علی الاطلاق اچھا سمجھتے ہیں۔ چونکہ مذاق[2] مختلف تھے اس لیے مختلف چیزیں بیان فرمائیں۔ کسی کو عورتوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی کو اولاد سے کسی کو سونے چاندی سے، کسی کو گھوڑوں سے، کسی کو بیلوں اور کھیتی سے۔ کسی کو عورتوں سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ دن رات اسی میں مبتلا ہیں۔ ہر وقت یہی خیال ہے۔ کسی کو اولاد کی ایسی چاہت ہوتی ہے کہ دن رات اسی دھن میں رہتے ہیں کہ بیٹا ہو، پوتا ہو، پڑپوتا ہو۔ بعض رؤسا کو بیلوں (اور گھوڑوں وغیرہ) سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ ریاست بھی غارت کر بیٹھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ محبت کے افراط میں جنون ہوتا ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ کسب دنیا اور چیز ہے اور حب دنیا اور چیز ہے۔ حب دنیا مذموم ہے اور کسب دنیا بقدر حاجت جائز۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی کیا اچھی تعلیم ہے کہ مرغوب چیزوں کی فہرست تو بیان فرما دی مگر ان کی فی حد ذاتہا مذمت نہیں فرمائی بلکہ اس کے بعد اس سے اچھی چیز کا پتہ بتلا

---

[1] بیان القرآن صفحہ ج ۲ [2] انوار السراج صفحہ ۱۴۲ تا ۱۷۱ ملخصاً۔

دیا کہ یہ سب چیزیں مثلاً عورتیں اولاد (اور مال) وغیرہ سب اچھی چیزیں ہیں۔ مگر دوسری چیز ان سے زیادہ اچھی ہے غرض حق سبحانہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی مذمت نہیں فرمائی۔ چنانچہ اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا کہ ان چیزوں کی خاص درجہ کی محبت واقع میں تو اچھی نہیں مگر انسان کی نظر میں یہ چیزیں مزین ہوگئی ہیں جس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوڑی پر سبزہ جما ہوا ہو جس کو دیکھنے والا سمجھے کہ یہ ایک چمن ہے اور اس کے ظاہر رنگ و روپ کو دیکھ کر فریفتہ ہو جائے اور جب وہاں پہنچے تو پاخانہ میں بھر جائے۔ یہی حال دنیا کا ہے کہ ظاہر تو اس کا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اندر نجاست بھری ہوئی ہے۔

دنیائے[۱] مذموم کی مثال خوبصورت سانپ کی سی ہے جس کا ظاہر تو اچھا ہے۔ نقش و نگار سے آراستہ ہے مگر اندر زہر بھرا پڑا ہے ؎

زہر ایں مارِ منقش قاتل است
باشد از وے دور ہر کہ عاقل است

اگر بچہ کے سامنے سانپ چھوڑ دیں تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے۔ اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا ہماری حالت بھی اس بچہ کی سی ہے کہ ہم دنیا کی ظاہری آب و تاب اور نقش و نگار اور رنگ و روپ پر فریفتہ ہیں اور اندر کی خبر نہیں یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جتنا خوبصورت ہوتا ہے اسی قدر زہریلا ہوتا ہے۔ اسی لیے حقیقت شناس اس کی طرف رغبت نہیں کرتے۔

دنیا[۲] کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے لوگ اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے جیسے کسی چڑیل بڑھیا کو لال ریشمی لباس پہنا دیا گیا ہو اور نقاب سے منہ ڈھانک دیا گیا ہو اور کوئی اس کو حسین خوبصورت سمجھ کر دم بھرنے لگے۔

حدیث شریف میں ہے۔

---

۱ کمالاتِ اشرفیہ ص۱۴۹ ۲ انفاسِ عیسیٰ ص۱۷۲

لو[۱] کانت الدنیا تعدل عند الله جناح بعوضۃٍ ما سقی کافراً منھا شربۃ ماءٍ

اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پَر کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتے۔

چونکہ اس کی قدر کچھ بھی نہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ مبغوض شے اپنے دشمنوں کو دیتے ہیں۔ حقیقت شناس آدمی ہمیشہ ایسی چیز سے گھبراتا ہے جو خدا تعالیٰ کو مبغوض ہو۔

حالِ[۲] دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ
گفت یا خوابے است یا بادے ست یا افسانۂ

باز گفتم حال آنکس گو کہ دل درِ بست
گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانۂ

(یعنی ایک عاقل سے دنیا کی حالت کے متعلق میں نے سوال کیا تھا اس نے جواب دیا کہ دنیا ایک خواب ہے یا ایک ہوا ہے یا ایک افسانہ ہے۔ پھر میں نے اس شخص کے متعلق دریافت کیا کہ جس نے دنیا سے دل لگایا تو اس نے جواب دیا کہ وہ یا تو چھلاوہ ہے یا شیطان ہے یا پاگل ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو ایک مثال میں بیان فرماتے ہیں:۔

مالی وللدنیا انما مثلی مثل راکب استظلّ بشجرۃ یعنی مجھ کو دنیا سے کیا علاقہ ہے میری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار راستہ میں جا رہا ہو اور کسی درخت کے سایہ میں ستانے کے لیے ٹھہر جائے اور ستا کر اپنی راہ لے۔

دررہ عقبیٰ است دنیا چوں پلے ❊ بے بقا جائے و ویراں منزلے

راہِ عقبیٰ (یعنی سفرِ آخرت) میں دنیا کی مثال پل جیسی ہے (جو ایک فانی گزرگاہ اور ایک ویران منزل ہے نیز اس) کی[۳] مثال آخرت کے سامنے سرائے جیسی ہے اس لیے دنیا کی مصلحت و منفعت بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے اور شریعت نے بھی اجازت دی ہے (البتہ اس تمام) تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ مال کو مقصود بالذات نہ بنائیں بلکہ مقصود بالغیر بنائیں۔

مقصود[۴] تو یہ ہے کہ آخرت ایک بازار ہے اور اس کا سکہ اعمال ہیں۔ اگر یہ سکہ پاس نہ ہو گا تو آدمی کس چیز سے وہاں کی نعمتیں خریدے گا۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ دنیا کی سرائے میں لگائے چلے جاتے

---

۱ کمالات اشرفیہ ص۱۴۸ ۲ الباقی ص۲۲، ۱۷ ۳ الجر بالصبر ص۳۸ ۴ الاسلام الحقیقی ص۴۸

ہیں۔ تو ہماری حالت اس مسافر جیسی ہے جس نے ساری کمائی سرائے کی کوٹھری میں لگادی اور گھر گئے تو کچھ بھی نہ تھا۔ خوب سمجھ لیں کہ دنیا ہمارا گھر نہیں بلکہ سرائے ہے اس میں اس سے زیادہ نہ لگائیں جتنا تمہارے ایک رات بسر کرنے کے لیے کافی ہو۔ ہمارا گھر وہ ہے جو دارالسلام ہے لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وہاں کے واسطے کچھ (زاد) جمع کر لو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ الآیہ[1]

اور اصل زندگی عالمِ آخرت ہی کی ہے۔ (بس فانی میں اس قدر انہماک اور آخرت جو باقی رہنے والی ہے اس سے ذہول و حرمان ہو جائے۔ خود یہ بے عقلی کی بات ہے اللہ تعالیٰ ایسوں ہی کے متعلق فرماتے ہیں) اگر ان کو اس کا کافی علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں مشغول ہو کر باقی کو بھلا دیتے اور اس کیلئے سامان نہ کرتے بلکہ یہ لوگ دلائل میں غور کرتے اور ایمان لے آتے۔ کہ طالب دنیا کی تمنا پوری نہیں ہوتی اور آخرت سے محروم رہتا ہے اور طالب آخرت کو ترقی ہوتی ہے۔ نیز زیادہ دنیا کا انجام اچھا نہیں۔ اکثر اس سے اعمالِ مضرہ پیدا ہوتے ہیں۔ سو اس سے ثابت ہوا کہ مطلوب بنانے کے قابل دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۔ الآیہ (یعنی دنیا کی چیزوں میں سے) جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لیے ہے (کہ خاتمہ عمر کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا) اور جو (اجر و ثواب آخرت میں) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیۃً بھی) بہتر ہے اور (کمیۃً بھی) زیادہ پائیدار (اور ہمیشہ رہنے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا[2]	دنیاوی زندگی (کے اشغال) تو کچھ بھی نہیں بجز
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ، وَلَلدَّارُ	لعب ولہو کے (بوجہ غیر نافع اور غیر باقی ہونے
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ	کے) اور پھر پچھلا گھر (یعنی آخرت) متقیوں

---

[1] بیان القرآن ص۱۳۹ ج۲ ، ص۷۵ ج۱۰ [2] بیان القرآن ص۸۸ ج۳

يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿﴾ کے لیے بہتر (یعنی نافع تو وہی) ہے۔ تم سمجھتے
———— سمجھتے نہیں ہو کہ اس کو مان کر اس کے لیے
———— سامان کرو کہ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں)

(یہاں اللہ تعالیٰ کا) خود حیاتِ دنیویہ کو لہو و لعب فرمانا مقصود نہیں بلکہ اس کے اشغال و اعمال کو۔ کہ آخرت کے لیے نہ موضوع ہیں نہ معین ہیں تو اس قید سے طاعات اور مباحاتِ معین طاعات سب نکل گئے اور مباحات لایعنی اور معاصی سب داخل رہ گئے گو ایسے مباحات میں گناہ نہ ہو۔ لیکن بے سود اور فانی الاثر تو ہیں اور لہو و لعب کے معنی اہل لغت نے متقارب بلکہ متحد ہی لکھے ہیں۔ صرف فرق اعتباری ہو سکتا ہے وہ یہ کہ غیر نافع امر میں مشغول ہونے کے دو[۲] اثر ہیں ایک خود اس کی طرف متوجہ ہونا۔ دوسرے اس کی وجہ سے نافع امور سے بے توجہی ہو جانا وہ امر اول کے اعتبار سے لعب کہلاتا ہے اور دوسرے اعتبار سے لہو۔

(خلاصہ یہ ہوا کہ) طلبِ[۱] دنیا یعنی دنیا کمانا تو برا نہیں۔ لیکن حبِ دنیا برا ہے مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے۔ اور ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است ؞ آب اندر زیر کشتی پشتی است

یعنی کہ پانی کشتی کا معین بھی ہے اور اس کو ڈبونے والا بھی ہے اس طرح کہ کشتی سے باہر (اور نیچے) رہے تو معین (و مددگار ہوتا ہے) اور اگر کہیں پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح مال ہے کہ اگر قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین اور اگر قلب کے اندر اس کی محبت ہے تو مہلک۔ اور اسی کو کہا ہے ؎

مال را کز بہر دیں باشد حمول ؞ نعم مال صالح گفتش رسول

حدیث میں ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح (نیک آدمی کے لیے حلال مال بہتر ہے) ایسی حالت میں وہ مال اقارب کو دیں گے (مدرسوں میں) چندہ دیں گے لوگوں کی مدد کریں گے اور اگر دل میں مال کی محبت ہے تو اوروں کے حقوق دبا دیں گے حضرت عمرؓ

۱؎ تقویٰ ص ۲۹

کے سامنے جب فارس کا خزانہ آیا تو آپؓ نے آیت زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ پڑھی اور فرمایا کہ اے اللہ! اس سے معلوم ہوا کہ ہم میں اس کی رغبت تو پیدا کی گئی ہے تو اس کا ازالہ تو نہیں چاہیئے مگر یہ دعا ہے کہ یہ محبت آپ کی محبت میں معین ہو جائے۔

طریقِ کار

یاد رکھیں[۱] کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشہ ہے اور اسی سے اکثر باطنی امراض مہلکہ مثلاً غرور و نخوت، کینہ، حسد، ریا، تفاخر اور برتری کی حرص پیدا ہوتی ہے اور جب انسان کو حیاتِ دنیوی کی درستی اور آرائش کا شوق پیدا ہوتا ہے تو صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے ناپائیدار مشغلوں میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ آگے پیچھے مبدا و معاد کی اس کو کچھ خبر ہی نہیں رہتی اور ظاہر و باطن دونوں دنیا ہی کے ہو رہتے ہیں۔ قلب محبتِ دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے اور بدن اس کی اصلاح و تدبیر میں مصروف، حالانکہ دنیا توشۂ آخرت ہے اور اس سے مقصود یہی ہے کہ مسافرانِ آخرت بآسانی اپنا سفر ختم کر سکیں۔ مگر بے وقوف لوگوں نے اسی کو مقصودِ اصلی سمجھ لیا اور طرح طرح کے مشغلوں اور قسم قسم کی خواہشوں میں ایسے پڑے کہ آنیوالے وقت کو بالکل بھول گئے۔ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص حج کی نیت سے روانہ ہو اور جنگلوں میں پہنچ کر سواری کے گھاس دانہ اور اس کے موٹا تازہ کرنے کی فکر میں لگ جائے اور ہمراہیوں سے پیچھے رہ جائے افسوس ہے اس کی حالت پر کہ تن تنہا جنگل میں رہ گیا اور قافلہ کوچ کر گیا جس نیت سے چلا تھا یعنی حج وہ بھی گیا گزرا ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جنگلی درندوں نے سواری کو بھی چیر پھاڑ ڈالا۔ اور اس کو بھی نوالہ بنا گئے۔ یاد رکھو کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور منزل کا پڑاؤ ہے اور تم جسم خاکی پر سوار ہو کر سفرِ آخرت کر رہے ہو۔ اس لیے تم کو چاہیئے کہ اپنی سواری کا گھاس دانہ بقدر کفایت اٹھاؤ اور سفری ضرورتوں میں کام آنیوالا سامان مہیا کر کے وہ بیج بو دو جس کو آخرت میں کاٹو۔ اور پھر دائمی زندگی آرام سے گزار سکو اور اگر اس ماتحت سواری کی پرورش و فربہی میں مشغول ہو جاؤ گے تو قافلہ کوچ کر جائیگا اور تم منزل مقصود پر نہ پہنچ سکو گے۔

۱؎ تبلیغ دین ص ۵۷ تا ۵۹ ملخصاً۔

جو شخص اپنے نفس کی ماہیت سے واقف ہو گیا اس نے معرفت الٰہی حاصل کر لی اور جس نے دنیائے دنی کی حقیقت سمجھ لی وہ خوب سمجھ سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے بغیر آخرت کی جاوید نعمتیں نہیں مل سکتیں اور جب تک انسان دنیا سے منہ نہ پھیرے گا کہ ان فانی تعلقات کو منقطع کرے اور بقدر ضرورت دنیا پر قناعت کر کے باطمینان ذکر و فکر میں مشغول ہو جائے۔ اس وقت تک حق تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہوگی تخمینًا تہائی قرآن اسی دلفریب سبزہ زار ہلاہل (یعنی زہر قاتل) کی برائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "جنہوں نے سرکشی کی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی۔ وہ جہنمی ہیں"۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "ان بندوں پر تعجب ہے جو عالم بقا کو سچا سمجھیں اور پھر اس ناپائیدار پر فریفتہ ہوں" (خوب سمجھ لیں کہ) جو لوگ دنیا کو مقصود سمجھ کر اس کے کمانے میں مشغول ہو جاتے ہیں وہ سدا پریشان رہتے ہیں کہ ان کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی اور ان کی آرزو کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ ان کی حرص ہمیشہ بڑھتی ہی رہے گی۔ دنیا کے زر و مال کو اپنے اطمینان کا ذریعہ سمجھنا بڑی حماقت ہے۔ جہاں ہمیشہ رہنا نہیں ہے وہاں اطمینان کیسا؟

(لہذا) دنیا[1] کی حالت پر توجہ ضرور کریں مگر کامل توجہ کریں۔ جس سے حقیقت منکشف ہو جائے ناتمام توجہ نہ کریں کہ ظاہر ہی تک رہ جائیں اور حقیقت مستور رہ جائے کیونکہ طالب دنیا کوئی راحت میں نہیں چنانچہ اگر ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس رہ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی پریشانی سے خالی نہیں بخلاف طالب آخرت کے، کہ سب کے سب راحت میں ہیں۔

خیال[2] کرنے کی بات ہے کہ دنیا کی مرغوب سے مرغوب شے اگر اس وقت گم بھی نہ ہوتی مگر کبھی نہ کبھی تو گم ہوتی۔ کیونکہ فنا ہونا تو گویا اس کے ذاتیات سے ہے جیسے چراغ میں تیل ہو جو محدود بھی ہے اور کم بھی ہو رہا ہے تو وہ ایک نہ ایک وقت ضرور ہی ختم ہوگا۔ بس ختم ہونے والی چیز سے کیا جی لگانا۔ خداوند کریم سے دل لگانا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

---

[1] انفاس عیسیٰ ص۱۷۵ [2] کمالات اشرفیہ ص۱۵۱

عشق با مردہ نہ باشد پائیدار ٭ عشق باحی وباقیوم دار
عاشقی با مردگاں پائندہ نیست ٭ زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں ٭ عشقہائے اولین وآخریں

غرض غم ہلکا کرنے کے لیے یہ عجب تعلیم ہے مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فانی ہے اور خداوند کریم کے یہاں (یعنی آخرت) کی چیزیں باقی ہیں اور وہی رغبت کے قابل ہیں۔ پھر یہ بھی سوچیں کہ آدمی مر کر جاتا کہاں ہے ظاہر ہے خدا کے پاس جاتا ہے تو اب تو وہ مَا عِنْدَ اللّٰہِ میں داخل ہو گیا۔ پہلے وہ عِنْدَکُمْ کا مصداق تھا اس وقت وہ فانی تھا اور اب باقی ہو گیا۔ کیونکہ اس موت کے بعد پھر موت نہیں۔ تو اب وہ مرنے کے بعد پہلی حیات سے اچھی حیات میں پہنچ گیا۔ وہ پہلی فانی تھی اور دوسری باقی ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو ایک بدوی نے خوب سمجھا اور حضرت عباس رضؓ کے انتقال پر حضرت ابن عباس رضؓ کی تسلی یوں کی۔

خیر من العباس اجرك بعدہٗ ٭ واللّٰہ خیر منك للعباس

مطلب یہ ہے کہ اے ابن عباس رضؓ! صبر پر تم کو عباس رضؓ فانی کے عوض اجر باقی ملا اور عباس فانی رضؓ اب باقی ہو گئے (یعنی اور زیادہ مرغوب حالت میں ہو گئے) تو نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا نہ ان کا۔ پھر کاہے کا غم۔

دنیا[1] کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مہمان نواز نے اپنا مکان آراستہ کیا اور شیشہ آلات سے سجا کر مہمانوں کو بلایا اور ان کو اس میں بٹھا کر عطر اور خوشبودار پھولوں سے بھرا ہوا طباق ان کے سامنے رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ صاحب مکان کا مطلب اس سے یہ ہے کہ طباق میں رکھے ہوئے پھولوں کو سونگھو۔ اور پاس والوں کے آگے سرکا دو کہ وہ بھی اب اسی طرح نفع اٹھائیں اور بخوشی خاطر برابر والوں کے سامنے کر دیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے طباق پر تم ہی قبضہ کر بیٹھو۔ پس اگر کوئی شخص آداب مجلس سے واقف نہ ہو اور طباق کو اپنا نذرانہ سمجھ کر اپنی بغل

---

[1] تبلیغ دین صفحہ ۶۰

یں دبائے تو اس کی حماقت پر سب حاضرینِ مجلس ہنسیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے اور اس کے بعد نتیجہ یہ ہوگا کہ مالکِ مکان زبردستی اس سے طباق چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دے گا تم ہی سوچو کہ اس وقت اس کو کیسی ندامت ہوگی۔ اسی طرح دنیا حق تعالیٰ کی ضیافت کی جگہ ہے۔ اس سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود ہے کہ مسافرانِ آخرت آئیں اور بقدرِ ضرورت اس طرح نفع اٹھائیں جس طرح مستعار چیزوں سے نفع اٹھاتے اور اپنی حاجتیں رفع کرتے ہیں۔ اس کے بعد بخوشی خاطر اس کو دوسروں کے حوالہ کر کے اپنا راستہ لیں۔ اور آخرت میں آپہنچیں۔ پس مستعار چیز سے دل لگانا حقیقت میں چلتے وقت اپنے آپ کو شرمندہ و رنجیدہ بنانا ہے۔ پس[1] دنیا چھوڑ کر آخرت کی طلب کریں مگر اس کے حصول کے لیے جمیع طاعاتِ ضروریہ کا اختیار کرنا اور تمام ذنوب کا چھوڑنا شرطِ غالبی ہے۔

طریقِ علاج

موت[2] کو کثرت سے یاد کیا کریں اور مدتوں کے لیے منصوبے اور سامان نہ کریں اور نہ سوچیں۔ خداوند[3] تعالیٰ کی طاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیں گو بہ تکلف سہی۔ خداوند تعالیٰ کی طاعت میں اثرِ خاص ہے کہ اس سے فکر پیدا ہوگی اور فکر کے پیدا ہونے سے تمام کام درست ہو جائیں گے۔

آٹھویں[4] فصل حرص کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ الآیۃ[5]

اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف مت بڑھاؤ جس سے ہم نے نفع دیا ان کافروں کے مختلف گروہوں کو آرائش زندگانی دنیا کی۔

لہ بیان القرآن پ ۲ ص ۷۵ ۔ ۲ے تعلیم الدین ص ۸۲ ۔ ۳ے کمالات اشرفیہ ص ۲۰ ۔ ۴ے تعلیم الدین ص ۱۰

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

یھرم ابن آدم ویشب منہ	آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور اس کی دو چیزیں
اثنان الحرص علی المال والحرص	بڑھتی رہتی ہیں۔ مال پر حرص کرنا اور عمر
علی العمر متفق علیہ	پر حرص کرنا۔

حقیقتِ حرص

توجہ[1] اور میلان الی الدنیا (یعنی) قلب کا مال وغیرہ کے ساتھ مشغول ہونا حرص ہے اگر اس توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا نہ رہے گی۔ پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جاوے اگر وہ طبعًا بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہوگی۔ اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا۔ پس اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کرو۔ اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اسلئے یہ توجہ اشد و اکمل ہوگی تو جتنی توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہوگی اتنی ہی توجہ دنیا سے ہٹے گی۔

حرص[2] تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو ام الامراض کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرص مال نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے۔ بدکاری کا منشا بھی لذت کی حرص ہے۔ اخلاقِ رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر ہوس جاہ ہی کا نام ہے۔ پس کبر کا منشا بھی یہی حرص ہوا۔ انسان کا طبعی خاصہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جس میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں۔ پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ جتنا ہوس کو پورا کرو گے اتنا ہی بڑھے گی۔ جیسے خارش والا جتنا کھجلاتا ہے خارش بڑھتی رہتی ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی بھلا انسان کی ہر آرزو پوری ہو سکتی ہے (یعنی کبھی پوری نہیں ہو سکتی) یہی وجہ ہے کہ حریص کو کبھی راحت نہیں مل سکتی اس کے ہوس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی ؎

گفت چشمِ تنگ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

---

[1] کمالاتِ اشرفیہ ص ۹۳ [2] کمالاتِ اشرفیہ ص ۸۰، ۹۵

(کیونکہ) ایک[1] آرزو ختم نہیں ہوتی۔ دوسری شروع ہو جاتی ہے اور تقدیر پر راضی ہے نہیں تو ہر کام میں یوں دل چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار ہے اس لیے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی ہے گو ظاہر میں اولاد اور مال سب کچھ ہے مگر اندرونی حالت سب کی پریشان ہے۔

طریق کار اور علاج خرچ[2] کو گھٹائیں تاکہ زیادہ آمدنی کی فکر نہ ہو اور آئندہ کی فکر نہ کریں کہ کیا ہوگا اور یہ سوچیں کہ حریص و طامع ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے (یہاں حب دنیا کا بیان بھی مطالعہ میں رکھیں۔ انشاء اللہ مفید ہوگا)۔

نویں[6] فصل حسد کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَمِنْ[3] شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ الآیۃ

(تم کہو) میں حاسد کے شر سے (جب وہ حسد کرے) پناہ مانگتا ہوں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تَحَاسَدُوا رواہ البخاری

آپس میں حسد نہ کرو۔

حقیقتِ حسد کسی شخص کی اچھی حالت کا ناگوار گزرنا اور یہ آرزو کرنا کہ یہ اچھی حالت اس کی زائل ہو جائے (یہ حسد ہے) اس کے تین[4] درجے ہیں۔ ایک تو کیفیتِ انسانیہ ہے جس میں انسان معذور ہے ایک اس کے مقتضا پر عمل ہے کہ اس میں انسان ماز ور (یعنی گنہگار) ہے ایک اس کے مقتضا کی مخالفت ہے اس میں انسان ماجور (یعنی ثواب پانے والا) ہے۔

---

[1] نجات کا طریقہ صہ ۱۶ [2] تعلیم الدین صہ ۸۲ [3] تعلیم الدین صہ ۸۱ [4] انفاسِ عیسیٰ صہ ۱۹۹

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "میرے بندہ پر نعمت دیکھ کر حسد کرنیوالا گویا میری اس تقسیم سے ناراض ہے جو میں نے اپنے بندوں میں فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے"۔ البتہ ایسے شخص پر حسد کرنا جائز ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمت کو ظلم یا معصیت میں خرچ کر رہا ہو۔ مثلاً مالدار ہو اور شراب و زنا کاری میں اڑا رہا ہو۔ لہٰذا ایسے شخص سے مال چھن جانے کی آرزو کرنا گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں درحقیقت مال کی نعمت کے چھن جانے کی تمنا نہیں ہے بلکہ اس فحش و معصیت کے بند ہو جانے کی آرزو ہے۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ اگر وہ شخص معصیت چھوڑ دے تو اب اس نعمت کے جاتے رہنے کی آرزو بھی نہ رہے۔

حسد کا باعث عموماً یا تو تکبر و غرور ہوتا ہے یا عداوت و خباثت نفس، کہ بلا وجہ خدا کی نعمت میں بخل بھی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح میں کسی کو کچھ نہیں دیتا اسی طرح حق تعالیٰ بھی دوسرے کو کچھ نہ دے۔ البتہ دوسرے کو نعمت میں دیکھ کر حرص کرنا اور چاہنا کہ اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے اور مجھے بھی ایسی ہی حاصل ہو جائے۔ غبطہ (اور رشک) کہلاتا ہے۔ اور غبطہ شرعاً جائز ہے۔

حسد قلبی مرض ہے۔ اس میں دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے کیے ہوئے نیک اعمال ساقط ہو جاتے ہیں۔ نیکیاں چلی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ کے غصہ کا نشانہ بنا ہوا ہے اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا اور اسی فکر میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو ذلت و افلاس نصیب ہو۔ اس طرح عذاب آخرت بھی سر رکھا اور اپنی قناعت و آرام کی زندگی کو رخصت کر کے ہر وقت کی خلش اور دنیوی کوفت خریدی۔

طریق کار اور علاج

حسد کا مقصود تو یہ ہے کہ محسود (یعنی جس پر حسد کیا جائے اس) کی عیب جوئی کریں۔ اور رنج و غم کے گھونٹ رات دن پئیں۔ لہٰذا نفس پر جبر کریں اور قصداً اس کے منشا کی مخالفت کر کے اس کی

ضد پر عمل کریں یعنی محسود کی تعریفیں بیان کریں۔ گو نفس[1] کو ناگوار ہو۔ مگر زبان پر تو اختیار ہے اس کے ساتھ نیازمندی کے ساتھ ملاقات و کلام کریں اور اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کریں۔ اس کے سامنے بھی اور دوسروں کے سامنے بھی۔ کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کریں۔ اس سے اعراض کو دل چاہے تو اس سے ملیں اگر وہ سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کریں۔ اس کو ابتدا بالسلام کریں اس کے ساتھ[2] احسان، سلوک اور تواضع سے پیش آئیں۔ ان معاملات سے اس شخص کے قلب میں تمھاری محبت پیدا ہوگی پھر وہ تم سے اسی طور سے پیش آوے گا۔ اس سے تمھارے دل میں اسکی محبت پیدا ہوگی۔ اور حسد جاتا رہے گا۔

دسویں[10] فصل۔ ریاء کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

یُرَآءُوْنَ النَّاسَ[3] الآیہ — وہ لوگوں کو دکھلاتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ان یسیر الریاء شرک رواہ ابن ماجہ — بالتحقیق تھوڑی ریا بھی شرک ہے۔

حقیقتِ ریاء اللہ تعالیٰ کی طاعت میں یہ قصد کرنا کہ لوگوں کی نظر میں میری قدر ہو جائے (ریاء کہلاتی ہے) اس[4] کی حقیقت ارادۃ الخلق لغرض الدنیوی ہے۔ یعنی عبادت کا اظہار کسی دنیوی غرض سے کیا جاوے یا کسی فعل مباح کا اظہار کسی معصیت کی غرض سے کیا جاوے۔ اگر عمل میں دنیائے فاسد یعنی معصیت کی نیّت ہو تو وہ یقیناً ریا ہے اور اگر دنیائے مباح کی نیت ہو تو اگر عمل دنیوی ہے تو وہ ریاء نہیں اور اگر عمل دینی میں ہے تو وہ بھی ریا ہے اگر کسی شخص کو اس لیے راضی کیا جاوے تاکہ اس کے شر سے محفوظ رہیں تو یہ ریا نہیں۔

---

[1] انفاس عیسیٰ صـ ۱۲۱، [2] تعلیم الدین صـ ۸۱، [3] تعلیم الدین صـ ۸۱، [4] انفاس عیسیٰ صـ ۱۶۲۔

اور اگر مخلوق کو اس لیے راضی کیا جاوے تاکہ وہ ہمارے معتقد رہیں، ہمارے مرید زیادہ ہوں تو یہ ریا ہے کیونکہ یہ نیت معصیت ہے اس واسطے کہ عین عبادت کے وقت اس کی نظر مخلوق پر رہی، اور ان کی نظر میں معظم رہنا چاہا۔[1]

صوفیاء[2] نے کہا ہے ترک العمل للقوم ریاء (یعنی لوگوں کی وجہ سے کام نہ کرنا اور چھوڑ دینا ریا ہے) اور اہل ظاہر کہتے ہیں (العمل للقوم ریاء (یعنی لوگوں کو دکھلانے کے لیے کام کرنا ریا ہے) اور محققین کے نزدیک عبادت کے اخفار کا اہتمام کرنا بھی ریا ہے۔ کیونکہ اخفار عن الخلق (لوگوں سے چھپانے) کا اہتمام وہی کرے گا جس کی نظر مخلوق پر ہو۔ اور جس کی نظر مخلوق سے اٹھ جاوے اور اپنے سے بھی اٹھ جاوے کہ عبادت کو اپنا عمل نہ سمجھے بلکہ محض توفیق حق سمجھے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کام لے رہے ہیں میں خود کچھ نہیں کر سکتا وہ اخفار کا اہتمام نہ کرے گا کیونکہ جب وہ مخلوق کو لاشئ محض سمجھے گا تو ان سے اخفار کیوں کرے گا۔

ریا[3] کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عمل خیر کے ذریعہ سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو۔ اور یہ عبادت کے مقصود کے بالکل خلاف ہے کیونکہ عبادت سے مقصود حق تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ اور اب چونکہ اس مقصود میں دوسرا شریک ہو گیا کہ رضائے خلق اور حصول منزلت مقصود ہے۔ لہٰذا اس کا نام شرک اصغر ہے۔

ریا[4] چھ طرح سے ہوا کرتا ہے:۔

اول بدن کے ذریعہ سے مثلاً ضعف اور غنودگی ظاہر کی جائے تاکہ لوگ روزہ دار اور شب بیدار خیال کریں۔ یا مثلاً ایسی صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو آخرت کی بڑی فکر ہے۔ دین میں مشغول ہے۔

دوم[5] ہیئت کے ذریعہ سے۔ مثلاً رفتار یا آواز میں نرمی ظاہر کرنا۔ سر جھکانا، سجدہ کے نشان کا باقی رکھنا، اور ایسی صورت بنانا جس سے لوگ سمجھیں کہ حالت وجد میں ہیں یا مکاشفہ میں مشغول ہیں اور یا فکر کے اندر محو ہیں۔

لہ اشرف المسائل صد ۱۲۱ ۲ہ تبلیغ دین صد ۹۸۔

سوم (۳): شکل و شباہت اور لباس میں مثلاً صوف اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننا۔ پنڈلی تک پائینچہ چڑھانا۔ کپڑوں کا بوسیدہ اور میلا کچیلا رکھنا۔ تاکہ لوگ صوفی سمجھیں حالانکہ تصوف سے اتنے کورے ہیں کہ اس کی حقیقت بھی نہیں جانتے۔ یا چوغہ یا ڈھیلی آستینوں کا جبہ پہننا۔ تاکہ لوگ عالم سمجھیں۔ بعض لوگ امیروں اور تاجروں میں وقعت پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ اگر پھٹے پرانے کپڑے پہنے تو امرا کی نظروں میں وقعت نہ رہے گی اور اگر لباسِ فاخرہ پہنا تو لوگ زاہد اور صوفی نہ سمجھیں گے۔ لہٰذا وہ بیش قیمت کپڑوں کو گیروا یا آسمانی (یا سبز وغیرہ) رنگ کا رنگوا لیتے ہیں۔ اگر ان کی قیمت دیکھئے تو شاہانہ لباس کے برابر ہے اور رنگ و روپ درویشانہ اور صوفیانہ ہے۔ اس طرح اپنا مطلب حاصل کرتے اور ریا کار بنتے ہیں۔

چہارم (۴): گفتگو اور زبان سے ریا کیا جائے۔ جیسا کہ بعض دنیا دار واعظ مقفّٰی اور مسجع عبارتیں بنا بنا کر سلف صالحین کی نقل اتارتے اور محض دکھلاوے کی غرض سے کبھی آواز کا لہجہ پتلا بناتے ہیں اور کبھی غمگین۔ کہ دل میں تو خاک بھی اثر نہیں۔ مگر بناوٹ اور تصنع یوں بتا رہا ہے کہ بڑے عالم اور صوفی ہیں۔ اسی طرح مثلاً حفظ حدیث اور مشائخ اور علمائے زمانہ سے ملاقات کا دعویٰ اور اظہار کرنا۔ یا مثلاً کسی حدیث کے متعلق صحیح یا ضعیف ہونے کا جلدی سے حکم لگا دینا۔ تاکہ لوگ محقق اور محدث سمجھیں۔ یا بدکاری اور معصیت کے تذکرے پر زبان سے آہ اور ہائے افسوس کے کلمے نکالنا، یا خلافِ شرع باتوں سے نفرت ظاہر کرنا اور کڑھنا۔ حالانکہ ان کے دل میں رنج یا نفرت کا اثر نام کو بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ محض اس غرض سے ہوتا ہے کہ لوگ ان کو پارسا اور اللہ والا متبعِ شریعت سمجھیں۔

پنجم (۵): عمل میں ریا۔ مثلاً قیام، رکوع و سجدہ میں دیر تک رہنا سر جھکانا تاکہ لوگ عابد و زاہد سمجھیں حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دل ان خوبیوں سے بالکل کورے اور خالی ہیں۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ جب اکیلے نماز پڑھتے ہیں تو تھوڑا سا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کو معلوم کر لیں کہ وہ ان کی نماز کو دیکھ رہا ہے تو فوراً آہستگی اور وقار کے ساتھ نماز کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے لگتے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والا سمجھے کہ ان کی نماز خشوع اور خضوع سے بھری ہوئی ہے۔

ششم :۔ اپنے شاگردوں اور مریدوں کی کثرت کا اور مشائخ کا بکثرت تذکرہ کرنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کی بڑے بڑے مشائخ سے ملاقات ہوئی ہے۔ بعض لوگ اس کے خواہاں ہوتے ہیں کہ امراء و علماء ان کی زیارت کو آنے لگیں تاکہ اس کی شہرت ہو جاوے۔ یہ سب دین میں ریاکاری ہے اور ریا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔[۱]

نیک عمل کے دیکھنے پر جو دل خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو طبعاً جی خوش ہوتا ہے کہ الحمدللہ۔ اس شخص نے مجھ کو اچھی حالت میں دیکھا۔ یہ خوش ہونا ایسا ہے جیسا لذیذ کھانا کھانے سے جی خوش ہوتا ہے۔ طبیعت کا مقتضا ہے کہ اچھی شے سے خوشی ہوتی ہے۔ غرض یہ فرحت تو آثارِ طبعیہ میں سے ہے۔ اس کے ازالہ اور رفع کی قدرت نہیں۔ ایسے خوش ہونے میں ملامت نہیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرے کے دیکھنے سے اس لیے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نیک اعمال دیکھنے سے اس کو بھی توفیق ہوگی اور اس کا ثواب ہم کو بھی ملے گا۔ یہ خوشی بھی مذموم نہیں۔ اسی واسطے بزرگوں کا قول ہے ریاءُ الشیخ خیر من اخلاص المرید۔ (یعنی شیخ کا اظہار مرید کے اخلاص سے بہتر ہے۔) یہاں ریا بمعنی لغوی ہے اصطلاحی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیخ کا اظہار چونکہ موجبِ نفع متعدی ہے کہ دوسرے دیکھ کر اقتدا کرتے ہیں پس اس مقصد سے خوشی ہو تو یہ خوشی عبادت ہے۔ تیسرے خوشی اظہارِ عبادت پر اس لیے ہوتی ہے کہ ہماری نیک نامی ہوگی اور لوگ ہمارے معتقد زیادہ ہوں گے۔ یہ ریا ہے اور مذموم ہے۔

حاصل یہ[۲] ہے کہ کسی عمل دینی کو لوگوں کی نظر میں بڑائی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دے۔ چونکہ یہ بھی کبر و عجب ہی سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس میں بھی سب وہی درجات و اقسام و احکام ہیں۔ (جو تکبر میں بیان ہوئے)۔

حدیث[۳] شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کو جزا، سزا اور انعامات فرمائے گا تو ریاکاروں کو حکم دے گا کہ انھیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو نمازیں پڑھتے اور عبادتیں کرتے تھے۔ دوسری طویل حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن احکم الحاکمین کی عدالت

---

[۱] دعواتِ عبدیت ج ۱ صـ۱۰۸۰۱۰۷ [۲] شمس الفضائل صـ۱۱ [۳] تبلیغِ دین صـ۶۷

ہیں غازی، عالم، اور سخی کی پیشی ہوگی اور تینوں اپنے جہاد فی سبیل اللہ، تعلیم و تعلم اور مشغلۂ علمِ دین اور اپنی خیرات و صدقات کا اظہار کریں گے۔ حکم ہوگا کہ یہ سب اعمال تم نے چونکہ محض دکھاوے اور نام کے لیے اسی غرض سے کیے تھے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص غازی ہے۔ فلاں شخص بڑا عالم ہے۔ فلاں شخص بڑا سخی ہے۔ سو یہ باتیں حاصل ہو لیں کہ دنیا میں شہرت حاصل ہوئی اور لوگوں نے تم کو غازی، عالم اور سخی کہہ کر پکارا۔ پھر جس مقصود کے لیے اعمال کیے تھے۔ جب وہ حاصل ہو چکا تو ثواب کیا استحقاق رہا۔ اور یہاں کیا چاہتے ہو۔ لہٰذا جاؤ جہنم میں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جس عمل میں ذرہ برابر بھی ریا ہوگا۔ اس کو حق تعالیٰ ہرگز قبول نہ فرمائے گا۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بگوش ہوش سنو اور عبرت پکڑو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص (نفل) روزہ رکھے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے سر اور داڑھی اور ہونٹوں کو تیل سے چکنا کر لیا کرے۔ تاکہ لوگ اس کو روزہ دار نہ سمجھیں۔ اور خیرات کیا کرے تو اس طرح کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔" اسی لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جو اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا تنبیہہ کے طور پر یوں فرمایا تھا کہ "میاں گردن اوپر اٹھاؤ۔ خشوع قلب سے ہوا کرتا ہے نہ کہ گردن سے۔"

طریقِ کار اپنی طرف[1] سے نہ اظہار کا قصد کریں نہ اخفار کا۔ اپنے کام سے کام رکھیں۔ اپنے اختیار[2] سے ہر کام میں رضائے حق کا قصد کریں اور اپنے اختیار سے رضائے خلق کا قصد نہ کریں۔ بلا قصد کے اگر رضائے خلق کا وسوسہ یا خیال آئے تو اس کی مطلق پرواہ نہ کریں۔ عمل[3] سے پہلے مراقبہ و محاسبہ کرتے رہیں کہ اس میں میرا کیا قصد ہے۔ آیا مذموم ہے یا محمود ہے۔ اور اپنے کو کسی طبیبِ حاذق (یعنی مرشدِ کامل) کے سپرد کر دیں۔ جو کچھ وہ تجویز کرے خواہ سمجھ میں آوے یا نہ آوے۔ اسی کی رائے کا اتباع کریں۔

طریقِ علاج حُبِّ[4] جاہ کو دل سے نکالیں۔ کیونکہ ریا اسی کا ایک شعبہ ہے۔ اور عبادت پوشیدہ کریں۔ یعنی جو عبادت کہ جماعت سے نہیں اور جس عبادت

---

[1] ملفوظات صہ ۴۳ [2] انفاسِ عیسیٰ صہ ۱۶۴ [3] دعوات عبدیت صہ ۱۱۴ ج ۱ [4] تعلیم الدین صہ ۸۳

کا اظہار ضروری ہے۔ اس کے ازالہ کے لیے ازالۂ حب جاہ کافی ہے۔ اور طریق معالجے کا یہ ہے کہ جس عبادت میں ریا ہو۔ اس کو خوب کثرت سے کریں۔ پھر نہ کوئی التفات کرے گا نہ اس کو یہ خیال رہے گا وہ چند روز میں ریا سے عادت، پھر عادت سے عبادت اور اخلاص بن جاوے گی۔

گیارھویں[11] فصل شہوت (یعنی خواہشاتِ نفسانی) کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔[2]

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى۔ الآیۃ

اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا پس تحقیق اس کے لیے جنت ٹھکانہ ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

واما المهلكات فهوى متبع ، رواه البیہقی۔

رہے مہلکات سو وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے۔

حقیقتِ شہوت

(خلاف شریعت امور کو پسند کرنا شہوت یا خواہش نفسانی ہے) اس[1] کا جو اعلیٰ درجہ ہے یعنی کفر اور شرک وہ تو اسلام ہی سے خارج کر دیتا ہے اور جو ادنیٰ درجہ ہے۔ وہ کمالِ اتباع سے ڈگمگا دیتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں اوّل بدعت، جو علوم اور عقائد کے متعلق ہے۔ دوسری[2] معصیت جو اعمال کے متعلق ہے۔ تیسری قسم رائے جو احکامِ تکوینیہ کے متعلق ہے۔ اور ہر ہوا (یعنی خواہشِ نفسانی) میں یہ خاصیت ہے کہ راہِ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ الآیۃ

اور خواہشاتِ نفسانی کا اتباع مت کر۔ یہ تو اللہ کے راستہ سے بے راہ کر دے گی۔

---

[1] ذم الہوی صد ۲۶ ، [2] وعظ میرٹھ صد ۱۲

باہوائے آرزو کم باش دوست — چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست
تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست — چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست
تازہ کن ایماں نہ از گفت زباں — اے ہوا را تازہ کردہ، درنہاں[1]

خواہشِ نفسانی ایسی بُری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صدہا معصیتیں ہیں۔ جملہ شروں کی جڑ اگر ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے۔ یہی روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر نفس کو روکا نہ جائے تو کیا انجام ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو سب نے سمجھا ہے حتیٰ کہ حاکم جس کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جن کو لوگ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نزدیک باعثِ مضرت ہیں۔ دنیاوی مصلحتوں کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو۔ ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے۔ چوروں کو چوری کرنے دے۔ زبردستوں کو زیردستوں پر ظلم کرنے دے۔ غرض ہر شخص کو مخلی بالطبع کردے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہوگی۔ قانون کیا ہے۔ ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے۔ فرض کرو کسی کو روپیہ کی ضرورت ہے کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے تو اس کو کیوں منع کرتے ہو اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مضرت ہے کہ اس کے مقابلہ میں ضرورت کا خیال بھی نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح دنیاوی انتظاموں کو دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہشِ نفسانی روکنے کی چیز ہے۔

دیکھئے نافرمانی ہوتی کیوں ہے اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد خواہش نفسانی کے ہوگا۔ فرض کیجئے نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہوا کہ نیند آرہی تھی۔ عشا کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا۔ سوکر صبح کردی یہ آرام اور تن پروری، خواہش نفسانی ہی ہے۔ تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی کسی دوسرے کام میں لگا ہوا ہو۔ اس کے آدھ بیچ میں رہ جانے سے نقصانِ مال کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس نقصان کو گوارا نہ کیا اور نماز میں تاخیر کردی، یہ حبِ مال ہے کہ منجملہ خواہشات نفسانی ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جبھی ہوگی کہ دوسری طرف

---

[1] وعظ میرٹھ ص ۱۶، ۳۰۔

توجہ ہو۔ توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نفس ہی کی خواہش سے ہوتا ہے۔ غرض کسی نے ترکِ طاعت کیا یا ارتکابِ معصیت، تو صرف نفسانی خواہش سے اس کے اندر سبھی کچھ ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ [1] — شریعت کا اتباع کیجئے اور ان جاہلوں کی

الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ الآیہ۔ — خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔

اس آیت میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں اور ہوائے نفسانی ہیں لَا يَعْلَمُوْنَ کا مفعول ذکر نہیں فرمایا بلکہ یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ خواہشات اس لیے مذموم ہیں کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل جاہل ہیں۔

طریقِ کار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لا یؤمن احدکم حتی [2] — کوئی شخص مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ اسکی

یکون ھواہ تبعا لما — خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جس کو میں

جئت بہ — حق تعالیٰ کے پاس سے لایا ہوں۔ یعنی

(الحدیث) — شریعت۔

(لہٰذا) ہمہ تن اپنی خواہشوں کو شریعت کے تابع بنائیں۔ عقائد ہوں تو شریعت کے موافق۔ اور (اعمال، اخلاق، معاشرت اور) معاملات کی اصلاح کریں۔ (کہ سب شریعت کے تابع ہوں۔ ہر) [3] ہر چیز میں خیال رکھیں کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں جب اس پہ کوئی مخالفت کرے گا تو ممکن نہیں کہ معصیت اس سے ہو سکے۔ تھوڑے دنوں عادت ڈال لنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کریں کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے یا نہیں۔ اگر لذت آتی ہے تو سمجھ لیں کہ یہ ضرور ایک فردِ معصیت ہے پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جائیں اور اس کی مضرت کو پیشِ نظر رکھیں۔ نفس کو خواہشات سے روکیں۔ مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے۔ جب سبب جاتا رہے گا مرض بھی نہ رہے گا۔ جو کام کیا جائے پہلے سوچ لیا جائے کہ

---

[1] الشریعت ص۳۷، [2] منازعۃ الہوی ص۳۰۰، [3] وعظ میرٹھ ص۱۷ تا ۳۹ ملخصاً۔

یہ کام حق تعالیٰ (کی مرضی) کے خلاف تو نہیں اور یہ میرے لیے مفید ہے یا مضر (نیز) اس کے ترک کے لیے خوف معین ہے (اسلیئے خوفِ الٰہی کی تحصیل ضروری ہے۔)

طریقِ علاج مجاہدہ[۱] کرنا چاہیئے۔ اس کا طریق مجاہدہ کے بیان میں معلوم ہو چکا۔

بارھویں[۱۲] فصل عجب کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ[۲] كَثْرَتُكُمْ الآیۃ — جب کہ تم کو تمہارا زیادہ ہونا بھلا معلوم ہوا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

واما المھلکات فھوی متبع وشح مطاع واعجاب المرء بنفسه وھی اشدھن رواہ البیھقی۔ — رہے مہلکات سو وہ خواہش ہے جس کی پیروی کی جائے اور بخل ہے جس کے موافق عمل کیا جائے اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا۔ اور یہ سب سے بڑھ کر ہے۔

حقیقتِ عُجب اپنے کمال کو اپنی طرف نسبت کرنا۔ اور اس کا خوف نہ ہو کہ شاید سلب ہو جائے (یہ عجب ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ)[۳] نفس کا ایک خفی کید یہ ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ممتاز ہو کر رہے اور اس میں اس کو حظ آتا ہے سو یہ عجب ہے۔ اور عجب ایسی بری چیز ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہوتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ البتہ[۴] اگر اللہ کی نعمت پر خوش ہووے اور اس کے چھن جانے کا خوف بھی دل میں رکھے اور اتنا سمجھے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے فلاں علم یا عمل کے سبب مجھ کو مرحمت فرمادی ہے اور وہ مالک و مختار ہے جس وقت چاہے اس کو مجھ سے لے لے تو یہ خود پسندی (اور عجب) نہیں ہے۔ کیونکہ خود پسند شخص نعمت کا منعمِ حقیقی کی جانب

---

[۱] تعلیم الدین صنہ [۲] تعلیم الدین صنہ [۳] کمالات اشرفیہ ص۱۱۱ [۴] تبلیغ دین ص۶۶

منسوب کرنا ہی بھول جاتا ہے اور جملہ نعمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔

عجب[1] میں صرف ایک قید کم ہے۔ یعنی اس میں دوسروں کو چھوٹا سمجھنا نہیں صرف اپنے کو بڑا سمجھنا ہے۔ باقی سب اجزاء وہی ہیں (جو تکبر کے ہیں) اس میں بھی حقیقت اور صورت کے ویسے ہی درجے اور وہی احکام (اور طریق کار ہے)۔

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اور اتراتا ہوا چلتا ہے۔ وہ قیامت کے روز خداوند کریم سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ (مسند احمد)

طریقِ علاج اس کمال[2] کو عطائے خداوندی سمجھے اور اس کی استغناء اور قدرت کو یاد کر کے ڈرے کہ شاید سلب ہو جائے۔

تیرھویں[13] فصل غضب کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَالْكَاظِمِينَ[3] الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ	اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی تقصیرات) سے درگذر کرنے والے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے نکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے
الآیہ	

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لَا[4] تغضب — رواہ البخاری — غصہ مت کرو۔

حقیقتِ غضب خونِ قلب کا بدلہ لینے کے لیے جوش مارنا (غضب ہے۔ اس کے درجات، شریعت اور اخلاق کے بیان میں ملاحظہ ہوں)۔

---

[1] کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۸۵ [2] تعلیم الدین صفحہ ۸۴ [3] بیان القرآن صفحہ ۵۸ ج ۲ [4] تعلیم الدین صفحہ ۸۱

رسول[1] اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بڑا پہلوان (اور طاقتور) وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑے۔ بلکہ قوی اور پہلوان) وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ ایک روایت میں ہے۔ قوی وہ ہے جو غصہ[2] کا مالک ہو (یعنی غصہ پر غالب ہو۔ یہ نہ ہو کہ غصہ کے منشا کے مطابق فوراً عمل کرے بلکہ اس کو شریعت کی تعلیم کے موافق استعمال کرے۔ اس لیے کہ) غصہ میں جوش پیدا ہونا طبعی امر ہے۔ اس میں ملامت نہیں مگر انسان کو خداوند کریم نے اختیار بھی دیا ہے۔ اس کو روکنا چاہیئے۔ اس اختیار کو صرف نہ کرنا، انسانیت کے خلاف ہے۔ غصہ کو بھی حق تعالیٰ نے بہت سی مصلحتوں سے انسان کی سرشت میں داخل کیا ہے۔ اس سے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ لیکن اختیار کو بھی ساتھ ساتھ رکھ دیا ہے۔ کہ جس جگہ غصہ کا کام (شرعاً موزوں) ہو وہاں کام لے اور جو جگہ غصہ کے کام کی نہیں وہاں کام نہ لے۔

غصہ[3] فی نفسہ غیر اختیاری ہے لیکن اس کے اقتضاء پر عمل کرنا اختیاری ہے اس لیے اس کا ترک بھی اختیاری ہے۔ اور اختیاری کا علاج بجز استعمالِ اختیار کے کچھ نہیں۔ گو اس میں کچھ تکلف و مشقت بھی ہو۔ اسی استعمال کے تکرار و مداومت سے وہ اقتضاء ضعیف ہو جاتا ہے اور اس پر ترک میں زیادہ تکلف نہیں ہوتا۔ البتہ اس اختیار کے استعمال میں کبھی قدرے تکلف ہوتا ہے۔

طریقِ کار

حدیث[4] شریف میں ہے لَا یَقْضِیَنَّ قَاضٍ بَیْنَ اِثْنَیْنِ وَھُوَ غَضْبَانَ یعنی حاکم کو چاہیئے کہ غصہ کی حالت میں فیصلہ کبھی نہ کرے بلکہ اس وقت مقدمہ ملتوی کر دے اور تاریخ بڑھا دے۔ یہاں حاکم سے مراد وہ شخص ہے جس کی دو آدمیوں پر حکومت ہو۔ اس میں معلم، استاد اور گھر کا مالک بھی شامل ہے (لہٰذا غصہ میں بچوں یا دیگر ماتحتوں اور کمزوروں کو کسی جرم پر بھی سزا دینے میں جلدی نہ کریں) بلکہ غصہ فرو ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دی جانے اور یاد رکھیں کہ جس حق کا مطالبہ کرنیوالا کوئی نہ ہو

---

[1] غوائل الغضب ص۳ [2] انفاسِ عیسیٰ ص۱۶۷ [3] کمالات اشرفیہ ص۸،
[4] انفاسِ عیسیٰ ص۱۶۹، ۱۶۷، ۱۶۸ ملخصاً۔

اس کا مطالبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا یہاں تک کہ اگر کافر ذمی پر کوئی حاکم ظلم کرے تو حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف سے مطالبہ کریں گے (لہٰذا سزا دینے کے وقت احتیاط لازمی ہے)۔

اگر طبعی طور پر غصہ زیادہ ہو۔ اور ذرا سی بات پر حد سے زیادہ غصہ آجاتا ہو کہ اس وقت عقل نہ رہتی ہو تو جس پر غصہ کیا جاوے ۔ بعد غصہ فرو ہو جانے کے مجمع میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں، پاؤں پکڑیں۔ بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر رکھ لیں ۔ ایک دو بار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آ جائے گی ۔ قول یا فعل میں ہرگز تعجیل نہ کریں تبکلف اس تقاضے کی مخالفت کریں ۔ جب کوتاہی ہو جائے استغفار کریں ۔ اور اگر کسی شخص کے حق میں زیادتی و تجاوز حدود شرعی سے ہوگیا ہو تو اس سے معاف کرائیں ۔ زبان سے اعوذ باللہ پڑھیں ۔ اگر کھڑے ہوں تو بیٹھ جائیں ۔ جو بیٹھے ہوں تو لیٹ جائیں اور ٹھنڈے پانی سے وضو کر ڈالیں ۔ ٹھنڈا پانی پی لیں ۔ فوراً کسی کام میں لگ جائیں۔ بالخصوص مطالعۂ کتب میں ۔ اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو اس شخص سے علیحدہ ہو جائیں یا اسکو علیحدہ کر دیں ۔ جیسا موقع ہو ۔

طریقِ علاج

یہ[1] یاد کریں کہ اللہ تعالیٰ کی مجھ پر زیادہ قدرت ہے اور میں اسکی نافرمانی بھی کیا کرتا ہوں ۔ اگر وہ بھی مجھ سے یہی معاملہ کریں تو کیا ہو اور یہ سوچیں کہ بدوں ارادۂ خداوندی کے کچھ واقع نہیں ہوتا ۔ سو میں کیا چیز ہوں کہ مشیتِ الٰہی سے مزاحمت کر دوں ۔

۵ ۔ ثمرۂ اعمال

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔

مَنْ[2] عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ — جو شخص نیک کام کرتا ہے سو اپنے ذاتی نفع کے لیے اور جو شخص برا کام کرتا ہے اس کا

---

[1] ا مبر، ۱۶ بزہ ص۸۱ ۔ [2] بیان القرآن ص۱۵ ج ۱۰ ۔

اِلٰی رَبِّکُمْ تُرْجَعُوْنَ ۔الآیہ وبال اسی پر پڑتا ہے پھر تم کو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

پس وہاں اخلاق اور اعمالِ حسنہ کا نعم البدل (انعام) اور معاصی پر بئس العوض (عذاب) دیا جاویگا۔ یعنی[1] ہر شخص کو اس کے اعمال کا ثمرہ ملے گا۔ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ بدون سعی کے حصول (مقصود) کا وعدہ نہیں۔ دین کے کاموں کے لیے سعی کرنی چاہیئے کیونکہ مقصود[2] کا حاصل دو امر ہوتے ہیں۔ ایک مضرات سے بچنا اور دوسرا منافع کا حاصل ہونا۔ چنانچہ ساری دنیا کی کوششیں کسی مقصود کے حاصل کرنے میں اسی واسطے ہوتی ہیں کہ تکلیفوں سے بچا جائے اور راحت کو حاصل کیا جاوے اور ہر کام میں یہی قاعدہ ہے۔ اس ثمرہ کی بنا اعمال پر ہے تو جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی ثمرہ ہوگا۔ پس اعمال کی تکمیل کا اہتمام کریں تاکہ ثمرہ کامل میسر ہو (اور یہ یاد رکھیں کہ) طلب[3] مقصود ہے حصول مقصود نہیں۔ کام کرتے وقت صرف کام کا خیال رکھنا چاہیئے اگر کام کرتے وقت ثمرہ کی طرف بھی توجہ ہے تو خود وہ کام بھی ٹھیک طور پر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے بی اے کا امتحان دیا گو امتحان دینے سے اس کا مقصود نوکری ہے لیکن باوجود اس کے عین امتحان دیتے وقت وہ اس کا خیال بھی اپنے قلب میں نہیں لاتا بلکہ ہمہ تن امتحان کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اگر امتحان دیتے وقت وہ نوکری کا خیال جما کر بیٹھے تو امتحان میں گڑبڑ مچ جائے گی تو مقصود کی طرف توجہ ہونا چاہیئے نہ کہ غیر مقصود کی طرف۔ مقصود کے معنی ہیں قصد کیا گیا۔ تو قصد اختیاری چیز کا ہوتا ہے اور کام اختیاری کا ہے اور ثمرہ مثلاً نوکری غیر اختیاری۔ تو مقصود کام ہوا پس کام کیئے جائیں۔ البتہ حصول ثمرہ کے واسطے دعا کریں کہ ثمرہ کی بھی حاجت ہے۔

---

[1] التکمال فی الدین صد ۲ ، [2] الاسلام الحقیقی صد ۴۸۰ ، [3] القول الجلیل صد ۳۹ ،

باب اوّل ۔ ثمرہ من العبد یعنی عبدیت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۔ الآیہ

اور جن اور انسان کو میں نے صرف اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں ۔

حقیقتِ عبدیت

ایمان و عمل[1] کے کمال کا نام عبدیت یا غلامی ہے ۔ یعنی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو بے چون چرا ماننا اور کرنا اور اس کی رضا اور خوشی میں اپنی خوشی و خواہش و مرضی کو فنا کر دینا) بلکہ اگر غور کیا جائے تو خدا کے ساتھ تو ہم کو حقیقی غلامی کا تعلق ہے ۔ انسانی غلامی سے تو آدمی آزاد بھی ہو سکتا ہے برخلاف خدا کی غلامی کے ۔ کہ اس کا طوق ہماری گردن سے کبھی نہیں نکل سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی صورت یہی ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے ۔

انسان کو جس بات کے حاصل کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ یہی عبدیت کی حالت ہے یعنی دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اوامر اور نواہی کو پورا کر کے عبدیت حاصل کرے (اور اوامر و نواہی کا تعلق ہی زیادہ تر افعال و اعمال سے ہے ۔ خواہ وہ اصطلاحی عبادات ہوں یا معاملات و معاشرات و اخلاق سب کو پورا کرنا ہی عبدیت یا بندگی ہے) اور[2] کمالِ عبدیت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور حق تعالیٰ جو تصرف اس کے اندر کرے اس پر راضی رہے ۔

علیٰ[3] ہذا عبد کی حیثیت سے ہم کو اوامر و نواہی کے اسرار و مصالح معلوم کرنے کا حق بھی نہیں نہ اس کی فکر میں پڑنا چاہیئے ۔ بس جو حکم ہو بے چون و چرا ماننا اور پورا کرنا اور اسی کو عین حکمت و مصلحت جاننا چاہیئے بلکہ اگر خلاف مصلحت بھی ہو تب بھی دم مارنے کی گنجائش نہیں ۔ کیونکہ ہم عبد یا غلام ہیں ۔

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۱۹۸ [2] انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۲۵ [3] تصوف و سلوک صفحہ ۱۹۹، ۲۰۱، تا ۲۰۵ ملخصا

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ پر اشکال کیا گیا کہ جن وانس کی تخصیص کی کیا وجہ، عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک نوکر ہے ایک غلام ہے۔ نوکر کا کام معین ہوتا ہے خواہ ایک یا متعدد۔ مثلاً باورچی کے لیے کھانا پکانے کی خدمت معین، یا مکان پر بازار اور گھر کے کام کے لیے کوئی نوکر ہے تو جس خدمت کے واسطے یہ نوکر ہیں ان سے وہی خدمت لی جا سکتی ہے۔ خود آقا بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آقا باورچی سے کہے کہ یہ خط لیکر گنگوہ (یا کسی دوسرے شہر) چلے جاؤ تو نوکر (باورچی) ضابطہ سے انکار کر سکتا ہے۔

اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں۔ تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں جس کا حکم ہو جائے چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک وقت میں آقا کی وردی پہن کر آقا کا قائم مقام ہو کر جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ غرض غلام کو کسی وقت کسی خدمت سے بھی انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح جن وانس کے سوا تمام مخلوق کی طاعت معین ہے۔ ہر شے مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر مقرر ہے کہ اس کے سوا اس سے دوسرا کام نہیں لیا جاتا مگر انسان کی کوئی خدمت مقرر نہیں۔ چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے اور ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے۔ مثلاً جماعت تیار ہے اور پاخانہ کا عذر ہو تو اس وقت پیشاب وغیرہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا ممنوع ہے اس وقت بیت الخلاء جانا ہی عبادت ہے۔ ایک تو یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ مظہر حق بنا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔ غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی انسان کی ہے۔ عبد شدن کے لیے انسان ہی ہے باقی تمام مخلوق ذاکر وشاغل ہے مگر عابد صرف انسان ہے (لہٰذا اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ) یہ کسی خاص حالت اور کسی خاص کام کو اپنے لیے تجویز نہیں کر سکتا۔ بلکہ حضرت حق جس حالت میں بھی رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہیئے۔ کمبل اڑھائیں تو کمبل اوڑھے۔ دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے۔ بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے۔ گھی کھلائیں تو گھی کھائے۔ یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔

غرض تفویض کلی عبدیت ہے اور اپنی تجویز سے امتیازی شان بنانا عبدیت کے بالکل

خلاف ہے۔ مثلاً جب حق تعالیٰ کھانے پینے کو اچھا دیں۔ اس وقت خستہ حالت میں رہنا ناشکری، نعمت کی بے قدری اور خلافِ اطاعت ہے۔ کیونکہ جیسے شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے نوکروں کو تنخواہ دو۔ کھانا کپڑا دو۔ ویسے ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو بھی راحت دو۔ پس جیسے نوکر خدا کی مخلوق و مملوک ہے۔ تمہاری جان بھی خدا کی مخلوق و مملوک ہے۔ اس لیے تم کو اپنے اندر بھی بدوں اجازت کسی تصرف کا حق نہیں۔ اگر نوکر کو حکمِ الٰہی سے کھانا کپڑا دیتے ہو تو اسی آقا کے حکم سے تم اپنی خدمت بھی کرو۔ کیونکہ تمہاری جان بھی خدا کی ہے۔ غرض عارف اسی اعتبار سے حقوقِ نفس ادا کرتا ہے کہ خدا کا کام کرے۔

طریقِ کار

اعتقادات، عبادات، معاملات، معاشرات اور اخلاق جملہ ضروریاتِ دین میں شریعت کے اصول کے مطابق عمل کریں اور یہی کمالِ عبدیت ہے۔

باب دوم ثمرہ من الحق

پہلی فصل رضائے الٰہی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ الآیۃ — اور اللہ کی رضا بڑی چیز ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رِضَاكَ وَجَنَّتَكَ ۔ الحدیث — اے اللہ ! میں آپ سے آپ کی رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں۔

حقیقتِ رضا حق تعالیٰ کو بندہ کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق ہوجانا جس کا خاصہ ایک خاص انجذاب ہے۔ جس کے لوازم میں سے سہولتِ اطاعت اور حضورِ دائم ہے اور یہ محض موہوب ہے۔ کیونکہ کسی عمل صالح میں یہ قابلیت نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کافی ہوسکے گو عادۃ اللہ یہ ہے کہ محض اپنے فضل سے اپنی رضا کو اعمالِ صالحہ پر مرتب فرمادیتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا۔ بلکہ حق تعالیٰ کے فضل سے جائے گا اور یہ نسبت مع اللہ عادۃً پھر کبھی زائل نہیں ہوتی۔ جیسے بالغ ہونے کے بعد صفتِ بلوغ کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اس مسئلہ کو صوفیہ نے بعنوان فنا تعبیر کرکے فرمایا ہے کہ الفانی لا یرد یعنی فانی و واصل کبھی مردود نہیں ہوتا۔ اگر یہ شبہ ہو کہ بعد وصول و حصولِ نسبت کے بھی تو معاصی کا صدور ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا ہے پھر رضائے دائمی کا تحقق کہاں رہا تو سمجھ لو کہ گہری دوستی کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی شکر رنجی بھی نہ ہو، گاہے گاہے شکر رنجی بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن تدارک کے بعد پھر ویسا ہی تعلق ہوجاتا ہے

---

۱ ، المسائل ۲ الفاس عیسیٰ ص ۹ ، کشتش

بلکہ دراصل اس خفگی کے زمانہ میں بھی دوستی کا اصل تعلق بدستور قائم رہتا ہے وہ زائل نہیں ہوتا شکر رنجی محض عارضی ہوتی ہے۔ مثلاً تکمیل صحت کے بعد ضرور نہیں کہ اس حالت میں کبھی زکام بھی نہ ہو یا کبھی اگر بد پرہیزی کرلے تو اس سے نقصان نہ ہو۔ بد پرہیزی سے نقصان ضرور ہوتا ہے لیکن محض عارضی تدارک کے بعد پھر وہی حالتِ غالبہ صحت کی عود آئے گی۔ یا مثلاً درسیات کے فراغ کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی کسی مقام پر اٹکے ہی نہیں کہیں کہیں بعد فراغ بھی اٹکتا ہے لیکن ذرا سی توجہ سے چل نکلتا ہے۔[1]

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ یہاں رضا کو اکبر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہی (رضا) بڑی چیز ہے۔ اس اکبر کی تحصیل کا ذریعہ بھی اکبر ہونا چاہیے فرماتے ہیں وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اور البتہ اللہ کا ذکر اکبر ہے) معلوم ہوا کہ وہ ذریعہ ذکر اللہ ہے اور تمام احکام پر عمل کرنے سے ذکر اللہ ہی مقصود ہے۔ جب[2] بندہ اعمال صالحہ اختیار کرتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی توجہ اس پر منعطف ہوتی ہے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے
الصّٰلِحٰتِ اِلٰى رَضِىَ اللّٰهُ	اچھے کام کیے ..... اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ الآیۃ۔	گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے۔

ان آیات میں رضا کو ایمان و اعمالِ صالحہ پر ہی مرتب فرمایا ہے۔

لہٰذا[3] اول بہ تکلف اعمال ظاہرہ و باطنہ کی اصلاح کرے۔ بالخصوص اعمالِ باطنہ کی اصلاح زیادہ اہم اور دشوار ہے۔ جب اعمال ظاہرہ و باطنہ پر معتد بہ مدت تک مواظبت رہتی ہے تو رفتہ رفتہ ان اعمال میں سہولت ہونے لگتی ہے اور ایک کیفیتِ راسخہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سہولت ہی کے لیے تمام مراقبات، ریاضات، مجاہدات، اذکار و اشغال مقرر کیے گئے ہیں۔ باقی اصل چیز اصلاحِ اعمالِ ظاہرہ و باطنہ ہی ہے جس پر نسبت حقیقی مرتب ہوتی ہے۔ جب بندہ اعمالِ صالحہ، ظاہرہ و باطنہ پر مداومت کرتا ہے تو حق تعالیٰ کو اس کے ساتھ رضائے دائمی کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور نسبت

---

[1] اشرف السائل ص۱۸۰ [2] تصوف و سلوک ص۲۱۱ [3] انفاسِ عیسیٰ ص۹۔

مع اللہ کی یہی حقیقت ہے۔ جب[1] تک عمل میں لگے ہو۔ رضا حاصل ہے اور جب رضا حاصل ہے تو سب کچھ ہے۔ چاہے وصال ہو یا نہ ہو۔ کیفیات ہوں یا نہ ہوں

طریقِ کار طاعات میں صرف خدا کو مطلوب سمجھیں۔ کیفیات کو ہرگز مطلوب نہ سمجھیں بلکہ جس کو وصال سمجھ رہے ہیں۔ اس پر بھی نظر نہ کریں کہ ہم کو یہ وصال میسر ہوگا یا نہیں۔ صرف عمل کو مقصود سمجھیں۔ ہمت سے اسی میں لگے رہیں اور زبان حال سے یوں کہتے رہیں ؎

بابم او را یا نہ یابم جستجوئے می کنم ‏ حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ‏ کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

اور ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ‏ ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

ارید وصاله ویرید هجری ‏ فاترك ما ارید لما یرید

دوسری[2] فصل قرب و وصول کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ ‏ آگے بڑھ جانے والے، آگے بڑھ جانے والے

اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔ الآیہ ‏ وہی تو مقربین ہیں ۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

مَن[3] تقرب الی شبرا تقربت ‏ جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے

الیہ ذراعا ومن تقرب الی ‏ میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری

---

[1] تعلیل الکلام ص۳۶ [3] الکمال فی الدین ص۶۷ ،

ذراعاً تقربت الیه باعاً ومن اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ او کما قال

طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں)

حقیقتِ قرب

قربِ[1] کے مختلف درجات ہیں۔ ایک قرب تو حقیقی ہے جس کا ترجمہ مل جانے سے کر دو یا ادراکِ حقیقت سے یا اسی کے ہم معنی جس لفظ سے چاہو کر دو۔ سو قربِ حقیقی تو کسی کو حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ حق تعالیٰ جسم اور مکان سے پاک ہیں تو مل جانے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے اور ادراکِ حقیقت بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ادراک، احاطہ کو چاہتا ہے اور بندہ ممکن ہے اور حق تعالیٰ واجب اور ممکن متناہی ہوتا ہے اور واجب لامتناہی۔ پھر لامتناہی کو متناہی کیسے محیط ہو سکتا ہے۔ اس لیے قرب باین معنی تو ہو نہیں سکتا کہ اتصال ہو جاوے یا ادراکِ حقیقت ہو جاوے اور ایک قرب مجازی ہے جس کا حاصل رفع[3] یا تقلیل حجب ہے اور (ان کے علاوہ) ایک قربِ[2] علمی ہے جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہر چیز کو حاصل ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (یا) نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ الآیۃ دوسرے[4] قرب تعلق خصوصیات، جیسے اردو میں ہم کبھی یوں کہتے ہیں کہ میں پاس ہوں کہو کیا کہتے ہو۔ یعنی سن رہا ہوں۔ اس میں تو پاس ہونے سے قرب علمی و قرب سماع کا بیان مقصود ہے اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ تم تو دور رہ کر بھی پاس ہی ہو۔ یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

وَمَآ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

اور تمہارے اموال و اولاد ایسی چیز نہیں جو تم کو ہمارا مقرب بنا دے۔ ہاں مگر جو ایمان لاوے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سبب

---

[1] السلام التحقیقی صہ ۶۵ [2] تصوف و سلوک صہ ۱۹۲ [3] الاصابہ صہ ۷ [4] حجابات کا اٹھ جانا یا کم ہو جانا۔

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ	قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لیے ان کے نیک
بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي	عمل کا دونا صلہ ہے اور وہ بہشت کے بالا
الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۔ الآیہ	خانوں میں چین سے ہوں گے ۔

اس[1] آیت میں قرب سے مراد قربِ رضا ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ۔ جو بعض کو حاصل ہوتا ہے ۔ قربِ علم مراد نہیں ، کیونکہ وہ مومن و صالح کے ساتھ خاص نہیں ۔ نیز اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک بڑی دولت ، (قرب) کا پتہ اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا ہے اور جو غلطیاں اس میں واقع ہوتی ہیں ۔ ان پر تنبیہ فرمائی ہے ۔ یعنی مال و اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ قرب کا ذریعہ نہیں ہو سکتے ۔ بلکہ اس کے ذرائع ایمان و عمل صالح ہیں اور ظاہر ہے کہ ایمان و عمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو ۔ کیونکہ ناقص (تو ادنیٰ سے ادنیٰ مومن کو بھی حاصل ہے وہ) پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور جو پورا پسندیدہ نہ ہو ۔ وہ پسندیدہ یا رضا کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے مطلب یہ کہ قرآن مجید کی رو سے جو قرب مطلوب ہے اور جس کو "اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ " میں انسانیت کا بلند ترین مقام قرار دیا گیا ہے ۔ وہ کمالِ ایمان یا بالفاظ دیگر کمالِ دین ہی کا نام ہوسکتا ہے اس لیے اگر اصطلاحاً علم احسان کی طرح تصوف کا دوسرا نام علم قرب رکھ لیا جائے تو مضائقہ نہیں ۔ بلکہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ اسلامی تصوف چونکہ نام ہی احسان یا کمال دین کا ہے اور اسی کمالِ دین کے درجہ کا قرآنی نام قرب ہے ۔ یعنی کامل ایمان و عملِ صالح یا کمالِ دین خصوصاً جب وہ امر طبعی کا سا حال بن جائے کہ دینی زندگی اور دینی احکام کی اطاعت طبیعت بن جائے اور زندگی کی ہر حرکت و سکون میں وہی بات بالطبع پسند ہو اور کرنے کو جی چاہے جو خدا اور رسول کو پسند اور اس کی مرضی ہو ۔

تو[2] اصل مقصود رضا ہے محض وصول مقصود نہیں ۔ یعنی جو وصول یا قرب حق تعالیٰ کی رضا کے ساتھ نہ ہو وہ مقصود نہیں (اس لیے کہ) قرب کبھی بصورت بُعد ہوتا ہے اور کبھی بصورت قرب ہوتا ہے ۔ اس کی مثال ہمارے معاملات دنیوی میں ایسی ہے کہ ایک شخص تو وہ ہے جو بادشاہ وقت

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۱۱۹ ۔ ۱۲۰ ۔ ۱۲۶ ، ۲۰۶ ملخصاً ۔ [2] اخلاص صفحہ ۹ ۔

سے دور ہے مگر بادشاہ نے اس کو کسی عہدۂ جلیل القدر اور خطابات سے نوازا ہے اور شب و روز شاہی عنایات والطاف اس پر متوجہ ہیں گو یہ شخص صورۃً بادشاہ سے بعید ہے مگر فی الحقیقت قریب ہے اور ایک وہ شخص ہے جو جرائم شاہی کا مرتکب ہے جس کی وجہ سے بادشاہ اس سے سخت ناراض ہے اور حکم ہے کہ اس کو جہاں پاؤ گرفتار کرلو۔ بسبب الحکم شاہی وہ بادشاہ کے روبرو حاضر کیا گیا پس یہ شخص گو ظاہراً قریب ہو مگر واقع میں یہ بعید و مردود ہے۔ [1] اسی طرح وصول وہی متصور ہے جو رضا کے ساتھ ہو۔

[2] قرب کی کوئی حد نہیں۔ ہر درجہ کے آگے بھی درجات ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قرب طبعاً محبوب ہے تو اس کا ہر درجہ محبوب ہے خصوصاً عشاق کو کہ وہ تو اگر جان لیں کہ قرب کے اور بھی درجات ہیں تو ان کو موجودہ حالت پر کبھی صبر نہیں ہو سکتا ؎

نہ گویم کہ برآب قادر نیند — کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

غرض زیادتِ قرب سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔

[3] تو اب سمجھیے کہ عالم ارواح میں قرب تو تھا۔ مگر ایک خاص حد تک ہی تھا۔ بڑھتا نہ تھا کیونکہ قرب جانبین کے تعلق سے بڑھتا ہے اور حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ ان کو بندہ کے ساتھ تعلق اس وقت بڑھتا ہے جب بندہ کی طرف سے طلب ہو اور طلب کی حقیقت ہے عمل۔ وہاں عمل تھا ہی نہیں۔ اس لیے قرب بڑھنا نہ تھا اس لیے عالم ارواح سے عالم اجسام میں بھیجا۔ کہ طلب سے عمل پیدا ہو اور اس سے ترقی کا دروازہ کھلے۔ جیسا کہ حدیث قدسی (مذکورہ بالا) میں خود فرماتے ہیں۔

غرض مزید قرب کیلئے طلب اور طلب کے بعد سعی کی ضرورت ہے اور وہ قرب جس کو قصد سے حاصل کیا جاتا ہے ایسے ہی اعمال سے حاصل ہوتا ہے جو اختیاری ہیں پس عالم ارواح میں اعمال سے مطلقاً محرومی تھی۔ کیونکہ وہاں اعمال پر قدرت ہی نہ تھی وہاں ہم ناقص تھے حق تعالیٰ کو زیادہ قرب عطا فرمانا منظور تھا۔ اس لیے یہاں عالم ناسوت میں بھیج دیا یہ بھی قرب بصورت بعد ہے کیونکہ بہت سے اقسام قرب وہ ہیں جو بصورت صلوٰۃ اور بصورت صوم پر موقوف تھے۔ بعض

---

[1] ملفوظات الیومیہ ہفتم صفحہ ۱۰ [2] التصوف و حلول صفحہ ۲۱۰۔ [3] التبلیغ وعید صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۱ ملخصاً۔

قرب وہ ہیں جو صورتِ حج پر موقوف ہیں۔ یہ روح مجرد کو بدون جسم کے کیونکر حاصل ہوتے۔

وہاں چہرہ ہی نہیں تو نماز میں وضع الجبہہ کیسے ہوتا۔ اس کو بھوک پیاس نہیں تو روزہ کیسے ہوتا اور طواف بیت اللہ کیسے ہوتا وغیرہ وغیرہ تو روح ان اقسام قرب کی تحصیل سے بالکل عاجز تھی۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا میں آنا گو بصورتِ عتاب تھا مگر حقیقت میں یہ عنایت تھی کہ حق تعالیٰ نے یہاں بھیج کر ہمارے لیے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ رات[1] دن جتنی ترقی چاہو۔ اعمال کے ذریعہ کر سکتے ہو۔ کوئی اس کے لیے حد ہی نہیں کسی درجہ پر پہنچ کر ترقی بند نہیں ہوتی۔ عاشق کو بھلا اس پر کہاں چین آسکتا ہے کہ محبوب کے سامنے ہو اور یہ کہہ دے کہ خبردار آگے نہ بڑھنا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ "محبوب سے لپٹ جاؤں"۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ وہ مجھ سے لپٹ جائے۔ لپٹنے میں یہی تو ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کو غایت قرب کے ساتھ اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے سو قرب تو (نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ وغیرہ سے) ثابت ہو چکا۔ باقی احاطہ سو وہ بھی موجود ہے خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں:-

إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ — بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہیں

یہ بڑی تسلی کی بات ہے۔ ان جذبات کو اہلِ عشق خوب سمجھتے ہیں۔ گو مجازی ہی ہوں۔

مقصود[2] یہ ہے کہ (اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی مندرجہ بالا میں واضح کر دیا کہ) جو میری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اس کی طرف دو چند اور سہ چند توجہ کرتا ہوں واقعی سچ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اتنی توجہ اور رحمت نہ فرمائیں تو انسان کی کیا مجال تھی جو ان تک پہنچ سکے۔ آخر انسان کو خدا سے نسبت ہی کیا ہے۔ یہ انہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہو جاتا ہے واقعی وہ غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیونکر قطع ہوتی ہے۔ سنیئے ؎

خود بخود آں شہ ابرار برے آید ॥ نہ بزور نہ بزاری نہ بزرے آید

---

[1] تصوف و سلوک صہ ۲۱۳ ، [2] اکمال فی الدین صہ ۶

یعنی وصول کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ابتدا میں تو سالک میں اور محبوبِ حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جس کو سالک طے نہیں کر سکتا۔ مگر جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت اس سے قطع نہ ہوگی۔ اب وہ خود بھی چلنا شروع کرتے ہیں اور ان کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آجاتے ہیں۔ اس طرح وصول ہو جاتا ہے۔ پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں مثلاً آپ کا ایک شیر خوار بچہ ہو جو آپ سے دور کھڑا ہو۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ دوڑ کر چلے آؤ۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اتنی مسافت یہ طے نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی اس کو بلاتے ہیں۔ اب بچہ ہمت کر کے ایک دو قدم چلتا ہے اور گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے اس وقت باپ کو خود جوش آئے گا اور وہ دوڑ کر خود آ دے گا اور اس کو گود میں اٹھائے گا یہی صورت سلوکِ باطن کی ہے کہ اول تم اپنی ناتمام طلب اور سعی ظاہر کرتے ہو۔ تمہاری وہ سعی ہرگز وصول کے لیے کافی نہیں تھی مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو، اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت کو جوش آتا ہے وہ خود آکر گلے لگا لیتے ہیں مگر ہاں اس کی ضرورت ہے کہ بچہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا شروع کر دو (یعنی عجز و عبدیت کا اظہار کرو)

مولانا فرماتے ہیں ؂

ہر کجا پستی است آب انجا رود	ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود	ہر کجا رنجے شفا آنجا رود
گر نہ گرید طفل کے جوشد لبن	گر نہ گرید ابر کے خندد چمن

قربِ نوافل و قربِ فرائض

جب[1] بندہ ریاضت و مجاہدہ کرتا ہے تو اس کے صفاتِ رذیلہ اور شہوت و غضب کے دواعی (یعنی محرکات) زائل ہو جاتے ہیں اور نفس میں حبِ مرضیاتِ حق اور بغض نامرضیاتِ حق کا ایک راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے اعمالِ حسنہ و محمودہ بے تکلف صادر ہوتے ہیں اور اعمالِ قبیحہ و ذمیمہ قریب قریب معدوم ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کی

[1] التکشف صد ۶۳

نسبت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

ولا یزال عبدی یتقرب الیّ	اور میرا بندہ برابر مجھ سے بذریعہ نوافل قرب
بالنوافل حتی احبه فاذا	حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو محبوب
احببته کنت سمعه الذی	بنا لیتا ہوں جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں
یسمع به وبصره الذی	تو میں اس کی شنوائی ہو جاتا ہوں جس سے وہ
یبصر به ویده التی یبطش	سنتا ہے اور اس کی بینائی ہو جاتا ہوں جس
بها ورجله التی یمشی بها	سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں
(رواه البخاری)	جس سے وہ کسی چیز کو لیتا ہے اور اس کا پاؤں
	ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ۔

مطلب یہ کہ اکثر اس کے جوارح سے کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا پس گویا میں ہی اس کے اعضا ربن جاتا ہوں ۔

چونکہ مجازاً اس حدیث میں حق تعالیٰ کو آلہ اور عبد کو فاعل کہا گیا ہے ۔ اس لیے صوفیائے کرام نے اس کا اتباع کر کے یہ عنوان مقرر کیا ہے کہ بندہ فاعل اور حق تعالیٰ آلہ بن جائے اور چونکہ حدیث میں اس مرتبہ کا حصول تکثیرِ نوافل پر وارد ہے اور مجاہدہ و ریاضت میں تکثیرِ نوافل لازم ہے خواہ نماز ہو یا روزہ یا کثرتِ مراقبات یا تقلیلِ شہوات، اس لیے صوفیہ حدیث کی پیروی میں اس مرتبہ کو قربِ نوافل کہتے ہیں اور چونکہ اس میں صفات وافعالِ رذیلہ کا ازالہ ہوا ہے ۔ اس لیے فنائے صفات سے بھی تعبیر کرتے ہیں ۔

دوسرا قربِ اعلیٰ درجہ کا ہے یعنی عبد کی ہستی ایسی مضمحل ہو جاوے کہ اپنی قدرت وارادہ کو قدرت وارادۂ حق کے روبرو ذوقی طور پر کالفانی و کالعدم جاننے لگے اور افعال و اعمال میں بمنزلہ آلۂ محضہ کے ہو جاوے اور اللہ تعالیٰ کی موثریت مستقلہ پیشِ نظر ہو جاوے اس مرتبہ کو اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فاعل ہو جاوے اور عبد آلہ بن جاوے اور چونکہ یہ اول سے اعلیٰ ہے کیونکہ اول میں صرف فنائے رذائل تھا فنائے اختیار نہ تھا اور اس میں فنائے اختیار ہے اس لیے اس سے اعلیٰ ہوا اور حدیث میں تقربِ بالفرائض کو تقرب بالنوافل سے اعلیٰ و افضل کہا گیا ہے چنانچہ اسی حدیث کا

سب سے اول جزو یہ ہے:۔

وما تقرب الی عبدی بشیٔ احب الی مما افترضت علیہ (بخاری)

اور میرا بندہ میرا کسی ایسے ذریعے سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ادائے فرائض سے زیادہ محبوب ہو۔

اس لیے حدیث ہی کی موافقت میں صوفیا اس کو قرب فرائض کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں سالک کو اپنی صفات ذاتیہ قدرت و اختیار پر بھی نظر نہیں رہی۔ اس لیے اس کو فنائے ذات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

طریق کار

حضرت[1] بایزید بسطامی رح نے ایک بار حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا۔ یا رب دلنی علی اقرب الطرق الیک یعنی خداوندا مجھے اپنے تک پہنچنے کا نزدیک ترین رستہ بتلا دیجئے۔ جواب ارشاد ہوا۔ یا ابا یزید دع نفسک و تعال یعنی اپنے آپ کو چھوڑ دو اور آجاؤ۔

اپنے[2] اوپر نظر کرنا چھوڑ دیں۔ اپنے کو نیست و نابود سمجھیں۔ تکبر کو دماغ سے نکال دیں۔ خدا تعالیٰ کے احکام میں منازعت نہ کریں۔ کیونکہ[3] خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان یہی خودی حائل ہے۔ اگر یہ نکل جائے تو بس واصل ہو گئے اور جب تک یہ باقی ہے اس وقت تک وصول نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا[4] اپنی عاجزی اور ناتوانی کا مشاہدہ کریں۔ حق[5] تعالیٰ کے سامنے الحاح والتجا کریں۔ تواضع پیدا کریں۔

(مطلب یہ کہ تفویضِ کلی اور عبدیتِ کاملہ اختیار کریں کہ) اخلاق رذیلہ جاتے رہیں۔ حمیدہ پیدا ہو جائیں معاصی چھوٹ جائیں۔ طاعت کی توفیق ہو جاوے۔ غفلت من اللہ جاتی رہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے کہ۔

یک[6] چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ۔۔۔ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

یعنی ہمیشہ احکامِ الٰہی پر نظر رکھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوں پھر تو جانبین سے

---

[1] العبد الربانی ص۱۰۱ [2] انفاسِ عیسیٰ ص۵۹ [3] العبد الربانی ص۱۰۱ [4] الکمال فی الدین ص۶۹
[5] کلمات اشرفیہ ص۱۷۶ [6] تصوف و سلوک ص۲۱۴

قرب کی وہ حالت ہوگی جس کو شاعر کہتا ہے۔

آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے — تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے

۶ ذرائع

(ذریعہ اور مقصود یہ دونوں الفاظ محاورات اور رات دن کی بول چال میں استعمال کیے جاتے ہیں لیکن ان الفاظ کو بولنے والے بہت کم ایسے ہیں جو ان کے حقیقی معانی اور مطالب کو سمجھتے ہیں زیادہ تر ناسمجھی کے باعث ذریعہ کو مقصود اور مقصود کو ذریعہ بنا دیتے ہیں یعنی ذریعہ کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو مقصود کے ساتھ کیا جاتا ہے اور مقصود کیساتھ ذریعہ جیسا برتاؤ کرتے ہیں اور اپنی عمر کو مصروفِ عمل رکھنے کے باوجود بھی منزلِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے کہ جس کو مقصود سمجھ کر حاصل کرنے کے درپے ہیں وہ حقیقت میں ذریعہ ہے اور مقصود سے کوسوں دور۔

غور کیجیے کہ ہمیں دنیا میں کس چیز کی ضرورت ہے اور وہ چیز کس طرح حاصل ہوتی ہے پس وہی ضروری چیز مقصود ہے اور اس کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ ذریعہ ہے) اور ذریعہ[1] اسی وقت کارآمد ہوتا ہے جبکہ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ مثلاً سیڑھی؛ کہ چھت پر چڑھنے کا ذریعہ ہے تو سیڑھی کا بنانا درست ہے اور ضروری ہے لیکن اسی شرط سے کہ چھت پر چڑھنے کے کام میں لائی جائے۔ نہ یہ کہ سیڑھی بنا کر احتیاط سے گھر میں رکھ لی جائے اور اس کو مقفل کر دیا جائے اور اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ یا بہت سی سیڑھیاں بے ضرورت بنا کر گھر میں رکھ لی جاویں (علیٰ ہذا وہ اعمال جو خود مقصود نہیں بلکہ مقاصد کے لیے ذریعہ ہیں تو اسی درجہ تک ان کو اختیار کرنا چاہیئے جس درجہ تک مقصود کے حصول میں ان کو دخل ہے اور اگر اس حد تک اختیار کیا جائے کہ مقصود فوت ہو جائے تو یہ مذموم ہے اسی طرح مجاہدہ حکمیہ یعنی تقلیل الطعام

---

[1] اباطن ص۱۲

تقلیل المنام، تقلیل الکلام اور تقلیل الاختلاط مع الانام اس لیے اختیار کیا جائے کہ مجاہدہ حقیقیہ، لیعنی طاعات کا بجالانا۔ اور نافرمانی سے بچنا۔ جو مقصود ہے، کے حصول میں سہولت ہو جائے یہ تو درست اور محمود ہے اور اگر صورت یہ ہو کہ مجاہدہ حقیقیہ سے بیفکر ہو جائے کہ نہ طاعات کا پاس ہو اور نہ نافرمانی سے اجتناب، تو یہ ناجائز اور مذموم ہوگا۔

اس کے بعد یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ اہلِ سلوک کے نزدیک ذرائع دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کا تعلق معدہ سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق فعل سے ہے (ان دونوں اقسام کو الگ الگ ابواب میں بیان کیا جاتا ہے)۔

باب اوّل۔ متعلق معدہ (یعنی مجاہدہ حکمیہ کا بیان)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔ [1]

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ الآیہ

جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے دکھلا دیں گے۔

اس آیت میں اُس مجاہدہ کے لئے ہدایت سبیل کا وعدہ ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے راستہ لیعنی شریعت کے مطابق کیا جائے۔ مجاہدہ تو جوگی اور راہب بھی کرتے ہیں مگر ان کو وصول نصیب نہیں ہوتا کیونکہ ان کا مجاہدہ خلافِ شریعت ہے۔

مجاہدہ کی حقیقت ارتکابِ طاعات و اجتناب معاصی ہے۔ (جیسا کہ جلد اول میں [2] ریاضت ومجاہدہ کے باب میں بالتفصیل بیان ہو چکا) مگر اہلِ سلوک نے بالاجماع مجاہدہ کی ایک قسم اور بیان کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ مجاہدہ کے چار رکن ہیں تقلیلِ طعام، تقلیلِ منام، تقلیلِ کلام اور تقلیل اختلاط مع الانام۔ یہ حضرات طبائع کے خواص وکیفیات کو خوب جانتے ہیں۔ جیسا اطباء ظاہری اجسام کے خواص وکیفیات کو خوب جانتے ہیں تو ان حضرات نے طبائع بشری کی خاصیت پر نظر کر کے دیکھا کہ

---

[1] تقلیل الطعام صفحہ ۲۲،۲۱،۲۳ [2] ملاحظہ ہو صفحات ۷۳ تا ۸۱

مجاہدہ مطلوبہ (یعنی ارتکابِ طاعات واجتنابِ معاصی) میں بغیر ان ارکانِ اربعہ کے سہولت نہیں ہوتی۔ گویہ[1] چاروں فی نفسہٖ مباح ہیں مگر ایسے مباح کہ تمام گناہوں کا سلسلۂ نسب انہی تک پہنچتا ہے۔ اس لیے ان کے ترک بمعنی تقلیل کو مجاہدہ میں داخل کیا۔ (یعنی) مجاہدہ حقیقیہ تو ارتکاب طاعات و اجتنابِ معاصی ہی کا نام ہے اور اس معنی کر یہ ارکانِ اربعہ مجاہدہ میں داخل نہیں تھے۔ مگر چونکہ اجتنابِ معاصی عادۃً انہی پر موقوف ہے اس لیے حکماً یہ بھی مجاہدہ میں داخل ہوگئے اور چونکہ بوجہ مقدمہ ہونے کے یہ حقیقی ہی کے حکم میں ہے۔ اس لیے اس کے فضائل بھی وہی ہیں جو حقیقی کے فضائل ہیں اور اس کا اہتمام بھی ویسا ہی ضروری ہے جیسا حقیقی مجاہدہ کا اہتمام ضروری ہے اس مجاہدۂ حکمیہ کو غیر ضروری سمجھنا زاہدانِ خشک کی غلطی ہے۔ جیسا کہ حقیقی مجاہدہ کا اہتمام نہ کرنا جہلاء صوفیہ کی غلطی ہے۔

(مجاہدہ[2] میں جس طرح ایک طرف افراط کی بے اعتدالی یہ ہے کہ ساری زندگی حظِ نفس کی نظر کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح تفریط کی بے احتیاطی یہ ہے کہ بہتوں نے مجاہدہ کا مطلب جوگیوں اشراقیوں کی طرح یہ سمجھ رکھا ہے کہ حقوقِ نفس کو بھی فنا کر دیا جائے۔ بلکہ روحانی نجات نام اسی کا رکھا ہے۔ کہ اس مادی دجسمانی زندگی ہی میں مادی دجسمانی حاجات سے نجات حاصل کر لی جائے اسی طرح بعض صوفی بھی اس میں مبتلا ہیں۔ کہ جس قدر نفس کی مخالفت ہوگی خدا زیادہ راضی ہوں گے اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف ہی ہو۔ چنانچہ بعضوں کو خبط ہوگیا ہے کہ اپنے اوپر گوشت کو حرام کر لیتے ہیں اسی طرح بعضے سرد پانی نہیں پیتے۔ بعضے چارپائی پر نہیں سوتے لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے نفس کی اصلاح کے لیے بڑے بڑے مجاہدے کیے ہیں اول تو وہ حضرات۔ حدِ اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ پھر وہ بھی بطور علاج کرتے تھے عبادت و ذریعہ قرب نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے کوئی شخص کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑ دے کہ وہ اس کو عبادت نہیں سمجھتا۔ بلکہ ذریعۂ حصولِ صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر کرے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا۔ کہ اس نے قانونِ شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دیا اور بدعت کے تبع کا یہی راز ہے لیکن

---

[1] تعلیم الاعظام ص ۳۶، ۳۷، ۴۱ ، [2] تصوف دسلوک ص ۱۷

ان حضرات نے صرف بطور علاج کے ترک کیا۔ بخلاف جہلاء کے کہ اس کو دین و عبادت اور ذریعۂ قرب سمجھ کر کرتے ہیں۔[1]

بہر حال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق ادا کرنا بھی ضروری ہے اس لیے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی حد مقرر کر دی ہے۔ حضرت ابو درداء رض صحابی رات کو بہت جاگتے تھے حضرت سلمان رض نے ان کو روکا۔ آخر مقدمہ دربار نبوی میں گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ سلمان رض سچ کہتے ہیں۔ اور یہ ارشاد فرمایا ان لنفسك علیك حقا الخ (بلاشبہ تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے۔)

اور راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارا ملکِ حقیقی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ سب سرکاری چیز اسی ہیں۔ سرکاری حد سے زیادہ اس سے کام لینا۔ یا سرکاری اصول کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں دماغ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں۔ جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے ان کو بگاڑیں گے تو خود موردِ عتاب و مستوجب عذاب بنیں گے اور اگر اپنے دل و دماغ اور آنکھ کی حفاظت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولیٰ کی سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کی عزت و حرمت، خدمت و حفاظت ہم پر بوجہ عبد و خادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔[2] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سید العاشقین ہیں مگر آنکھوں کی آپ اتنی خاطر فرماتے تھے کہ سرمہ کی تین سلائی ایک آنکھ میں لگاتے اور تین سلائی دوسری میں۔ اسی طرح کبھی آپ سے یہ ثابت نہیں کہ رات بھر جاگے ہوں اور امت کے لیے ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہاری جان کا بھی تم پر کچھ حق ہے اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر کچھ حق ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ہماری نہیں ورنہ ہم کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہوتا۔ بلکہ سرکاری چیزیں ہیں جن کے کچھ حقوق سرکار نے مقرر فرما دیئے ہیں جن کی رعایت ہمارے ذمہ ضروری ہے اس لیے عارف اپنی جان میں خلافِ حکم کوئی تصرف نہیں کرتا۔ جہاں حکمِ شریعت ہوتا ہے۔ وہاں تو وہ جان کی پرواہ نہیں کرتا اور جہاں حکم نہیں ہوتا یا ممانعت ہوتی ہے۔ وہاں جان کی حفاظت کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے جس کو زندگی

---

[1] سیرۃ الصوفی ص۴۰ [2] تقلیل الطعام ص ۴۹، ۴۲

نے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مسلمان اپنے کو خود ذلیل کیسے کرتا ہے۔ فرمایا کہ ایسی بلا اپنے سر دھرے جس کے تحمل کی اسے طاقت نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب تعلیم ہے کہ کام اتنا ہی اپنے ذمہ لو جس کو کر سکو ؎

خستگاں را چوں طلب باشد و قوت نبود　　گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر　　طفلِ مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

اور فرماتے ہیں ؎

چار پارا قدرِ طاقت بار نہ　　بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

حضرات ازواجِ مطہرات رضؓ سے بعض صحابہ رضؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات پوچھے انھوں نے ظاہر فرمایا۔[1] جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ رات کو کچھ دیر سوتے ہیں۔ کچھ دیر جاگتے ہیں۔ کچھ دیر عبادت کرتے ہیں۔ کچھ وقت بیبیوں کی باتوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ ان حضرات صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستور العمل کو سہل دیکھ کر قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ حضور کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں۔ اور تقلیلِ عمل مضر نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں لیکن ہم کو بوجہ اپنے نقصانِ مرتبہ کے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لیے ایک نے قسم کھائی کہ میں تو آج سے تمام رات نہ سوؤں گا۔ یہ عملِ شاق تو اس نے اختیار کیا۔ دوسرے بولے کہ میں ساری عمر روزے ہی رکھا کروں گا۔ تیسرے بولے کہ میں کبھی نکاح ہی نہ کروں گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور ان حضرات کی غلطی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا کہا یاد رکھو۔ میں تم سے زیادہ حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں کبھی روزہ رکھتا ہوں کبھی افطار کرتا ہوں اور کچھ جاگتا ہوں کچھ سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہ میری سنت ہے) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

---

[1] تقلیل المنام صـ۶

بعض لوگ مجاہدات بمعنی ترک ہی کو مقصود سمجھ جاتے ہیں کہ وہ مجاہدات حکمیہ تقلیل طعام[1] تقلیلِ منام و تقلیل کلام و تقلیل اختلاط مع الانام کو نہایت اہتمام سے اختیار کرتے ہیں۔ اور گو جانتے ہیں کہ ان سے مقصود سہولت فی الاعمال ہے۔ مگر باوجود اس کے پھر کیفیات کو حالاً مقصود سمجھتے ہیں اور اعمال کو حالاً اصل مقصود نہیں سمجھتے۔ گو ان کا اعتقاد نہ ہو مگر برتاؤ یہی ہے۔ چنانچہ مجاہدات کے بعد جب ان پر کیفیات ذوق و شوق و نشاط کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کام میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کبھی کسی درجہ سے ان کیفیات میں کمی پیدا ہوئی تو اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مجاہدہ ہی بیکار ہوا اور ہمارا رتبہ حق تعالیٰ کے ہاں کم ہو گیا۔ پھر اس خیال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اعمال ہی سے بے رغبتی ہو جاتی ہے۔

شریعت نے مجاہدات کے ساتھ اعمال کی قید لگا کر جس نکتہ پر تنبیہ کی ہے وہ یہ ہے کہ اصل مقصود رضائے الٰہی ہے جس کا طریق عمل ہے اور مجاہداتِ حکمیہ اس کے لیے محض سبب سہولت ہیں۔ خود مقصود نہیں پس اگر عمل موجود ہو اور مجاہدہ کے آثار خاصہ مرتب نہ ہوں تو کچھ حرج نہیں اور اگر مجاہدہ کے آثار خاصہ موجود ہوں۔ اور عمل مفقود ہو تو وہ محض بیکار چیز ہیں اس لیے شریعت نے ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک نہ ایک عمل تبلا دیا۔ روزہ میں بھی اعمال کی ترغیب دی ہے تاکہ معلوم ہو کہ تقلیلِ طعام خود مقصود نہیں بلکہ عمل مقصود ہے اور تقلیلِ منام کی صورت بھی تراویح و تہجد کی نماز میں تجویز کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ محض جاگنا مقصود نہیں۔ بلکہ عمل مقصود ہے۔ اور کثرتِ تلاوت[2] (قرآن مجید اور ذکر اذکار وغیرہ) کیلئے تقلیل کلام لازم ہے چوتھی عبادت اعتکاف ہے۔ اس کی روح تقلیل اختلاط مع الانام ہے۔ پس[3] اگر اعمال نہوں تو تقلیلِ منام (و تقلیلِ طعام وغیرہ) کی عادت کوئی فائدہ مند چیز نہیں۔ اور اگر اعمال موجود ہیں اور ثمرہ حاصل نہ ہو یعنی[4] کیفیات نہ ہوں اور اعمال موجود ہوں تو کافی ہے اور اگر اعمال نہ ہوں تو کیفیات کافی نہیں۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے۔ زکوٰۃ دیتا ہے۔ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے حرام آمدنی سے بچتا ہے کسی کا قرض لے کر مارتا نہیں جھوٹ اور غیبت وغیرہ (تمام منہیاتِ شرعیہ) سے اجتناب کرتا ہے۔ (اور تمام اوامر شرعیہ پر عامل ہے) مگر

---

[1] تقلیل المنام ص۳۵، ۳۸ [2] تقلیل طعام ص۴۱ [3] تقلیل المنام ص۳۸ [4] تقلیل الکلام ص۳

اس کو وہ ثمرات حاصل نہیں جو مجاہدہ پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً غلبۂ ذوق و شوق و یکسوئی وغیرہ نہیں تو یہ شخص بےفکر رہے اس کو مقصود حاصل ہے اور جو مفقود ہے وہ مقصود نہیں اس کا غم نہ کرے۔

شریعت نے جو مجاہدات میں محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی مشروع کیا۔ اس میں راز یہی ہے کہ اگر مجاہدہ میں صرف ترک پر اکتفا کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی عمل تعلق مع اللہ کا بڑھانے والا نہ کیا جائے تو نتیجہ مجاہدہ کا یہ ہوگا کہ قلب تعلقاتِ غیر سے خالی ہونے کے ساتھ تعلق مع اللہ سے بھی خالی ہوگا اور اس صورت میں شیطان کا قلب پر قبضہ جما لینا آسان ہو جائیگا اسی واسطے شریعت نے ہر مجاہدہ میں اس کی رعایت کی ہے کہ تعلقاتِ مباحہ کو ترک کر کے اعمال میں مشغول کر دیا ہے تاکہ قلب خالی نہ ہو۔

احیاء العلوم (مصنفہ حضرت امام غزالیؒ) اور دیگر متقدمین ائمہ کرام و بزرگانِ دین کی کتابوں میں جو مجاہدات کے طریقے تحریر ہیں وہ اقویا کے مناسب لکھے ہیں۔ ان میں اکثر مجاہدات اسی زمانہ متقدمین کے مناسب ہیں اس زمانہ متاخرین کے موافق نہیں۔ اصول تو اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اصول کبھی نہیں بدلا کرتے۔ مگر طرقِ معالجہ تبدلِ زماں سے بدل جاتے ہیں۔ اطباء اس کو جانتے ہیں چونکہ ان کے موافق عمل کی ہمت آج کل کے طبائع میں ہے نہیں تو اس سے بجز پریشانی بڑھنے کے اور کچھ نفع نہ ہوگا بلکہ جہاں تک ہو سکے بلا ضرورت نفس کو مشقت میں ڈالنے کی بجائے سہولت و راحت کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو اور طبیعت میں نشاط رہے جو معینِ عبادت ہے البتہ معصیت کے پاس نہ پھٹکیں اور نفس کی ہر وقت نگرانی رکھیں۔ نہ کم کھانے کی ضرورت نہ کم سونے کی۔ یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں کیونکہ طبائع میں پہلے ہی سے ضعف غالب ہے۔ ہاں کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے لیکن نہ اتنا کہ جس سے قلب میں انقباض پیدا ہو جائے۔

(حاصل کلام) خاص مشہور مجاہداتِ اربعہ یہ ہیں۔ قلتِ طعام، قلتِ منام، قلتِ کلام، قلتِ اختلاط مع الانام۔ ان میں مقصود تقلیل ہے وہ بھی بشرطِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت، اور

---

[1] تقلیل الکلام صفحہ ۵۷،۶۷ [2] تصوف و سلوک صفحہ ۷۴، ۳۰، ۶۰، ۷۵، ۵۰

تقلیل سے مراد بھی شیخ کامل کی تعلیم کے موافق ان چار چیزوں میں محض توسط اور اعتدال ہے کہ نہ اس قدر کثرت کرے۔ جس سے غفلت و قساوت و کاہلی پیدا ہو۔ نہ اس قدر قلت۔ جس سے صحت و قوت زائل ہو جائے (اور حقیقت تو یہ ہے کہ سب سے بڑی دولت، اس طریق میں قلب کی جمعیت و یکسوئی ہے۔ اس لیے قلب کو تشویش و پریشانی سے بچانا بہت ضروری ہے۔

پہلی فصل تقلیلِ طعام

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ الآیہ۔	خوب کھاؤ اور پیو۔ اور حد سے مت نکلو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یجزیہم مایجزی اھل السماء من التسبیح و التقدیس (رواہ احمد)	مسلمانوں کو (غذا کی جگہ) وہ چیز کافی ہو جاوے گی جو اہلِ آسمان کو کافی ہوتی ہے۔ یعنی تسبیح و تقدیس (مشکوٰۃ)

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انھوں نے خلوت میں مدتوں کھانا نہیں کھایا۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ بعض اوقات صرف ذکر و تسبیح بھی غذا کا کام دے سکتے ہیں (لیکن[1]) تقلیلِ غذا کے واقعات جو منقول ہیں۔ آج کل ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان حضرات میں قوت زیادہ تھی ان کو غذا کم کرنے سے بھی جمعیتِ قلب فوت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ ان کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان سے بعض اشغال ایسے منقول ہیں جو آج کوئی کرے تو مر ہی جائے۔ چنانچہ ایک شغل صلوٰۃ معکوس ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ الٹا لٹک کر شغل کرتے ہیں۔

(حقیقت یہ ہے کہ) شارع[2] علیہ السلام نے تقلیلِ طعام کو تجویز ہی نہیں کیا بلکہ کھانے کے اوقات

---

[1] التکشف ص۳۶۱ [2] انفاسِ عیسیٰ ص۱۸۲ [3] تقلیلِ طعام ص۵۶، ۶۷

معتادہ کو بدل کر ان میں فصل زیادہ تجویز کیا ہے اور اس تبدل عادت وزیادہ فصل سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے اس کو شریعت نے تقلیلِ طعام کے قائم مقام سمجھا ہے اس میں جتنی صورتیں مجاہدہ کی نکل سکتی ہیں روزہ ان سب میں افضل ہے (لہذا) تقلیلِ طعام[1] کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے اس کے علاوہ صورتیں اہلِ مجاہدہ نے تقلیلِ طعام کی اختیار کر رکھی ہیں۔ شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں (یعنی) کم کھانا[2] اور بھوکا رہنا یہ شرعی مجاہدہ نہیں اور بھوک کی جو فضیلت وارد ہے اس سے اختیاری بھوک مراد نہیں۔ بلکہ غیر اختیاری مراد ہے یعنی یہ اس بھوک کے فضائل نہیں ہیں جو باوجود غلہ گھر ہونے کے اختیار کی جائے بلکہ کسی شخص پر فاقہ آپڑے تنگدستی ہو، اس کی تسلی کے لیے یہ فضائل بیان کر دیئے گئے ہیں کہ مسلمان کو فاقہ سے پریشانی نہ ہونی چاہیئے[3] اس سے اس کو ثواب ملتا ہے درجات میں ترقی ہوتی ہے یہ فضائل ایسے ہیں جیسے احادیث میں بیماری کے فضائل ہیں اور اس پر ثواب بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود بیمار پڑ جایا کریں۔

مجددِ عصرہ العلامۃ المحدث علی بن سلطان القاری رح نے شرح شمائل ترمذی میں ابن الجوزیؒ سے نقل کیا ہے۔

ومن جهلة الصوفية من	بعض جاہل صوفی ایسے ہیں جو کھانا بہت کم
يقلل الطعم واكل الدسم	کھاتے ہیں اور چکنائی کا استعمال بہت کم کرتے
حتى ييبس بدنه ويعذب	ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بدن میں خشکی پیدا
نفسه بلبس الصوف ويمتنع	ہو جاتی ہے وہ اپنے نفس کو صوف کے کپڑے
من الماء البارد وما هذا طريقة	پہن کر تکلیف دیتے ہیں اور ٹھنڈے پانی کے
رسول الله صلى الله عليه وسلم	استعمال سے باز رہتے ہیں حالانکہ یہ نہ رسول اللہ
ولا طريقة صحابتهم و	صلعم کا طریقہ ہے اور نہ صحابہ و تابعین کا۔ وہ
اتباعهم وانما كانوا	حضرات بھوکے رہتے جب ان کے پاس کچھ نہ ہوتا

---

[1] تقلیل الانام صٓ ۲ [2] تقلیل الطعام صٓ ۵۶، ۶۰ [3] تقلیل الطعام صٓ ۶

يجوعون اذا لم يجدوا شيئا فاذا وجدوا
اكلوا وقد كان رسول الله صلى الله عليه
وسلم يأكل اللحم ويحبه ويأكل
الدجاج ويحب الحلواء وكان رجل
يقول لا آكل الخبيص لاني لا اقوم
بشكره فقال الحسن البصري هذا
رجل احمق وهل يقوم بشكر الماء
البارد وقد كان سفيان الثوري اذا
سافر حمل معه في سفرته اللحم
الشوي والفالوذج انتهى ومحملة
قوله تعالى قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ
اللهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ
وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ وقال
تعالى يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا
مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا
صَالِحًا

تھا اور جب مل جاتا کھاتے تھے اور رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت کھاتے تھے اور اسے
پسند فرماتے تھے اور مرغابی کھاتے تھے اور میٹھی
چیز پسند فرماتے تھے اور ایک شخص کہتا تھا کہ میں حلوا
نہیں کھاتا ہوں کیونکہ میں اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا
حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ شخص بے وقوف ہے
کیا یہ ٹھنڈے پانی کا شکر ادا کر سکتا ہے سفیان
ثوریؒ جب سفر میں جاتے تو اپنے ساتھ بھنا ہوا
گوشت اور فالودہ لے جاتے (انتہی) اور یہ
بھی ہے مصداق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کہ
آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے زینت کے وہ
سامان جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے
بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس
شخص نے حرام کیا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ
نے فرمایا۔
اے رسولو! حلال چیزوں میں سے کھاؤ اور
نیک اعمال کرو۔

(الغرض) تقلیل[1] طعام فی نفسہٖ مقصود نہیں۔ بلکہ ذریعہ مقصود ہے، مقصود کسر قوت بہیمیہ (حیوانی قوت کو توڑنا) ہے اور اس کسر سے بھی مقصود کف النفس عن المعاصی (یعنی نفس کو گناہوں سے روکنا) ہے۔ پس اگر یہ کف عن المعاصی بدوں تقلیل طعام میسر ہو جاوے۔ تو تقلیل طعام ضروری نہیں۔ (نیز) عبادت[2] میں نشاط و سرور صحت اور قوت ہی سے ہو سکتا ہے اور تجربہ ہے کہ آجکل

---

[1] کمالات اشرفیہ صہ ۸۲ [2] انفاس عیسی صہ ۱۹۲

تقلیلِ غذا سے صحت برباد ہو جاتی ہے۔ فاقہ کر کے نماز پڑھنے سے اکتیس قل ھو اللہ پڑھیں گی۔ زبان و قلب سے کچھ نہ نکلے گا (اسی طرح) غذائے جسمانی کی کثرت سے غذائے روحانی یعنی ذکر اللہ کم ہو جاتا ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

تہی از حکمتی بعلت آں　　کہ پری از طعام تا بینی

(یعنی حکمت و دانش سے تو اس لیے خالی ہے کہ ناک تک کھانے سے بھرپور ہے) اس لیے سالک کو غذائے جسمانی کی کثرت بھی نہ چاہیئے بلکہ توسط کا لحاظ رکھنا چاہیئے مگر یہ ضرور ہے کہ سب کا اوسط ایک نہیں بلکہ ہر شخص کا اوسط مختلف ہے اور اوسط سے تجاوز کرنا اور زیادہ کھانا بُرا ہے اسی طرح اوسط سے کم کھانا بھی مضر ہے۔ ایک ضرر تو جسمانی ہے کہ غذا بہت کم کرنے سے ضعف لاحق ہو جاتا ہے اور کام نہیں ہو سکتا اور ایک ضرر مقصودِ سلوک کا ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ تشبہ بالملٰئکہ حاصل کرے اور تشبہ بالملٰئکہ اس شخص کو حاصل ہے جو نہ شبع (سیری) سے بدمست ہو نہ جوع (بھوک) سے پریشان ہو بلکہ معتدل حالت میں رہ کر طمانینت و جمعیت قلب سے متصف ہو اور جمعیتِ[۱] قلب جیسا کہ زیادہ کھانے سے فوت ہوتی ہے کم کھانے سے بھی فوت ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے سے خطرات کا ہجوم ہوتا ہے۔ کیونکہ معدہ کی تبخیر دماغ کی طرف صعود کرتی ہے تو دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور کم کھانے سے ہر وقت روٹیوں کی طرف دھیان لگا رہتا ہے اس لیے عبادت بھی ناقص ہوتی ہے۔ پس[۲] کھانے سے اصل مقصود جمعیت قلب ہے نہ بست کھانا مطلوب ہے نہ کم کھانا۔ دلیل اس کی یہ ہے۔

اذا حضر العشاء والعشاء فابدءوا[۳] بالعشاء　　جب کہ رات کا کھانا اور رات کی نماز جمع ہو جائیں تو پہلے کھانا کھاؤ (بعد میں نماز پڑھو)۔

فقہاء نے یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر کھانا ٹھنڈا ہونے سے اس کی لذت زائل ہو جانے کا اندیشہ ہو جب بھی نماز کو مؤخر کر دینا جائز ہے۔ منشا اس کا وہی تحصیل جمعیت ہے کہ بار بار یہ خیال نہ آوے کہ نماز جلدی پڑھ لوں تاکہ کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

۱؎ اشرف المسائل ص ۴۵　۲؎ النفائس عینی ص ۱۹۲　۳؎ فرشتوں سے مشابہت سے جڑھتا ہے۔

تقلیلِ طعام[1] کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس وقت خوب اشتہار ہو. اس وقت کھانا کھا کر اشتہار (بھوک) کو فنا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کو باقی رکھ کر ہاتھ روک لینا چاہیئے۔

دوسری فصل، تقلیلِ منام

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا نِّصۡفَہٗۤ	رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات
اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا۔[3]	یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی قدر کم
الآیہ	کر دو (بیان القرآن)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اذا قام احدکم من[2]	جب تم میں سے کوئی شخص رات کو اٹھے۔ پھر
اللیل فاستعجم القرآن علی	(غلبۂ نوم سے) قرآن اس کی زبان سے صاف
لسانہ فلم یدر ما یقول	نہ نکلے اور کچھ خبر نہ ہو کہ کیا زبان سے نکل رہا
فلیضطجع۔	ہے تو اس کو لیٹ جانا چاہیئے (مسلم شریف)۔

بعض لوگ تقلیل منام وغیرہ اسباب مجاہدہ میں بہت غلو کرتے ہیں کہ لحوق ضرر (نقصان کے لاحق ہونے) کی طرف بھی التفات نہیں کرتے۔ اس حدیث میں اس کی اصلاح ہے اور مدار اس میں دو ہیں۔ ایک یہ کہ غلو سے بعض اوقات ضرر جسمانی لاحق ہو جاتا ہے۔ پھر ضروری عبادت بھی نہیں ہو سکتی دوسرے یہ کہ جب غلبۂ نوم سے الفاظ صحیح نہیں نکلیں گے تو جو ثواب خاص ان الفاظ کے متعلق ہے وہ حاصل نہ ہوگا۔ پھر نرے جاگنے سے کیا فائدہ؟

(اور مذکورہ بالا آیت میں) قیامِ لیل[4] کا حکم اس لیے دیا ہے کہ ریاضت کے خوگر ہوں جس سے استعدادِ نفس اکمل و اقویٰ ہو۔ بے شک رات کا اٹھنا (اور جاگنا) نفس کے کچلنے میں خوب مؤثر

---

[1] کمالات اشرفیہ صفحہ ۸۲ [2] التکشف صفحہ ۳۴۷ [3] بیان القرآن تفسیر سورۂ مزمل

ہے اور دعا ہو یا قرأت ہو (نماز ہو یا ذکر ہو) ظاہراً و باطناً ہر بات خوب ٹھیک ہوتی ہے ظاہراً تو اس طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے الفاظ خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں اور باطناً اس طرح کہ جی خوب لگتا ہے اور موافقت دل و زبان کا یہی مطلب ہے۔

تقلیلِ منام[1] مجاہدہ کا دوسرا رکن ہے (ماہ رمضان میں نماز تراویح کا ادا کرنا شرعی حکم ہے) تراویح تقلیلِ منام کو مستلزم ہے جس طرح صوم کو تقلیلِ طعام میں دخل ہے اسی طرح تراویح کو تقلیلِ منام میں دخل ہے اور جیسے روزہ میں تبدیلِ عادت کی وجہ سے مجاہدہ کی شان آگئی تھی اسی طرح یہاں بھی شریعت نے محض تبدیلِ عادت سے مجاہدہ کا کام لیا ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشاء کے بعد فوراً سو رہتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے جو کہ مجاہدہ ہے (کیونکہ) تقلید کے ساتھ جاگنے سے مجاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے مرتاضین آنکھیں پھوڑتے تھے چھت میں رسیاں باندھتے تھے کہ جب نیند آتی اس میں لٹک جاتے جس سے نیند اڑ جاتی تھی ان دونوں مجاہدوں میں ایسا فرق ہے جیسے قند سیاہ اور شیرہ میں۔ ان کو دیکھ کر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شاہانہ علاج کیا ہے کہ نہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہے، نہ رسیاں باندھنے کی ضرورت ہے (پھر) اس تقلیل کو تہجد سے اور تقویت ہو جاتی ہے تراویح اور تہجد کے اہتمام سے تقلیلِ منام ہو جاتی ہے اور یہ نرودنی مجاہدہ بھی ہے۔

غرض شریعت نے تقلیلِ منام میں محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ اعمال کی تلقین فرمائی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کی تعریف (اسطرح) فرماتے ہیں۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کہ وہ رات کو کم سویا کرتے ہیں اور پچھلے حصہ رات میں استغفار کیا کرتے ہیں۔ یہاں تو استغفار مشروع ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ	ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں
الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ	اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ
خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ الآیۃ	پکارتے ہیں۔

---

[1] تقلیل المنام ، ۱۵، ۱۹، ۲۲، ۲۴، ۲۸، ۳۲، ۳۴، ۲۹، ۳۰ ملخصاً۔

مطلب یہ کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں۔ مگر طرز کلام سے عموم ظاہر ہے۔ لہٰذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اس لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو تہجد کی توفیق نہ ہو تو رات کو کسی وقت جاگ کر تین بار سبحان اللہ کہہ کر سو رہا کرے وہ بھی یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا میں داخل ہو جائیگا۔

غرض شریعت نے جاگنے کے ساتھ ذکر و استغفار و صلوٰۃ کو بھی مشروع فرمایا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا۔ پھر اس میں بھی کوئی قید نہیں کہ دو بجے اٹھو یا تین بجے اٹھو بس صبح سے پہلے اٹھنا چاہیے حق تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے:۔

اِنَّ رَبَّکَ یَعۡلَمُ اَنَّکَ تَقُوۡمُ	آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی
اَدۡنٰی مِنۡ ثُلُثَیِ الَّیۡلِ وَ نِصۡفَہٗ	رات سے کچھ کم جاگتے ہیں کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی
وَ ثُلُثَہٗ وَ طَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ	رات جاگتے ہیں۔ اور ایک جماعت بھی لوگوں میں سے
مَعَکَ وَ اللّٰہُ یُقَدِّرُ الَّیۡلَ	جو آپ کے ساتھ ہے اور رات اور دن کا پورا
وَ النَّہَارَ ط الآیہ	اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں۔

مطلب یہ کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو۔ اس لیے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی۔ جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیئے۔ پھر بیماروں اور کسب معاش کرنے والوں کو وقت تھی۔ ان کی آنکھ بعض دفعہ صبح کے قریب ہی کھلتی تھی۔ تو ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

عَلِمَ اَنۡ سَیَکُوۡنُ مِنۡکُمۡ مَّرۡضٰی وَ اٰخَرُوۡنَ یَضۡرِبُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ یَبۡتَغُوۡنَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ وَ اٰخَرُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنۡہُ ط یعنی بیماروں اور مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے ان کی جب بھی آنکھ کھل جائے۔ صبح سے پہلے پہلے وہ جتنا بھی قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں۔ چاہے دو ہی رکعت پڑھ لیا کریں۔ اس سے بھی ثواب کامل مل جائیگا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کریں۔ جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے

پھر اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد بھی ہیں۔ چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبت فضلیہ کم ہوتی ہے جو صحت کے لیے معین ہے۔ نیز اس سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک محدث کا

قول ہے۔

من کثرت صلوٰتہ فی	جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا۔ دن میں اس
اللیل حسن وجھہ فی النھار	کا چہرہ خوبصورت ہو جائے گا۔

(مطلب یہ) کہ تہجد سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے سے

نورِ حق ظاہر بود اندر دلی	نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی
مردِ حقانی کی پیشانی کا نور	کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

اور زیادہ[1] سونے سے برودت بڑھ جاتی ہے۔ جس سے قوتِ فکریہ کم ہو جاتی ہے اور قوت فکریہ کی کمی سے دنیا اور دین دونوں کے کام خراب ہوتے ہیں۔ نیز اس سے امورِ انتظامیہ میں بہت خلل پڑتا ہے ایسے شخص کو پابندیٔ اوقات کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

نیند[2] کا اصل علاج یہ ہے کہ پانی کم پئیں۔ ستر اہلِ مجاہدہ کا قول ہے کہ نیند کا مادہ پانی سے ہے اس کو حضرت امام غزالیؒ نے لکھا ہے۔ پھر بھی اگر نیند آوے تو سیاہ مرچ چبالے۔ اور (اگر موقع ملے تو) دن کو سو رہا کریں۔ (اور) اگر نیند[3] بہت غالب ہو تو اس کو دفع نہ کیا جاوے۔ وظیفہ چھوڑ کر سو رہنا چاہئے پھر دوسرے وقت پورا کر لیا جاوے۔ اور اگر زیادہ غالب نہ ہو تو ہمت کر کے جاگنا چاہئے (اور غلبہ کی صورت میں) اگر نیند[4] کو زبردستی دفع بھی کیا جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ صفرا میں اشتعال بڑھ جاتا ہے سودا میں ترقی ہو جاتی ہے۔ خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ ان کو الہام سمجھ کر اپنے کو بزرگ جاننے لگتا ہے۔ آخر یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نیند میں بہت رعایت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے لاتفریط فی النوم (سونے میں کوئی تفریط نہیں)

---

[1] تقلیل الطعام صـ۳۲ [2] کمالات اشرفیہ صـ۱۴۳ [3] انفاس عیسیٰ صـ۱۰۴ [4] کمالات اشرفیہ صـ۱۴۲

تیسری فصل تقلیلِ کلام[1]

عن[2] مالك انه بلغه ان عيسى ابن مريم ع قال لا تكثروا الكلام بغير ذكر الله تعالى فتقسوا قلوبكم و ان القلب القاسى بعيد من الله تعالى ولكن لا تعلمون

(الحديث)

حضرت امام مالکؒ سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ ذکر اللہ کے سوا تم بہت کلام نہ کیا کرو کہ اس سے تمہارے دل سخت ہو جاویں گے (یعنی ان میں خشوع نہ رہے گا اور یہ بالکل تجربہ کی بات ہے) اور جس دل میں قساوت ہو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے لیکن تم کو اس کی خبر نہیں ہوتی (کہ اللہ تعالیٰ سے بعد ہو گیا کیونکہ حقیقت تو اس کی آخرت میں مشاہد ہوگی اور آثار تو یہاں بھی مشاہد ہیں مگر ان کا ادراک بوجہ بے التفاتی کے نہیں ہوتا۔)

مجاہدہ[3] کا تیسرا رکن تقلیلِ کلام ہے اور یہ تقلیلِ طعام و تقلیلِ منام سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ کھانے میں کچھ اہتمام تو کرنا پڑتا ہے (نیز) ایک دو دفعہ زیادہ کھالے گا پھر کہاں تک کھائیگا جب ہضم نہ ہوگا۔ خود ہی تقلیل ہو جائے گی۔ اسی طرح کہاں تک سوئے گا کبھی تو جاگے گا۔ بخلاف بولنے کے، کہ اس میں کچھ اہتمام ہی نہیں کرنا پڑتا۔ نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے۔ نہ زبان چلانے سے کچھ تعب ہوتا ہے۔ دوسرا راز یہ ہے کہ انسان جسقدر حظوظ اختیار کرتا ہے۔ لذت کے لیے اختیار کرتا ہے۔ سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں۔ ان میں کثرت کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے سے جی گھبرا جاتا ہے مگر بولنے کی لذت ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے تقلیلِ کلام سب سے زیادہ

---

[1] یہاں فصل آفات اللسان بھی دیکھ لی جائے تو نافع ہوگا [2] الکشف ص ۴۲۱ [3] تقلیل کلام ص ۴۷، ۵۲

دشوار ہے۔ مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لیے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں آفات بہت ہیں اور اس سے گناہوں میں ابتلا بکثرت ہو جاتا ہے اس لیے اس کی تقلیل کو مجاہدہ کا ایک رکن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن تقلیلِ کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کردے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے۔ گو مباح ہی ہو باقی جو باتیں حرام ہیں۔ جیسے جھوٹ غیبت وبہتان وغیرہ۔ وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ کیونکہ وہ تو مجاہدہ حقیقیہ ہے جو شخص مجاہدہ حکمیہ کرے گا۔ وہ مجاہدہ حقیقیہ کو کیسے ترک کر سکتا ہے۔ رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے یا ضرورت میں ہرج ہوگا یا مخاطب کو تکلیف ہوگی۔ لیکن ضرورت کی تفسیر یہ ہے لولا لتضرر (یعنی جس کے نہ ہونے سے ضرر ہو) پس جس بات کے ترک کرنے سے دنیا یا دین کا ضرر ہو وہ بات ضروری ہے۔ مثلاً تاجر کے پاس کوئی خریدار گھنٹہ بھر تک چیزوں کی قیمتیں دریافت کرتا رہے۔ اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خرید لے گا۔ تو جب تک یہ امید ہو۔ اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہے کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے میں دنیا کا ضرر ہے۔ تجارت کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے شریعت اجازت دیتی ہے کہ تجارت کی باتیں کرے۔ لیکن سچی باتیں کرے۔ جھوٹ اور مبالغہ سے کام نہ لے کہ خواہ مخواہ اپنے مال کی حد سے زیادہ تعریف کرے۔ یا کوئی شخص آپ سے ملنے آیا۔ اس سے باتیں کرنا مزاج پوچھنا اور یہ دریافت کرنا کہ کہاں سے تشریف لائے۔ یہاں کب تک قیام رہے گا۔ یہ سب باتیں ضرورت میں داخل ہیں۔ اس سے قلب میں ذرہ برابر ظلمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضراتِ عارفین کا مشاہدہ ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہے تو اس سے قلب پر اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر لے لوام رود پکارتا پھرے۔ تو ذرہ برابر اس سے قلب میں ظلمت نہ آئے گی۔ کیونکہ بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی اگر زبان سے نکل جاوے تو دل سیاہ ہو جاتا ہے (رہا اس بات کا سمجھنا کہ کونسی چیز ضروری ہے اور کونسی نہیں، اور کس بات کے ترک کرنے سے ضرر ہوتا ہے اور کس کے ترک سے ضرر نہیں ہوتا۔ یہ فقہاء ہی کا کام ہے۔ (نہ کہ خشک زاہدوں کا، کہ وہ ضروری باتوں کو بھی فضولیات میں شمار کر لیتے ہیں) حاصل یہ کہ شریعت نے تقلیلِ کلام کی وہ صورت تجویز نہیں کی۔ کہ زبان بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ بلکہ

۱ے فصل آفات لسان ملاحظہ ہو۔ ۱ے انفاسِ عیسیٰ ص ۱۸۵ ۲ے تقلیلِ الکلام ص ۵۳، ۵۶، ۶۵

اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہو (یا ذکر کرتے رہو) جس سے مجاہدۂ تقلیلِ کلام کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے۔ فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جاتے۔ اور اس کے ساتھ ثواب بھی بیشمار ملتا رہے۔ جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

شریعتؐ کی یہ بہت بڑی تعلیم ہے کہ بے ضرورت باتوں میں نہ پڑنا چاہیئے۔ (چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔)

من حُسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه۔ — آدمی کے حسن اسلام میں سے یہ ہے کہ مقصد سے غیر متعلق باتوں کو چھوڑ دے۔

اور ارشاد فرمایا :-

ایاك وکثرة الضحك فانه یمیت القلب۔ — زیادہ ہنسنے سے بچو کیونکہ زیادہ ہنسنا قلب کو مردہ کر دیتا ہے۔

تجربہؑ سے یہ معلوم ہوا کہ سکوت سے قلب میں جو بات پیدا ہوتی ہے۔ وہ گفتگو کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ گفتگو محمود ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ضرورت سے زائد ہو۔ شیخ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں ؎

دل ز پر گفتن بمیرد در بدن — گرچہ گفتارش بود در عدن

یعنیؑ کثرتِ کلام (مباح) سے دل مر جاتا ہے۔ ظلمت اور قساوتِ قلب پیدا ہو جاتی ہے اور ساری طاعات کا مدار حیاتِ قلب پر ہے۔ نیک کاموں کی توفیق نورِ قلب سے پیدا ہوتی ہے اور تمام معاصی کا منشا قساوت اور ظلمتِ قلب ہی ہے۔ جب قلب میں حیات و نور ہی نہ رہا۔ بلکہ اس کے بجائے قساوت و ظلمت پیدا ہو گی تو اب یہ شخص سب گناہوں کے لیے قابل ہو جاتا ہے۔

کثرتِؑ کلام اس وقت ہوتی ہے جبکہ اپنی بڑائی ذہن میں ہو۔ اور اپنی بڑائی نظر میں اسی وقت آتی ہے۔ جب حق تعالیٰ سے غفلت ہو۔ اور خدا سے غفلت ایک مرض نہیں۔ بلکہ مجموعۃ الامراض ہے۔

---

۱ انفاسِ عیسیٰ ص ۱۸۳، ۲۹۵ ۲ اشرف المسائل ص ۱۱۴ ۳ تقلیل الطعام ص ۳۴،
۴ کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۰۵،

تو جس شخص کو دیکھیں کہ کثرتِ کلام میں مبتلا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ ایک مرض میں مبتلا نہیں۔ بلکہ بہت سے امراض میں مبتلا ہے اور اس میں وہ تمام امراض موجود ہیں جو ترفع اور تکبر کی فرع ہیں۔

(طریق یہ ہے کہ) بات[1] وہ کریں جس کی کچھ غایت ہے جس بات کا کچھ نتیجہ نہ ہو۔ اس کے درپے نہ ہوں۔ کلام و ترکِ کلام دونوں اختیاری ہیں۔ اس میں بھی ہمت کی ضرورت ہے اگر بعض ملنے والے بیکار زیادہ دیر تک سمع خراشی اور حرج کریں اور ان کو نہ اٹھائیں۔ تو خود کوئی خلوت کی جگہ اپنے لیے تجویز کر کے ان سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ اضیاف (مہمان) بھی اگر غیر ضروری باتیں کرنے لگیں۔ جس سے اپنے کام کا وقت ضائع ہونے لگے یا طبیعت تنگ ہونے لگے۔ بدون حیلہ یا کسی حیلہ سے اٹھ جانا چاہیے مروت میں اپنا دینی ضرر ہرگز گوارا نہ کرنا چاہیے۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص۱۷۴

چوتھی فصل تقلیل اختلاط مع الانام

قیل یا رسول اللہ ای الناس افضل قال مؤمن مجاھد بنفسہ ومالہ فی سبیل اللہ قیل ثم من قال رجل فی شعب من الشعاب یتقی اللہ و یدع الناس من شرہ۔ خرجہ الخمسۃ	کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے افضل کون شخص ہے۔ آپ نے فرمایا جو مومن اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔ سوال کیا گیا پھر کون افضل ہے فرمایا وہ شخص جو (پہاڑ کی) گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں رہتا ہو۔ اللہ سے ڈرتا ہو اور خلق کو اپنے شر سے فارغ رکھتا ہو۔ بخاری مسلم، ترمذی، ابوداؤد و نسائی نے روایت کیا

حقیقت اکثر اہل اللہ کی عادت رہی ہے کہ خلق سے اختلاط کم رکھا اور گوشہ نشیں رہے ہیں اس حدیث سے اس کی اجازت اور ایک درجہ فضیلت ثابت ہوتی ہیں اور حدیث میں اس کے محل کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب اختلاط میں احتمال شر الی الخلق[1] کا ہو اور اسی پر قیاس کیا جاوے گا۔ وصول شر من الخلق[2] کو اور نیز حدیث مذکور ہی میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس شخص سے خیر و نفع عام زیادہ متوقع ہو اس کے لیے اختلاط افضل ہے۔ چنانچہ مومن مجاہد کو صاحب عزلت سے افضل فرمایا اور تحقیق مسئلہ کا خلاصہ یہی ہے کہ جس شخص سے مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہو۔ اس کے لیے جلوت بہتر ہے۔ اور جس سے نفع متعلق نہ ہو اور جلوت میں احتمال اضرار (ضرر پہنچانے) یا تضرر (ضرر پہنچنے) کا ہو۔ اس کے لیے خلوت بہتر ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے[3] کہ ماسوی اللہ سے تین قسم کے تعلقات ہیں۔ تعلق محمود، جس کا شریعت نے امر فرمایا ہے۔ وہ تو عین تعلق بحق ہے۔ اس کا قطع ناجائز ہے۔ دوسرے تعلق مذموم جس سے شرع نے

---

[1] التکشف ص ۳۴۹ [2] اشرف المسائل ص ۱۴۷ ؏ مخلوق کو شر پہنچنے کا احتمال۔ ؏ مخلوق سے شر کا پہنچنا۔

نہی فرمائی ہے اس کا قطع واجب ہے تیسرے تعلق مباح جو نہ طاعت ہے نہ معصیت۔ اس میں قطع کی ضرورت نہیں ۔البتہ تعلیل اور انہماک نہ کرنا۔ (یعنی تقلیل کرنا) ضروری ہے پس جہاں قطع تعلق کی تعلیم ہے۔ مراد تعلق محمود نہیں بلکہ مذموم ومباح ہے مگر مذموم بطورِ ترک کے اور مباح بطورِ تقلیل کے (اور) جب تک نسبت مع الخالق راسخ نہ ہو تعلق مع الخلق بلا ضرورت سراسر مضرت ہے اور جو منفعت سوچی جاتی ہے کہ ادائے حق خلق ہے وہ حق خلق بھی جب ہی ادا ہوتا ہے کہ نسبت مع الخالق راسخ ہو جائے ورنہ نہ حقِ خالق ادا ہوتا ہے۔ نہ حق خلق۔ یہ ایک کا نہیں۔ بلکہ ہزاروں اہلِ بصیرت کا تجربہ ہے ہم اور آپ سے زیادہ اہلِ تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیم بلخی رح حضرت شاہ شجاع کرمانی کے واقعات معلوم ہیں اور حضرات خلفائے راشدین پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جاوے ۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

قولِ[۲] فیصل خلوت کے باب میں یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی ضروری حاجت دینی یا دنیوی نہ دوسروں سے متعلق ہو ۔نہ دوسروں کی کوئی ایسی ہی حاجت اس شخص سے متعلق ہو اس کے لیے خلوت جائز بلکہ افضل ہے خصوصاً ایام فتن وشرور میں۔ یا جبکہ مخالطت کے خلجات وتشویشات اور ایذاؤں پر صبر کرنے کی توقع وہمت نہ ہو۔ احادیث میں جو ترغیب خلوت کی آئی ہے وہ ایسی ہی حالت میں ہے جیسے حدیث میں ہے۔

ورجل معتزل فی شعب جبل	اور آدمی گوشہ نشیں، پہاڑ کی کسی گھاٹی میں۔
لہ غنیمۃ یؤدی حقھا ویعبد	اس کے لیے غنیمت ہے کہ اس کا حق ادا کرے
اللہ او کما قال	اور اللہ کی عبادت کرے۔ (او کما قال)

اور جس شخص کو دوسروں سے یا تو کوئی حاجت ضروری ہو۔ خواہ دنیوی ہو۔ جیسے تحصیل نفقہ عیال جبکہ توکل پر قادر نہ ہو ۔خواہ دینی ہو مثل تحصیلِ علوم ضروریہ ۔اس کے لیے خلوت جائز نہیں ۔اسی طرح اگر اس کے ساتھ خلائق کی حاجاتِ دنیویہ یا دینیہ متعلق ہوں تو بھی خلوت جائز نہیں اور بعض احادیث سے جو نہی خلوت کی مفہوم ہوتی ہے۔ وہ محمول ایسی ہی دونوں حالتوں پر ہے جیسے حضرت عثمان

---

[۱] کمالات اشرفیہ ص۳۰۳ [۲] التکشف ص۹۲

بن مظعون رضؓ کو تبتل سے منع فرمایا گیا کہ اس وقت ان کو بھی تحصیل علومِ دین کی حاجت تھی۔ ادھر مسلمانوں کو بھی ان کی طرف دینی حاجت تھی۔ بالخصوص اعلاءِ کلمۃ اللہ و ترقی اسلام میں بہت بڑی ضرورت تھی۔ یہ تفصیل تو اس خلوت میں ہے جس کو بطریقِ عادتِ دائمی کے لیے تجویز و اختیار کرے۔ ایک خلوت چند روزہ ہے جس کی ضرورت اس وقت مبتدی سلوک کے لیے واقع ہوتی ہے اور صحابہ رضؓ کو اس کی حاجت نہ تھی۔ وجہ یہ کہ مقصودِ اصلی تو تحصیلِ نسبت قلبیہ مع اللہ ہے اور وہ بدوں یکسوئی قلب کے میسر نہیں ہوتی پس صحابہ کو بوجہ وسعتِ ظرف کے مشاغل جلوت اس یکسوئی سے مانع نہ تھے کما قال اللہ تعالیٰ :-

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۔ الآیہ

نہیں غافل بناتی ہے۔ ان کو خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے۔

اور ہم لوگوں کے ظرف اس قدر وسیع نہیں۔ لہٰذا جب تک تعلقاتِ جلوت کی تقلیل نہ کی جائے اس وقت تک یکسوئی جو موقوف علیہ تحصیلِ نسبت کا ہے۔ حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کی ضرورت چند روز کے لیے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جب ملکۂ یادداشت راسخ ہو جاوے پھر اسی تفصیل مذکور میں یہ شخص بھی داخل ہو جاتا ہے۔[1]

اختلاط کے فائدے

۱ :- تعلیم و تعلّم اسی پر موقوف ہے۔ عزلت سے تعلیم و تعلّم کا باب مسدود ہو جائے گا۔

۲ :- اختلاط میں خدمتِ خلق کا موقع ملتا ہے۔

۳ :- جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو شخص عزلت گزیں ہوگا۔ وہ جماعت کے ثواب اور خدمتِ خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔

۴ :- اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے۔

۵ :- بزرگانِ دین سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ بدوں اختلاط کے بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے۔

---

[1] اشرف المسائل ص ۱۶۳

خلوت کے فائدے

گناہوں سے اجتناب ہوتا ہے بشرطیکہ ایسی عزلت ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت کرے۔ کان کی بھی حفاظت کرے دل کی بھی حفاظت کرے۔ قصداً کسی غیر کا خیال دل میں نہ لادے۔ اگر آجائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اسے دفع کر دے۔ ایسی عزلت میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہوگی اور ظاہر ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے تو عزلت اختلاط پر مقدم ہے۔ کیونکہ اختلاط میں گو منافع بہت ہیں مگر ساتھ ہی یہ مضرت بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اختلاط کے ساتھ قلتِ کلام بہت دشوار ہے یہ کام صدیقین و کاملین کا ہے ورنہ اکثر اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنا پڑتی ہیں۔ جن[1] لوگوں کا وقت خلوت کے لیے مخصوص نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔

طریقِ کار

ہر[2] کام کو اپنے اوقاتِ مقررہ پر کریں۔ دنیا کا کام اپنے وقت میں، وردو وظائف اپنے وقت میں۔ حتیٰ کہ گاہ گاہ لطیف اور مختصر مزاح بھی اپنے اور دوسرے مسلمانوں کی تفریح اور تطییبِ قلب کے لیے اپنے موقع میں کر لینا چاہیئے۔ اس طرح سب کام چلتے رہیں گے۔ ورنہ بالکل گوشہ نشین ہونے سے بعض اوقات طبیعت میں شوق اور امنگ کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور بدوں اس کے کام چلنا دشوار ہے۔

خدمتِ[3] خلق اللہ سالک کے لیے از بس نافع ہے۔ مگر ضرورتِ خدمت سے زیادہ اختلاط نہ کریں کہ وہ مضراتِ باطن سے ہے۔ سالک کے لیے عزلت ضروری ہے۔ تعلقات بڑھانا نہ چاہیئے۔ نہ دوستی کے نہ دشمنی کے۔ یہ ذکر اللہ میں خلل انداز ہوگا۔ دوست مل جاویں تو ان سے جان بچاتا نہ پھرے اور دشمن مل جاوے تو اس سے ظاہری اخلاق برتے کہ اس کا ہیجان نہ بڑھے۔ ورنہ وہ اُسکی ایذا کے درپے ہوگا۔

جب[4] تک خلوت میں دل خدا کے ساتھ لگا رہے گا خلوت میں رہیں اور جب خلوت میں انتشار اور ہجومِ خطرات ہونے لگے تو مجمع میں بیٹھیں مگر نیک مجمع میں۔ اس سے خطرات دفع ہوں گے اس وقت یہ جلوت ہی خلوت کے حکم میں ہے۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ صـ ۲۹۹ [2] دعواتِ عبدیت صـ ۱۸۹ ج ۱ [3] التکشف صـ ۱۲۸، ۱۲۷ [4] کمالاتِ اشرفیہ صـ ۵۹

باب دوم۔ فاعلہ مفیدہ بلا خطر

حضرت شاہ عبدالعزیز رح[1] نے دہلی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا سوال کیا کہ کیوں حضرت آپ کے زمانے کی نسبت اور اس زمانے کی نسبت میں کیا فرق ہے۔ ارشاد فرمایا کہ ہمارے زمانے میں تین چیزوں کی کثرت کرتے تھے۔ نماز و تلاوت قرآن و ذکر۔ اور اس وقت لوگوں نے صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے۔ انتہیٰ

راقم نے غور کیا تو قرآن مجید کی آیت میں تینوں چیزوں کو جمع پایا۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ۔ الآیہ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھ جو کچھ وحی کی گئی تیری طرف کتاب سے۔ اور قائم کر نماز کو بے شک نماز بے حیائی اور بری چیزوں سے روکتی ہے اور بے شک اللہ (تعالیٰ) کا ذکر بڑی چیز ہے اور اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے، جو کچھ تم کرتے ہو۔

بلکہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح غالباً صحابہ و تابعین میں حصولِ نسبت کیلئے اسی نماز و تلاوت و دیگر اوراد کی کثرت بشرط خشوع و تدبر کافی تھی۔ ان اشغالِ متعارفہ کی ان کو حاجت نہ تھی (لیکن جس طرح مجاہدات و ریاضت کے باب میں گزرا ہے۔ اسی طرح دیگر ذرائع کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ مقصود کے لیے معین ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک متعلق معدہ یعنی مجاہدہ ہے جس کا ذکر ہو چکا۔ اور دوسرے فاعلہ، اس کی دو قسمیں ہیں۔ مفید بلا خطر[1]۔ اور مفید مع الخطر[2]۔ قسم اوّل میں اذکار۔ اشغال اور مراقبات ہیں) ذکر[2] کے معنی تو ظاہر ہیں۔ شغل تصوّر ذکر کو کہتے ہیں۔ اور مراقبہ تصور مذکور کو کہتے ہیں۔ (اور قسم دوم میں تصور شیخ، عشق مجازی، اور سماع وغیرہ ہیں۔ اب ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے)

---

[1] تعلیم الدین ص۳۵۔ [2] تعلیم الدین ص۵۵

پہلی فصل۔ اذکار کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ۔ الآیہ[1]

وہ لوگ (ہر حال میں، دل سے بھی۔ اور زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں۔ کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

لکلّ[2] شیٔ صقالۃ و صقالۃ القلوب ذکر اللہ رواہ البیہقی

ہر شے کا صیقل (چمکانے والا) ہے اور قلوب کا صیقل اللہ کا ذکر ہے۔

ذکر[3] کے معنی لغت میں "یاد رکھنا" ہے۔ اس کا مقابل نسیان یعنی بھول جانا ہے۔ یاد رکھنا، دو[4] طرح پر ہوتا ہے۔ ایک صوری اور ایک حقیقی۔ صوری زبان سے یاد کرنے اور نام لینے کو کہتے ہیں اور حقیقی، ادائے حقوق کو کہتے ہیں۔ ذکر لسانی (یعنی زبان سے یاد کرنا) بھی ذکر اللہ کا ایک فرد ہے مگر ناقص اور ذکر حقیقی، ذکر اللہ کا فرد کامل ہے۔ اگر دونوں جمع ہو جاویں۔ یعنی ادائے حقوق کے ساتھ ذکر لسانی بھی ہو تو سبحان اللہ درجۂ اکمل ہے۔ غرض کوئی خیر دنیا و آخرت کی نہیں جو ذکر اللہ میں نہ آگئی ہو کیونکہ حقوق اللہ کی بہت قسمیں ہیں۔ جیسے عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات اور حقوق الناس وغیرہ۔ اس میں تمام احکام شریعت آگئے۔ گویا ذکر اللہ کا اصل مطلب، اللہ تعالیٰ سے پورا تعلق پیدا کر لینا ہے اور تعلق[4] کے معنی ہیں لگاؤ۔ اور لگاؤ سے مراد دل کا لگاؤ۔ اور دل کے لگاؤ کے معنی یہی ہیں کہ دل اس کی طرف متوجہ رہے اور دل میں اس درجہ اس کی یاد رہے۔ جس کو عرف میں "دل میں بس جانا" کہتے ہیں اور غفلت عن اللہ تمام امراض کی اصل ہے جو کہ ضد ہے۔ اس تعلق مذکور کی، جو قلب کی غذا ہے اور غفلت کی ضد ہے یاد، تو یاد کو اختیار کرنا چاہیئے اور یاد سے (اصل) مراد کسی لفظ کو زبان سے رٹنا

---

[1] بیان القرآن صـ۸۴ ج ۲ [2] التکشف صـ۴۴۵ [3] تفصیل الذکر صـ۵، صـ۶۔

[4] الباطن صـ۳۲، ۳۹، ۳۸، ۴۰، ۴۳، ۴۴ ملخصاً۔

نہیں ہے۔ بلکہ ہر کام میں یاد رکھنا ہے۔ جس کی علامت یہ ہے کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔
پس[1] ذکر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صورت ذکر ایک حقیقتِ ذکر (جو لوگ پورے اعمال شرعیہ بجا نہیں لاتے اور صرف ذکر لسانی یا قلبی کرتے ہیں ان کو صورتِ ذکر تو حاصل ہے لیکن حقیقتِ ذکر حاصل نہیں) مگر ذکرِ اسمی بھی بیکار نہیں۔ بلکہ نافع و مفید ہے۔ جس کو کامل اور اعلیٰ درجہ حاصل نہ ہو وہ اسی کو غنیمت سمجھے۔ کیونکہ ؎

از صفت وز نام چہ زائد خیال　　واں خیالش ہست دلال وصال

(اور ذکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور دل سے بھی) اور اس[2] کے متعلق مختلف احکام ہیں۔ بعض لفظ کے ساتھ متعلق ہیں۔ ان میں ذکر لسانی افضل ہے۔ باقی ذکرِ قلبی، جس سے ہر وقت قلب میں یاد رہے۔ اجر اس پر بھی ہے۔ مگر اس میں قلب سے ذہول کا قوی اندیشہ رہتا ہے (کیونکہ یہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا دل ادھر ادھر چلا جاتا ہے۔ اور ذاکر یہ سمجھتا ہے کہ میں ذکر میں مشغول ہوں اور ذکر لسانی میں یہ اندیشہ نہیں اس لیے ذکر لسانی کرنا چاہیئے اور اس میں توجہ قلبی رکھنا چاہیئے۔ اگر کچھ دیر ذکر قلبی نہ رہے گا تو لسانی تو باقی رہے گا اور وقت ضائع نہ ہوگا اور اگر صرف قلب سے ذکر کرے گا تو زبان خالی رہے گی) اس اعتبار سے ذکر قلبی سے ذکر لسانی افضل ہے (مگر اس ذکر لسانی کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اس ذریعہ سے قلب میں مذکور کی یاد رچ اور بس جائے) اور اللہ کی نافرمانی روک دے اور فرمانبرداری پر کمر ہمت چست کر دے۔ یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں۔ اس کے لیے یہ حقیقی ذکر نہ ہوں گی۔ بلکہ ذکر کی صورت ہوں گی۔

محققین[3] صوفیہ نے اس راز کو سمجھا ہے کہ اللہ اللہ کرنا گو ذکر نہیں۔ مگر مقصود کے لیے تیار ہونا ہے۔ اس واسطے بحکم ذکر ہے اور اصل مقصود اس ذکر سے اس کے مدلول کا رسوخ فی القلب ہے اور قاعدہ ہے کہ رسوخ کے لیے تکرار مؤثر ہوتا ہے اور اس لیے تجربہ کافی ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ رسوخ کیلئے جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ طریقہ سنت سے ثابت ہو۔

محققین کا قول ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات و کمالات خود ایسے ہیں کہ اس کا کمال اس کو مقتضی

---

[1] اکبر الاعمال صہ ۱۳، ۲۴　[2] تصوف و سلوک صہ ۵۷، ۵۴، ۴۷، ۵۰ ملخصاً　[3] انفاس عیسیٰ صہ ۲۴۶

ہے کہ ان کی طرف توجہ کیجاوے اور ان کی یاد دل میں بسائی جاوے۔ کسی وقت ان سے غافل نہ ہو اگرچہ وہ ہماری طرف توجہ بھی نہ فرمائیں۔ اگرچہ ہمارے ذکر پر کوئی ثمرہ عاجلہ مرتب نہ ہو۔ چہ جائیکہ ایک دوسرا مقتضی بھی موجود ہے۔ یعنی ان کا بندہ کی طرف توجہ فرمانا (ثابت ہے) چنانچہ ارشاد ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ط کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

(مزید براں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

یعنی ذکر اللہ ضرورت کی وجہ سے بھی بڑی چیز ہے۔ خود بھی فی نفسہٖ ضروری ہے اور دیگر ضروریات کی جڑ بھی ہے گو شعائر دین (یعنی دین کی کھلی علامات) سے نہ ہو۔ مگر حقیقت میں یہ شعائر کی بھی جڑ ہے اور تمام اعمال کی بھی جڑ ہے۔ بلکہ (جس طرح) جڑ بدوں شاخوں کے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض ذکر بدوں دوسرے اعمال کے کارآمد نہیں۔

ذکر کے مراتب مختلف ہیں۔ جنت اور دوزخ اور عذاب و ثواب کا یاد کرنا بھی اللہ ہی کی یاد ہے۔ جیسے بعض لوگ باوجود تقاضا کے چوری نہیں کرتے۔ مالگذاری ادا کرنے میں سستی نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے۔ یعنی سزا قید وغیرہ۔ اسی طرح ایسی چیز کو یاد رکھنا جو معاصی سے روک دے اور طاعات پر ہمت کو چست کر دے۔ ذکر اللہ ہے اب اگر کسی کو جنت و دوزخ کی یاد معاصی سے روکے۔ اس کے لیے یہی ذکر اللہ ہے۔ اور کسی کو اللہ اللہ کرنا معاصی سے روکے۔ اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو مراقبۂ ذات معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں اس کے واسطے یہ ذکر اللہ حقیقی نہ ہوں گی بلکہ صورت ذکر میں داخل ہوں گی۔ اس کو اپنے مناسبِ حال ذکر حقیقی کسی محقق سے تجویز کرانا چاہیئے مثلاً بعضوں کیلئے نفس پر جرمانہ مالی کرنا معاصی سے مانع ہوتا ہے۔ ان کے واسطے یہی ذکر ہے یہ ذکر کی حقیقت ہے اور یہی تمام طریق کی بلکہ تمام شریعت کی جڑ ہے اب میں چند آیاتِ (قرآنی) ذکر

لہ اکبر الاعمال صد ۳، ۳۲، ۲۹، ۳۰ تا آخر مع تتمہ۔

کرتا ہوں اور ان آیات کے ذکر سے مقصود یہ دکھلانا ہے کہ تمام اعمال سے مقصود ذکر ہے اور وہی تمام اعمال کی روح اور اساس ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

(۱) اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الی قولہ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ

اس آیت میں اسلام وایمان وقنوت وصدق وصبر وخشوع وتصدق وصوم وحفظ فروج کا ذکر ہے اور ان سب کو ذکر پر ختم کیا ہے۔ جس میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان سب میں سہولت ذکر اللہ سے ہو جاتی ہے۔

(۲) رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

اس میں ذکر اللہ سے عدم غفلت کو، اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ سے عدم غفلت پر مقدم فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عدم غفلت عن الذکر مقدم ہے اس کے بعد عذاب وثواب کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ خوف عذاب ورجاء ثواب بھی ذکر اللہ میں داخل ہیں۔

(۳) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ سے مقصود ذکر ہے۔

(۴) اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ اس کا ربط قریب یہ ہے کہ یہ جملہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى کی علت ہے یعنی نماز میں یہ خاصیت اس لیے ہے۔ اِنَّ فِيْهَا ذِكْرَ اللّٰهِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ فلاجل تاثیر الذکر تنھی الصّلٰوۃ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ الآیۃ۔

(۵) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى الآیۃ اس میں صلوٰۃ کو ذکر پر مرتب فرمایا گیا ہے جس سے ذکر کا دخل نماز میں معلوم ہوا اور روزہ کے بارہ میں ارشاد ہے:۔

(۶) وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ الآیۃ اس کا روزہ میں دخل ہونا مذکور ہے۔

(۷) حج کے بارہ میں ارشاد ہے:۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ

(۸) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ

(۹) فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ

(۱۰) فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ الآیہ ۔ یہ چونکہ حج مرکب ہے اعمالِ متعددہ سے جابجا ذکر کا حکم ہوا ہے تاکہ ہر عمل میں اس سے اعانت ہو۔

(۱۱) لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ وَ أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ الآیہ یہ انفاق سے پہلے ذکر کا امر ہے اور پھر انفاق کا۔ یہ ترتیب ظاہر بتلا رہی ہے کہ ذکر کو انفاق میں دخل ہے جیسا اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جابجا ترتیب اسی پر دال ہے۔

(۱۲) لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ أَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ۔ الآیہ اس میں قربانی کو بھی ذکر اللہ سے خالی نہیں چھوڑا تاکہ اس کے سب احکام و حدود کا اہتمام و رعایت سہل ہو۔ اور اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا۔ یہ تو اعمالِ ظاہرہ کی چند مثالیں تھیں۔ اب اعمال باطنہ میں غور کیجئے تو وہاں بھی ذکر موجود ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

(۱۳) إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا الآیہ اس سے معلوم ہوا کہ خوف و خشیت وہی معتبر ہے جس کا منشا ذکر اللہ ہے نیز معلوم ہوا کہ ذکر کو خوف میں، جو کہ اعمالِ باطنہ سے ہے، دخل ہے۔

(۱۴) وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ الآیہ ۔ اس میں استغفار کو ذکر پر مرتب فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ذکر استغفار کا سبب ہو جاتا ہے۔ و ہٰذا مشاہد۔

(۱۵) فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ الآیہ :۔ ظاہر ترتیب سے ذکر کا دخل شکر میں معلوم ہوتا ہے۔

(۱۶) يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ الآیہ ثبات عند اللقاء، صبر کا اعلیٰ فرد ہے۔ اس کی سہولت کے لیے ذکر کا امر اس پر دال ہے کہ ذکر کو صبر میں بھی دخل ہے۔

(۱۷) يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیہ :۔ اس میں دلالت ہے کہ ذکر کو فکر میں بھی دخل ہے۔

(۱۸) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ الیٰ قولہ تعالیٰ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ الآیہ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو عدمِ انہماک فی الدنیا میں بھی دخل ہے۔

(۱۹) يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا الآیہ :۔ اس میں دلالت ہے کہ ریاء کا علاج ذکر ہے۔

یہ مقامات کا بیان تھا، کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے اب احوال میں غور کیا جائے تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے چنانچہ ارشاد ہے :۔

(۲۰) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ الآیہ اس سے ذکر اللہ کا دخل اطمینان میں جو کہ منقسم ہے مقام و حال کی طرف معلوم ہوا۔

(۲۱) اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ الآیہ :۔ کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان کے دو درجے ہیں۔ ایک تو مقام ہے جو تصدیق واذعان کا درجہ ہے اور ایک حال ہے جس کو سکون وانس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کیلئے ذکر اللہ کو سبب تبلایا ہے۔ اس لیے اس کے عموم میں مقام وحال دونوں داخل ہیں۔

(۲۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ الآیہ :۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو اضمحلالِ وساوس ونزغاتِ شیطانیہ میں دخل ہے نیز ارشاد ہے :۔

(۲۳) وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ الآیہ

(۲۴) وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا الآیہ معلوم ہوا کہ ذکر کو عدمِ تسلطِ شیطان میں دخل ہے۔

(اعمال واحوال کے علاوہ دیگر معاملات میں بھی ذکر کو دخل ہے چنانچہ) ارشاد ہے :۔

(۲۵) اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا مع الآیۃ السابقۃ واللاحقۃ :۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کو اعتقاد بعثت میں دخل ہے

(۲۶) إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ الآیہ اس میں دلالت ہے کہ صحت استدلال میں بھی ذکر اللہ کو دخل ہے اس طرح سے کہ ذکر اللہ سے عقل میں نورانیت آجاتی ہے اس نورانیت کی بدولت خطاء فی الاستدلال سے حفاظت رہتی ہے۔

(۲۷) فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ الآیہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مشغولی معاش کے وقت بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیے نیز اس طرف بھی کہ ذکر سے معاش میں برکت بھی ہوتی ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ میں فلاح کی یہ تفسیر ہو سکتی ہے۔

(۲۸) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ الآیہ اس میں دلالت ہے کہ حقوق نفس ادا کرنے میں ذکر کو دخل ہے۔

(۲۹) إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ الآیہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ امم سابقہ کی ہلاکت سے عبرت حاصل کرنے میں بھی ذکر کو دخل ہے۔

(۳۰) فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ الآیہ:۔ اس میں اشارہ ہے کہ نماز ادا کر کے اپنے کو ذکر سے فارغ نہ سمجھیں بلکہ ذکر میں برابر مشغول رہیں۔

(۳۱) وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰى الآیہ:۔ اس سے اعراض عن الذکر کا موجب خسران دارین[1] ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

(۳۲) فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللّٰهِ الآیہ۔

(۳۳) وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ الآیہ۔

(۳۴) وَذَكِّرْهُمْ بِأَيّٰمِ اللّٰهِ الآیہ عامة للنعم[2] والنقم

(۳۵) وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ

---

[1] یعنی ذکر سے اعراض دونوں جہاں کے گھاٹے کا سبب ہے [2] نعمتوں اور کلفتوں کو عام ہے۔

أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوٰكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ الآیہ۔

ان آیات میں نعمتِ دنیویہ یاد دلائی ہیں۔

(۳۶) فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا الآیہ اس میں یوم قیامت کو کہ یوم ثواب و عقاب ہے یاد دلایا ہے۔

(۳۷) لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ الآیہ۔ اس میں بھی یوم حساب کے یاد نہ رکھنے پر وعید فرمائی ہے۔

(۳۸) فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا الآیہ اس میں یوم اللقاء کو یاد دلایا ہے۔

(مزید برآں[1]) ذکر کی کوئی حد نہیں۔ حالانکہ نماز کے واسطے ایک حد ہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں حرام ہے۔ روزہ کے واسطے حد ہے کہ ایام خمسہ میں حرام ہے۔ زکوٰۃ و صدقہ کے واسطے حد ہے کہ خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی (یعنی بہترین صدقہ وہ ہے جو غنی کے بعد ہو) حج کے واسطے حد ہے۔ مثلاً فرض ادا کرنے کے بعد ایسے شخص کے لیے حج نفل جائز نہیں جس کے اہل و عیال کے حقوق ضائع ہوں ... ذکرِ حقیقی کے لیے کوئی حد نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کان یذکر اللہ فی کل احیانہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور اس کا غیر محدود ہونا یہاں ... سے ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر کرنا گو ممنوع ہے کیونکہ زبان بیت الخلاء میں ہے ... سے خدا کو یاد کرنا، کہ وہی ذکر حقیقی ہے، ممنوع نہیں کیونکہ قلب بیت الخلاء میں نہیں اور یہاں سے صوفیہ کے اس قول کی ایک لطیفہ تائید ہوتی ہے کہ لطیفۂ قلب جسم سے باہر ہے وہ دوسرے عالم میں ہے اسی واسطے پاخانہ میں ذکر قلبی ممنوع نہیں کیونکہ قلب یہاں نہیں ہے۔ اور اگر کوئی اس تحقیق کو نہ سمجھے یا نہ مانے تو وہ یوں کہہ لے کہ قلب ذاکر مثل تعویذ ملفوف کے ہے اور تعویذ ملفوف پاخانہ میں لے جانا جائز ہے اور گو زبان بھی ملفوف

---

[1] اکبر الاعمال صفحہ ۳۰۔

ہے۔ مگر زبان سے ذکر جبھی ہو سکتا ہے جبکہ لبوں اور دانتوں کو حرکت ہو۔ اور جب لب و دندان کو حرکت ہوگی تو زبان مستور نہ رہے گی مکشوف ہو جائے گی۔ اور اگر کوئی شخص بدوں لب و دندان کی حرکت کے پاخانہ میں اس طرح ذکر لسانی کرے کہ زبان مکشوف نہ ہو تو یہ صورۃً جائز ہے۔ مگر وہ ذکر ہی نہیں۔ کیونکہ ذکر و تلاوت کے لیے تصحیح حروف ضروری ہے۔ اور بعض کے نزدیک سماعِ صوت بھی لازم ہے اور اس کے لیے کشف لسان لازم ہے اور بغیر اس کے جو ذکر ہوگا۔ وہ حکماً ذکر ہے نہ حقیقۃً۔

خلاصہ[1] طریق الی اللہ کا کل دو[2] چیزیں ہیں۔ طاعت اور ذکر، معصیت سے طاعت فوت ہو جاتی ہے اور غفلت سے ذکر مختل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنا اصلی کام طاعت و ذکر پر دوام رکھنے اور معصیت سے بچنے کو سمجھے (اور شریعت کے تمام احکام کو بجالائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو احکام کے واسطے ہی سے ہوگی۔ پس ذکر اللہ کے مختلف مراتب ہیں۔ اسی واسطے مشائخ نے ذکر میں تدریجی رفتار رکھی ہے۔ چنانچہ ہمارے مشائخ چشتیہؒ تو ذکر لسانی میں بھی تدریج اختیار کرتے ہیں کہ بارہ تسبیح میں اول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تعلیم ہے۔ یہ مبتدی کے لیے مناسب ہے کیونکہ اس کے دل میں ابھی اغیار بھرے ہوئے ہیں۔ تو اس کو چاہیے کہ ان کو ذہن میں پیش کرکے تیغ لَا سے نفی کرے۔ جب ان کی نفی ہوگئی اور دل اغیار سے خالی ہوگیا تو صرف ذکر اثبات اِلَّا اللّٰہ مناسب ہے۔ مگر اثبات میں بھی اغیار کا ایک گونہ استحضار ہے۔ اس لیے اس کے بعد اَللّٰہ اَللّٰہ بتلاتے ہیں۔ جس میں محض ذاتِ حق پر توجہ ہے مگر اس میں بھی توجہ بواسطہ اسم کے ہے۔ اس لیے بعضے مشائخ اس کے بعد ذکر ھو ھو کی تعلیم کرتے ہیں۔ جس میں ذات پر توجہ ہوتی ہے۔ اسم کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

اقسامِ ذکر اور ان کا دستور العمل

ابتداء[3] میں اسم ذات کی کثرت دوسرے اذکار و اشغال سے زیادہ مناسب ہے۔

(اگرچہ) زیادہ[4] قرب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں ہے کہ یہ ماثور ہے اور دوسرے اذکار الا اللہ یا

---

[1] تصوف و سلوک صہ۵۹، [2] اکبر الاعمال صہ۲۷ [3] کمالات اشرفیہ صہ۱۵۸،

[4] انفاس عیسیٰ صہ۶۲،

اللہ اللہ یکسوئی کی مصلحت کے لیے تجویز ہوتے ہیں۔ واقعی تجربہ سے ذکر ماثورہ اوفق بالطبائع ہے اور اس لیے انفع بھی ہے۔

ایک[1] مختصر دستور العمل جو کہ غایت نافع ہونے کے اعتبار سے میرے نزدیک عطر تصوف کہنے کے قابل ہے۔ اپنے دوستوں کے لیے ہمیشہ کے لیے عمل کرنے کے واسطے ضبط کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ جو اس کے موافق عمل کرنے والا محروم نہ رہے گا۔

طالب کی چار قسمیں ہیں۔ ایک عامی مشغول، دوسرا عامی فارغ، تیسرا عالم مشغول، چوتھا عالم فارغ۔ ان میں ہر ایک کے لیے ایک دستور العمل خاص ہے۔

عامی مشغول کا خاص دستور العمل

اوّل عقائد و مسائل ضروریہ سیکھے اور بہت اہتمام سے اس کا پابند رہے۔ اور جو نئی بات پیش آئے علماء سے پوچھے۔ اگر ممکن ہو تو تہجد اخیر شب میں پڑھے۔ ورنہ عشاء کے بعد وتر سے پہلے کچھ نفلیں بجائے تہجد کے پڑھ لے اور بعد پانچوں نمازوں کے یا جن کے بعد فرصت ہو۔ سبحان اللہ سو بار اور لا الٰہ الا اللہ سو بار۔ اور اللہ اکبر سو بار اور سوتے وقت استغفار سو بار پڑھا کرے۔ اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے درود شریف زبان سے جاری رکھے اور اگر قرآن مجید پڑھا ہوا ہو تو روزانہ کسی قدر قرآن کریم کی تلاوت بھی کر لیا کرے۔

عامی فارغ کا خاص دستور العمل

عامی فارغ کا خاص دستور العمل بھی وہی ہے جو عامی مشغول کے لیے بیان کیا گیا۔ مگر اتنے امور اور زائد ہیں۔ اگر ممکن ہو تو پیر کی خدمت میں جا پڑے۔ اگر پیر کے پاس نہ رہ سکے تو اپنے وطن ہی میں رہے

---

[1] قصد السبیل صنا تا ۱۲

خواہ گھر میں یا کسی مسجد میں۔ مگر جہاں تک ہو سکے خلق سے علیحدہ رہے۔ جب تک کوئی دنیا یا دین کی ضرورت نہ ہو۔ مخالطت نہ کرے۔ تنہائی میں جو اوقات اپنی ضروری حاجت و آرام سے بچیں اس میں خواہ قرآن کی تلاوت مع مناجاتِ مقبول خواہ نوافل خواہ درود شریف خواہ استغفار میں مشغول رہے اور اگر کچھ خواندہ ہو تو تھوڑے وقت میں دین کی کتابیں بھی جو اردو و فارسی میں ہیں کسی معتبر عالم کو دکھلا کر مطالعہ کرے۔ جہاں شبہ رہے کسی محقق عالم سے پوچھ لے۔ کبھی کبھی نفلی روزہ بھی رکھ لیا کرے۔

عالمِ مشغول کا خاص دستور العمل

اوقاتِ فارغہ میں کوئی وقت، ایسا جس میں افکار و تشویشات سے کسی قدر خالی ہو اور معدہ پُر نہ ہو۔ نہ بھوک کا تقاضا ہو۔ معین کر کے اس میں بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) سے چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) تک جسقدر ممکن ہو خلوت میں بیٹھ کر اسم ذات یعنی اللہ اللہ با وضو خفیف جہر و ضرب کے ساتھ قلب کو متوجہ کر کے پڑھا کریں اور تہجد کی پابندی کریں اور کسی وقت قرآنِ کریم کی تلاوت اور مناجاتِ مقبول کی اصل عربی کی ایک منزل کا التزام رکھیں۔ اور اگر مدرس ہیں فبہا ورنہ ایک معتد بہ وقت تدریس طلبۂ علمِ دین میں ضرور صرف کریں اور گاہ گاہ ضروری احکام کا وعظ کہہ دیا کریں۔ شیخ سے دور رہ کر شغل نہ کریں۔ البتہ اگر وہ تجویز کرے تو مضائقہ نہیں۔

عالمِ فارغ کا خاص دستور العمل

چند روز جس قدر میسر ہو شیخ کی خدمت میں رہ کر مشغول ذکر رہیں اور ان کے لیے اذکار میں سے اس قدر کافی ہیں۔ یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دو سو بار اِلَّا اللّٰهُ چار سو بار اور اَللّٰهُ اَللّٰهُ بضمِ ہائے اوّل و سکونِ ہائے ثانی چھ سو بار، اور صرف اَللّٰهُ سو بار۔ یہ تیرہ تسبیح ہیں مگر اصطلاح میں بارہ کہلاتی ہیں۔

طریق ذکر دوازدہ تسبیح

بعد[1] نماز تہجد کے توبہ و استغفار، عجز و انکساری سے، کرکے اور ہاتھ اٹھا کے یہ دعا بحضور قلب پڑھے اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قَلْبِیْ عَنْ غَیْرِكَ وَ نَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ یَااَللّٰہُ یَااَللّٰہُ یَااَللّٰہُ تین بار یا سات مرتبہ تکرار کرے۔ اور گیارہ بار استغفار اور گیارہ مرتبہ دُرود شریف پڑھ کر چار زانو بیٹھے اور داہنے پاؤں کے انگوٹھے سے اور جو انگلی اس کے پاس ہے اس سے رگ کیماس کو، کہ بائیں زانو کے اندر ہے۔ محکم پکڑے۔ اور کمر کو سیدھا رکھے پھر دلجمعی سے ہیبت اور حرمت اور تعظیم تمام کے ساتھ خوش الحانی سے ذکر شروع کرے۔ بعد أعوذ و بسم اللہ کے باخلاصِ تمام تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت پڑھ کے سر کو قلب کی طرف کہ زیرِ پستانِ چپ بفاصلہ دو انگشت کے واقع ہے۔ جھکا کے کلمۂ لَا کو قوت اور سختی سے دل کے اندر سے کھینچے اور آلہ کو داہنے مونڈھے پر لے جاکر سر کو پشت کی طرف مائل کرکے تصور کرے کہ غیر اللہ کو دل میں سے نکال کر پس پشت ڈال دیا اور دم کو چھوڑ کر لفظ اِلَّا اللّٰہُ کو زور اور سختی سے دل پر ضرب مارے اور تصور کرے کہ عشق اور نورِ الٰہی کو دل میں داخل کیا۔ اسی طرح اس نفی و اثبات کو فکر اور ملاحظہ اور واسطے کے ساتھ دو سو بار کہے۔ اور ذکر میں نو بار لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور دسویں مرتبہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہے۔ بعد اس کے بطور سابق تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہے لیکن مبتدی کلمۂ لَآ اِلٰہَ میں لا معبود اور متوسط لا مقصود اور منتہی لا موجود ملاحظہ کرے۔ اس کے بعد لمحہ دو لمحہ مراقب ہو کے تصور کرے کہ فیضانِ الٰہی عرش سے میرے سینے میں آتا ہے۔

طریقِ ذکر اثباتِ مجرد

پھر دو زانو بیٹھے اور کمر سیدھی کرے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لے جا کے لفظ الا اللہ کو زور اور سختی سے دل پر ضرب کرے۔ اس کو چار سو بار دمادم کرے پھر بطور سابق تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہے اور لمحہ دو لمحہ مراقب رہے۔

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۸۷

طریقِ ذکر اسمِ ذات

پھر ذکر اسمِ ذات اَللّٰہُ اَللّٰہُ کا کرے۔ اس طرح سے کہ اوّل حرف ہائے لفظ اَللّٰہُ کو پیش اور دوسرے ہائے لفظ اَللّٰہُ کو ساکن کرے۔ یعنی جزم دے اور آنکھیں بند کرکے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لاکر لفظ مبارک اَللّٰہُ اَللّٰہُ کی دونوں ضرب جہر اور قوت سے دل پر ملے اس ذکر اسمِ ذات دوضربی کو چھ سو بار دمادم کرے۔ لیکن دسویں گیارھویں بار اَللّٰہُ حَاضِرِیْ، اَللّٰہُ نَاظِرِیْ، اَللّٰہُ مَعِیْ (ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ میرے پاس ہیں اور مجھے دیکھ بھال رہے ہیں اور میرے ساتھ ہیں) مع ملاحظہ معنی کے کہتا رہے۔ تاکہ کیفیت اور لذت ذکر کی اور دفع غفلت وخواب حاصل ہو۔ بعد اس کے بطور سابق تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہے پھر ایک ضربی اسی طرح سر کو داہنے مونڈھے کی طرف موڑ کر لفظ مبارک اللہ کو دل پر سو بار دمادم کرے بعد تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہہ کر درود شریف اور استغفار گیارہ گیارہ بار پڑھ کر دعا مانگے اور مناجات کرے۔

اس ذکر کے بعد اگر نیند کا تقاضا ہو۔ ذرا سو جاوے۔ پھر بعد نماز صبح تلاوتِ قرآن مجید اور ایک منزل مناجات مقبول پڑھنے کے بعد بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جسقدر سہل ہو۔ اسمِ ذات خفیف جہر اور معتدل ضرب سے خلوت میں بیٹھ کر کرے اور دوپہر کو قیلولہ کرے بعد ظہر اسی طرح بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر سہولت کے ساتھ عصر کے قبل قبل ہو جاوے اسم ذات کا ورد کرے اور عصر کے بعد اگر شیخ فارغ ہو تو مغرب تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے اور اگر فارغ نہ ہو۔ یا وہاں موجود ہی نہ ہو یا اس کے قلب میں زیادہ اشتیاق نہ ہو تو جنگل باغ ندی نہر وغیرہ کی سیر کو چلا جاوے۔ اگر شیخ موجود ہو تو اس سے اجازت لے کر جاوے۔

ذکرِ جہر اور ضرب

ان[1] (مذکورہ بالا اذکار) میں خفیف سا جہر اور معتدل ضرب قلب کرے۔ مگر جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں۔ ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے اور حدیث میں جو وارد ہے اِنَّکُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا (ترجمہ: بیشک تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو) میرے نزدیک اسی اعتقاد کی نہی پر

---

[1] تصد السبیل صفحہ ۱۲ [2] تصد السبیل صفحہ ۲۰،۳۰

محمول ہے اور بعض نے جہر مفرط کو اسی کا محمل بنایا ہے جس سے دوسرے لوگ متاذی ہوں۔ مثلاً نائمین کو تشویش ہو اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے منع فرمانے کی بھی یہی توجیہات ہیں۔ ورنہ جہر فی نفسہ جائز ہے۔ جیسا بخاری میں حضرت ابن عباس رضؓ سے رفع الصوت بالتکبیر کا علامت انصراف عن الصلوٰۃ (نماز کا ختم ہونا) عہد نبویؐ میں اور سنن میں وتر کے بعد سُبحانَ المَلِكِ القُدُّوسِ میں رفع صوت مروی ہے۔ معلوم ہوا[1] کہ جہر من حیث ہو۔ جہر (اس حیثیت سے کہ وہ جہر ہے) عبادت نہیں اور اگر مقصود تو ذکر کو سمجھیں اور جہر کو کسی مصلحت سے اختیار کریں جیسے دفعِ خواطر و حصولِ جمعیت وغیرہ تو یہ صورت ممنوع نہیں۔ بشرطیکہ کوئی اور عارض مانع نہ ہو۔ بہر حال جہر مفرط تو مطلقاً ناجائز ہے۔ جس سے خود کو مشقت ہو یا دوسروں کو اور جہر معتدل میں تفصیل ہے۔ اگر خود جہر کو بقصدِ ثواب اختیار کرے۔ تو یہ بھی ناجائز اور بدعت ہے (اِلَّا فِیْمَا وَرَدَ الشَّرْعُ بِالْجَهْرِ فِيْهِ كَالْحَجِّ بِالتَّلْبِيَةِ وَالْجَهْرِ بِتَكْبِيْرَاتِ التَّشْرِيْقِ وَنَحْوِهَا ١٢) اور اگر مقصود نفسِ ذکر ہو اور جہر اعتدال سے ہو اور اختیار للمصلحت ہو تو وہ بدعت نہیں۔ بلکہ ایسا جہر شریعت سے ماذون فیہ بلکہ احادیث میں وارد ہے۔

جہر[2] میں یہ حکمت سمجھی گئی ہے کہ اس سے وساوس و خطرات کم آتے ہیں۔ سو یہ فائدہ خفیف جہر سے بھی حاصل ہے اسی طرح ضرب بھی قربت نہیں ہے اس میں ایسی ہی حکمت طبیہ ہے وہ یہ کہ حرکت سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے رقت اور رقت سے تاثر اور تاثر معین ہوتا ہے اطاعت اور محبت میں اور وہ مقاصد میں سے ہیں۔ پس ضرب ذریعۂ مقصود ہونے سے مقصود بالغیر بن جاتا ہے۔ لیکن زیادہ ضرب سے قلب میں خفقان پیدا ہونے کا ڈر ہے۔ لہٰذا اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔

ذکر کے فائدے

آخرت میں ثمرہ تو یقینی ہے اور اصل وعدہ عطائے ثمرات کا آخرت ہی میں ہے لیکن دنیا میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تو اس کے قلب پر علوم عجیبہ و معارف جن کے باب میں مولانا کا ارشاد ہے۔

---

[1] العید والوعید صفحہ ۵ [2] قصد السبیل صفحہ ۱۳ ۔ تکبیر کے ساتھ آواز کا بلند کرنا۔

بینی اندر دلِ علومِ انبیا ٭ بے کتاب و بے معید و اوستا

اور واردات غریبہ و مواجید مثل ذوق و شوق، محبت و انس و ہیبت و انکشاف اسرار احکام و حسن معاملہ فیما بینہ و بین اللہ اور تنبیہ علی ما یصلح للتنبیہ و امثالہا فائض ہوں گے جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہے

اگر ذکر اللہ[1] کو اپنا اصلی کام سمجھ لو جو کام اس میں مخل ہو گا اس سے جی گھبرائے گا اور معاصی سب اس میں مخل ہیں۔ اس لیے ان سب سے نفرت ہو جائے گی۔ پھر رفتہ رفتہ فضول مباحات سے بھی نفرت ہونے لگے گی۔

طریقِ کار ہر وقت اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھتے رہیں اور کبھی مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بس ہر وقت ذکر کا ہی دھیان رکھیں اور خالی وقت میں تسبیح ہاتھ میں رکھیں۔ یہ مذکرہ ہے ذکر یاد رہتا ہے۔

دوسری فصل - اشغال

شغل کی حقیقت اشغال[2] کا مقصود اصلی یہ ہے کہ قلب کا انتشار جو بوجہ تشویشِ افکار کے ہے۔ دفع ہو کر جمعیتِ خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو۔ تاکہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام الی اللہ جو کہ مبتدی کو بوجہ غیب ہونے مدرک کے اور مزاحم ہونے افکار مختلف اور حسیات حاضرہ کے متعذر رہے۔ سہل ہو جاوے۔ اشغال مختلفہ اسی کے حیل و طرق ہیں۔ نماز میں سترہ کا حکم، اس عمل کا ماخذ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بتصریح علماء اسرار مقصود سترہ سے بھی جمع خاطر اور ربطِ خیال و نفی انتشار ہے۔ جیسا ابنِ ہمام نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے اور سترہ اس کی تدبیر ہے۔

غرض[3] جتنے اشغال ہیں وہ جمعِ خاطر ہی کے لیے ہیں مقصود بالذات نہیں اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے کہ جوگیوں تک سے بعض اشغال لیے ہیں مثلاً حبسِ دم جو جوگیوں کا شغل ہے

---

[1] کمالات اشرفیہ صـ ۲۹۳، ۱۸۱، ۲۰۴ [2] التکشف صـ ۱۱۲ [3] تصوف و سلوک صـ ۳۹۔

مگر چونکہ یہ ان کا مذہبی شعار نہیں۔ اور خطرات دفع کرنے کیلئے نافع ہے اس لیے اس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں نہ اس میں تشبہ ممنوع ہے کیونکہ جو چیز کسی دوسرے فرقہ کا نہ مذہبی شعار ہو نہ قومی۔ محض تدبیر کے درجہ میں ہو اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لیے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے چونکہ حبسِ دم بھی دفع خواطر کی محض ایک طبعی تدبیر ہے۔ اس لیے اس کا استعمال جائز ہے۔ کیونکہ یہ اخذ تدبیر میں ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں۔ اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے تو یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا محض ایک تدبیر تھی۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔

طریق کار ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت وخشوع معلوم ہو اور وہ روزانہ بڑھتی جائے۔ اور وساوس وخطرات میں کمی ہونے لگے اور دل لگا کر کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں اور اگر ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی و خشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل بھی کر لیا جائے۔

شغل انحد، سرمدی اور سلطان الاذکار

اشغال تو بہت ہیں مگر میرے نزدیک انفع اور اسہل (سب سے زیادہ مفید اور آسان) انحد ہے۔ وآنرا ذکر سرمدی وسلطان الاذکار مے گویند (اور اس کو ذکر سرمدی اور سلطان الاذکار کہتے ہیں)۔

لہ عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو یہ
الدُّعَاءَ وَفِیْهِ اَنْ تَرْزُقَنِیَ	دعا سکھلائی اور اس دعا میں یہ بھی ہے کہ
اَلْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ وَالْعِلْمَ	مجھ کو قرآن مجید اور (اس کا) علم عطا

لہ [illegible] السبیل [illegible] ۱۹۷۰ ۲ [illegible] ۱۷۴

وَاَنْ تخلطه بلحمی و دمی — فرمایئے اور اس کو میرے گوشت اور خون اور
وَسَمْعِی وَبَصَرِی الحدیث — گوش اور چشم میں پیوست اور مخلوط کر دیجئے

رواہ رزین

اس حدیث میں تخلیط القرآن بجمیع الاعضاء والاجزاء کی دعا ہے اور حدیث میں ہے

اِن اللہ لا یستجیب الدعاء — بے شک اللہ غیر متوجہ قلب کی دعا قبول نہیں
عن قلب لاہٍ ۔ — فرماتے۔

پس اس حدیث سے اس دعا کے وقت اس خلط کا تصور و استحضار ضروری ہوا۔ اور اللہ کا کلام اور اللہ کا نام اس تصور میں مساوی ہیں۔ پس ہر بُنِ مُو سے "اللہ ہو" کے جاری ہونے کا تصور۔ اس سے نافع ہونا ثابت ہو گیا جو اس شغل کا طریقہ ہے۔ (اور وہ یہ ہے کہ)

از سرتا قدم بہر بُنِ مُوئے وجود خود بجمیع — سر سے قدم تک اپنے وجود کے ہر بن مو سے
ہمت متوجہ شود۔ یعنی بداند کہ در آمد و — پوری ہمت کے ساتھ متوجہ ہو۔ یعنی یہ سمجھے
رفت نفس از ہر بن مُوئے اللہ ہو جاری — کہ نفس کے آنے جانے میں ہر بال کی جڑ
است۔ (ضیاء القلوب) — سے اللہ ہو جاری ہے۔

اس[1] کا اچھا وقت آخر شب ہے۔ بارہ تسبیح کے بعد۔ دوازدہ تسبیح پر جب ایک چلہ گذر جاوے اس وقت شروع کرنا چاہیئے لیکن حبس نہ کرے۔ آجکل اکثر اس سے قلب و دماغ دونوں ماؤف ہو جاتے ہیں۔ صرف آنکھیں ویسے ہی بند کر لے۔ اور کانوں کو انگشت شہادت سے ذرا زور سے بند کر لے۔ اس سے کان میں ایک صوت لاَ تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ پیدا ہو گی۔ اس آواز کی طرف قلب کو متوجہ رکھے۔ اور زبان سے یا قلب سے اسم ذات کا ورد رکھے۔ تاکہ اتنا وقت غفلت میں نہ گزرے۔ کیونکہ اس صوت میں مشغول ہونا ذکر نہیں۔ کیونکہ یہ صوت نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی صفت تو ہے نہیں۔ جیسا بعض کو دھوکہ ہو گیا۔ بلکہ عالم غیب میں سے کسی مخلوق کی بھی نہیں۔ صرف اسی کے دماغ میں ہوا بند ہو کر متموج ہونے لگتی ہے۔ باوجود اس کے پھر اس کی طرف مشغول کرنا صرف اس لیے تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ صوت محسوس ہے اور لذیذ ہے۔

---

[1] قصد السبیل ص ۱۶

بلکہ بعض اوقات اس کے اندر نہایت دلربا و دلفریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں کہ شاغل کو محو کر دیتی ہیں۔ اور محسوس و لذیذ چیز کی طرف متوجہ ہونے سے طبعاً دوسرے خطرات گم ہوجاتے ہیں۔ تو اس سے ذہن کو ایک طرف توجہ تام کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ پھر شغل چھڑا کر اس توجہ کو مقصود حقیقی کی طرف منصرف کر دیتے ہیں جسکی طرف اولاً متوجہ ہونا بوجہ اس کے غائب عن الحواس ہونے کے احیاناً محتاج تکلف تھا

شغلِ اسمِ ذات

آنکہ در[1] پارچہ کاغذ شکل قلب صنوبری برنگ سرخ یا نیلگوں کشیدہ و دراں لفظ اللہ بآبِ طلا یا نقرہ بنویسد و پیوستہ نظر براں دارد۔ تاکہ نقش ایں اسم در دل پدید آید یا صورت وہمی را بر صفحۂ دل بنویسد و مدام متوجہ باں باشد تا غیب از حواس پدید آید۔

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر قلب صنوبری کی شکل سرخ یا نیلگوں کھینچ کر اس پر آبِ زر یا نقرئی پانی سے لفظ اللہ لکھے اور ہمیشہ اس پر نظر رکھے تاکہ اس نام کا نقش دل پر رونما ہوجائے یا وہمی صورت صفحۂ دل پر لکھ لے اور ہمیشہ اس طرف متوجہ رہے تاکہ غیب حواس سے رونما ہوجائے۔

حبسِ بصر

فِی صَلٰوۃِ[2] رسولِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم لا یُجَاوِزُ بَصَرُہٗ اِشَارَتَہٗ۔ اخرجہ ابوداؤد

نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ آپ کے اشارہ بالسبابہ سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

قال یا انس اِجْعَلْ بَصَرَکَ حَیْثُ تَسْجُدُ رواہ البیہقی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس اپنی نگاہ کو سجدہ کی جگہ رکھو۔

حبس البصر، ربط النظر لاجتماع الخواطر ایک شغل ہے کہ کسی چیز کی طرف نگاہ جما کے دیکھا جاوے مقصود اس سے اور جمیع اشغال سے اجتماعِ خواطر و یکسوئی ہوتی ہے۔ ان دونوں حدیثوں

---

[1] تعلیم الدین صہ ۸۶ ، [2] التکشف صہ ۳۶۹، ۴۴۱

سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ نیز تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اس عمل سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے۔

جنس دوم

هُوَ يُصَلِّي وَلِجَوْفِهِ أَزِيزٌ كَأَزِيزِ الْمِرْجَلِ يَعْنِي يَبْكِي [۱] رواه النسائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کے سینہ میں ایک ایسی آواز تھی جیسے (پکنے کے وقت) ہانڈی کی آواز ہوتی ہے۔ یعنی آپ رو رہے تھے۔

تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ کیفیت غلبہ بکا اور اس کے ضبط سے ہوتی ہے اور یہ بھی تجربہ اکثریہ سے ثابت ہے کہ غلبہ کے وقت ضبط کرنے سے سانس رک جاتا ہے۔ پس جو امر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے لازم آگیا۔ اس کے محمود و نافع ہونے میں تو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پس اگر کوئی اس کا تحصیلاً واکتساباً التزام واہتمام کرے تو کیا حرج ہے۔ (یعنی جائز ہے)۔

(نوٹ) اگر شیخ کامل کوئی اور مراقبہ یا شغل مناسب تجویز کرے۔ اس کا اتباع کرے۔ لیکن اشغال میں شغل رابطہ اور تصور شیخ اور مراقبات میں مراقبہ وحدۃ الوجود بوجہ اس کے کہ خواص کو بھی مضر ہوتا ہے۔ متروک ہے۔

تیسری فصل مراقبات

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا [۲] الآیہ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ اللہ کی ایسی عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس

---

[۱] الکشف، صہ ۴۷۰، [۲] قصد السبیل صہ ۱۷، [۳] تعلیم الدین صہ ۷۹۔

یراک رواہ مسلم۔ احفظ اللہ تجدہ تجاھک۔ کو نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھو اپنے مقابل پاؤ گے۔
رواہ احمد والترمذی

ماہیت وحقیقت

حق[1] تعالیٰ کی ذات وصفات۔ یا کسی مضمون کا دل سے اکثر احوال میں یا ایک محدود وقت تک اس غرض سے کہ اس کے غلبہ سے اس کے مقتضا پر عمل ہونے لگے، تدبر تام سے متوجہ ہونا اور اس کا تصور مواظبت کیساتھ رکھنا مراقبہ کہلاتا ہے جو اعمال مقصودہ قلب ہیں سے ہے۔ ان[2] مراقبات سے تصور ناقص راسخ ہو جاتا ہے اور اسی رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہیں۔

مراقبہ[3] کے متعلق دو چیزیں اور ہیں۔ ایک مشارطہ کہ مراقبہ سے پہلے ہے۔ دوسری محاسبہ جو مراقبہ کے بعد ہے۔ مشارطہ یہ کہ روزانہ صبح کو اٹھ کر تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کو خوب فہمائش کرے کہ دیکھو فلاں فلاں کام کیجیو۔ فلاں فلاں مت کیجیو۔ اس کے بعد مراقبہ یعنی نگہداشت اس معاہدے کی رکھنا جب دن ختم ہو پھر سوتے وقت محاسبہ کرے یعنی صبح سے شام تک جو اعمال کیے ہیں ان کو تفصیلاً یاد کرے جو نیک کام کیے ہوں۔ ان پر شکر الٰہی بجالائے۔ جو بُرے کام کیے ہوں یا نیک کاموں میں کوئی آمیزش ہوگئی ہو۔ اس پر نفس کو ملامت و زجر و توبیخ کرے اور اگر خالی زجر و توبیخ کافی نہ ہو تو کچھ سزا بھی تجویز کر کے عملدرآمد کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ الآیۃ — چاہیے کہ دیکھ بھال لے ہر شخص کہ کل قیامت کے لیے کیا چیز آگے بھیجی ہے۔

مراقبہ محبت حق

یہ[4] مراقبہ کیا کرے کہ حق تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے اور حق تعالیٰ مجھ کو چاہتے ہیں۔ یہ مراقبہ بیحد مفید ہے۔ اس سے بندہ خواہ کیسی ہی مصیبت اور پریشانی میں ہو۔ مگر جہاں یہ مراقبہ کیا۔ ساری پریشانی رفو چکر۔ کیونکہ یہ یقین کرے گا کہ جب اللہ تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے تو اس مصیبت میں ضرور میرا کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ ورنہ محبت میں محبوب کو کون تکلیف دیتا ہے۔

---

[1] الکشف صفحہ ۴۲۳، ۴۲۴ [2] انفاس عیسیٰ صفحہ ۸۷ [3] تعلیم الدین صفحہ ۱۴۰ [4] القول الجمیل صفحہ ۱۹ ج ۲۔

مراقبۂ نماز
نماز[1] میں حضوری حاصل ہونے کے کئی طریق ہیں۔ ایک یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں (۲) یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہا ہے (۳) یہ کہ معنی کا خیال رکھنا (۴) ہر لفظ کو بقصد منہ سے نکالنا کہ کوئی لفظ محض یاد سے نہ پڑھے ہر ہر لفظ پر قصد کرنا چاہئے کہ اب یہ کہونگا (۵) یہ سمجھنا کہ یہ میری عمر کی آخری نماز ہے۔ شاید اب عمر کا خاتمہ ہوجائے۔ ان طریقوں میں سے جو طریق آسان اور دلچسپ ہو اس کو اختیار کرلے۔

مراقبۂ تلاوت
قرآن مجید جب پڑھنے کا ارادہ کرے تو تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ لے کہ میں اللہ تعالیٰ کے روبرو بیٹھا ہوں جس طرح شاگرد استاد کے روبرو ہوتا ہے اور بطور سبق کے اللہ تعالیٰ کو سنا رہا ہوں۔ اس مراقبہ سے جو کیفیت ہوگی خود معلوم ہوجائے گا۔

مراقبۂ رزق
خدا[2] اگر کسی کو بےفکری سے کھانے کو دے تو یہ نعمت ہے۔ لیکن اس میں ایک مضرت بھی ہے کہ کبر، ناز و عجب، غرور، غفلت، غریبوں کی تحقیر۔ کمزوروں پر ظلم اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا علاج اور تدارک یہ ہے کہ تدبر و تفکر (مراقبہ) سے کام لے اور سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اپنا فضل فرمایا ہے ورنہ میں بالکل نااہل تھا۔ مجھ میں کوئی کمال بھی نہ تھا بلکہ اپنے گناہوں پر نظر کرکے سوچے کہ میں سزا کا مستحق تھا اور اگر بالفرض مجھ میں کوئی کمال بھی تھا تو مجھ سے بہت زیادہ کمال رکھنے والے پریشان حال پھرتے ہیں۔ پھر اس کا فضل ہی تو ہے جو اس نے مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اب میں ناز کس پر کروں ؎

اگر روزی بدانش در فزودے ؛ ز ناداں تنگ تر روزی نبودے ؛

یعنی رزق کا مدار عقل پر نہیں۔ لیاقت سے رزق کا ملنا قارون کا عقیدہ ہے۔

مراقبہ دفع معاصی
گناہ[3] کا علاج بجز ہمت کے کچھ نہیں۔ اگر رغبت الی المعاصی کی کثرت ہو تو ہمت کرکے ایسے وقت میں عقوبت دوزخ کو یا حق تعالیٰ کے بصیر ہونے کو یاد کرلیا کرے۔ یہ ہمت کو قوی کرے گا۔ چند بار ایسا کرنے سے یہ (گناہ سے) مانع ہوجایا کرے گا۔

---

[1] تعلیم الدین صد ۸۹ [2] کمالات اشرفیہ صد ۲۷۴ ، [3] انفاس عیسیٰ صد ۸۲

مراقبۂ رویت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی۔الآیہ[1] کیا اس کو خبر نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

یا ملاحظہ معنی صورت رویت حق تعالیٰ خود را در ملاحظہ دار دو براں مواظبت نماید تا وجدان صورت ملکہ گردد۔

یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن پر مطلع ہے اور کوئی بات کسی وقت اس سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی عظمت و قدرت و جلال اور اس کے عذاب و عقوبت کو بھی یاد کرے اس کی مواظبت سے وہ دھیان بندھنے لگے گا۔ پھر کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف اس سے نہ ہوگا۔

مراقبۂ ارض

ہماری[2] اصل تو خاک ہے۔ لہٰذا ہم کو خاک بنکر رہنا چاہیئے۔ مٹی ہو کر تکبر کرنا نہایت ہی نازیبا ہے۔ پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہو جائے گا اور ایک دن ہم زمین کے اوپر سے اس کے اندر پہنچ جائیں گے تو اس کیلئے ہم کو ایسے اعمال کرنے چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں۔ اس مراقبہ کو اصلاح حال میں بہت ہی تاثیر ہے۔

مراقبۂ تفویضیہ عبدیہ

یہ مراقبہ اور استحضار کہ ہم کون ہیں۔ اپنے اپنے تصرف کرنے والے یا تجویز کرنیوالے تصرف اور تجویز کا محبوب حقیقی ہی کو حق ہے اور وہ جو تصرف اور تجویز فرماتے ہیں۔ سب خیر محض ہے۔ گو اس وقت ہماری سمجھ میں نہ آوے۔ بعد میں آ بھی جاتا ہے۔ البتہ جن اعمال کا ہم کو امر فرمایا ہے وہ خود ان کا تصرف ہے۔ اس کا اہتمام یہ اپنا تصرف نہیں انہی کے تصرف کو تسلیم کرنا ہے اور اس کے ساتھ اس یقین کا تازہ اور قوی کرنا کہ اگر ان کے کسی تصرف سے جس کا بندہ کو تحمل نہ ہو سکے صحت برباد ہو جائے بلکہ جان بھی ختم ہو جائے تو ایسا تصرف سب سے بڑی رحمت ہے نیز یہ بھی پیش نظر رکھا جائے۔

زاں بلاہا انبیاء برداشتند + سر بچرخ ہفتمیں افراشتند

سپر دم بہ تو مایۂ خویش را + تو دانی حساب کم و بیش را

(انبیاء نے مصائب برداشت کیے۔ ان کے باعث آسمان ہفتم تک سربلند ہوئے۔ میں اپنے آپ کو تیرے

---

[1] تعلیم الدین صہ ۷۹،۸۸ [2] انفاسِ عیسیٰ صہ ۸۳،۸۴، ۳۲۳

حوالہ کرتا ہوں کم و بیش کا حساب تو خود جانتا ہے)

مراقبۂ فنا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ (جو کچھ زمین پر ہے فانی ہے اور تیرے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحب بزرگی اور انعام والا ہے۔

بالملاحظہ معنی صورت یقینی فنا جملہ موجودات وبقائے آں ذات بے کیف تصور نماید وبچشم دل آنرا بہ بیند ودراں محو شود۔ تاکہ ایں معنی بوجہ احسن جلوہ گر گردد وفنائے سالک واضمحلال عقل وعلم رونماید۔ (تمام موجودات کی فنا اور اس ذات بے کیف کی بقاء کا تصور کرے اور دل کی آنکھوں سے اس کو دیکھے۔ اور اس میں مستغرق ہو جائے تاکہ یہ معنی احسن طریقہ سے جلوہ گر ہو جائیں اور فنا سالک اور عقل وعلم کا اضمحلال حاصل ہو جائے)[1]

مراقبۂ سفر آخرت

جس[2] طرح اسفار دنیا میں موانع سفر سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اتفاقیہ نقصان پر طبیعتوں میں آثار غم پاتے ہیں۔ اور جو امور معین ہوتے ہیں۔ ان کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو چاہیئے کہ اپنی ہر ہر نقل وحرکت کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ آیا یہ ہمارے سفر آخرت کے واسطے عائق ہے یا معین۔ اگر کوئی حالت یا فعل ہمارا مانع سفر ہے تو اس سے احتراز کریں۔ اور جو امور اس سفر میں ہمیں معین ہیں۔ رغبت کے ساتھ بطیب خاطر اختیار کریں۔ یہ خیال رکھیں کہ کہیں کوئی خار راہ ہمارے اس شاہراہ پر رونما نہ ہو۔ خدا کا راستہ طویل ہے اور ہم اس پر چل رہے ہیں۔ تو ہم ہر وقت سفر میں ہوتے۔ اے صاحب جس کو ہر وقت سفر درپیش ہو۔ وہ کیونکر مطمئن ہو کر بیٹھ سکتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اسی باب میں اس طرح بیان کی گئی ہے کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان کہ آپ ہمیشہ فکر وسوچ اور رنج وغم میں رہتے تھے اور اسی فکر وغم کا یہ اثر تھا کہ آپ کبھی کھل کر ہنستے نہ تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کان جل ضحکتہ التبسم کہ آپ کا ہنسنا یہ ہوتا تھا کہ تبسم فرما لیتے تھے۔ (اور یہ بھی ہماری خاطر سے تاکہ لوگوں کا کلیجہ پھٹ نہ جائے۔ اور

---

[1] تعلیم الدین ص۸۵ [2] انفاس عیسیٰ ص۸۴ تا ۸۶

وہ یوں نہ کہیں کہ جب حضور ہر وقت غمگین رہتے ہیں تو ہا! کہاں ٹھکانہ ہے لوگ اس سے مایوس ہو جاتے) پس انسان کو چاہیئے کہ یہ تصور پیشِ نظر رہے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں بے چینی اور عدم اطمینان جس کے لوازم سے ہے کیونکہ مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے اطمینان نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کیلئے غیر منزل کے ساتھ اطمینان اور رضا موانع سفر سے ہے۔ جو مسافر غیر منزل سے دل لگائے گا۔ اور اسی میں قیام کر کے بیفکر ہو جائے گا۔ یقیناً منزل پر نہ پہنچ سکے گا تو آپ کو مسافر کی طرح فکر مند اور بے چین رہنا چاہیئے۔ بے فکر نہ ہوئیے بلکہ برابر عمل میں لگے رہیئے اور اپنی طرف سے راستہ قطع کرنے کی برابر ہمت کیجئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات و اعانات کا لطف دیکھئے کہ وہ کیونکر طویل مسافت کو قصیر اور دشوار گزار طریق کو پھولوں ہلکا بنا دیتے ہیں۔ اگر کبھی سستی ہو جاوے تو پھر از سر نو تجدید کی فکر کیجئے۔ اگر گناہ ہو جاوے فوراً توبہ کر لیجئے۔ اس سے پھر بندہ راستہ ہی پر آ جاتا ہے۔

مراقبۂ ترغیب مجاہدہ

صاحبو! اپنے وطن جا رہے ہو۔ اور اتنی سست رفتار کہ بیٹھ بیٹھ کر چل رہے ہو اصل مکان کی طرف تو جانور بھی تیزی سے چلا کرتے ہیں بیلوں کو دیکھئے کہ وطن کی طرف کس شوق سے قدم اٹھا کر چلتے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ انسان ہو کر بھی اپنے اصلی وطن کی طرف تیزی کے ساتھ قدم نہیں اٹھاتے۔ صاحبو! سستی نہ کرو، تیزی کے ساتھ چلو تمہارا اصلی وطن اصلی مستقر آگے ہے تم دنیا میں کہاں پھنسے۔ رہ گئے اس کے ساتھ کیوں دل لگا لیا۔[۱]

مراقبۂ موت

اَکْثِرُوْا ذِکْرَ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ الموت — لذت کے مٹانے والی شئی یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔

آدمی تھوڑی دیر بیٹھ کر سوچ لیا کرے کہ مجھے مرنا ہے اور مر کر قبر میں جانا ہے وہاں سانپ بچھو ہیں یا جنت کے باغ ہیں۔ اگر اچھے عمل ہیں تو قبر باغ ہے اور اگر برے ہیں تو سانپ اور بچھو ہیں پھر قبر سے اٹھنا ہے اور حساب کتاب کے لیے پیش ہونا ہے اور پلصراط پر چلنا ہے اسی طرح تمام واقعاتِ قیامت کو یاد کر لیا کرے۔ جب یہ مراقبہ صحیح ہو جائیگا تو غلطی سے بھی گناہ نہ ہوگا

۱؎ اطاعت الاحکام ص ۱۱ ۲؎ ذکر الموت ص ۲۰۰۲ ،

انشاء اللہ تعالیٰ۔

نفع مراقبۂ موت

مراقبۂ موت و مابعد الموت حالاتِ قبر اور قیامت کے سوچنے[1] سے جو خوف پیدا ہوتا ہے۔ عین مطلوب ہے کہ معینِ آخرت ہے۔ لیکن اگر اس کے قصداً استحضار سے کوئی مرضِ جسمانی ہونے کا خوف ہو تو روزانہ نہ کریں گاہ گاہ جب غفلت محسوس ہو کر لیں۔

مراقبۂ حیات

اگر موت[2] کے سوچنے سے دل گھبرا دے تو حیات کو سوچو کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے جو خیر بھی ہے۔ ابقی بھی۔ الذ بھی اور اشہی بھی۔

مراقبۂ عذابِ آخرت

عذابِ[3] آخرت کا سوچنا تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے۔ اس سے کلفت اور کدورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس فکر سے قلب میں نورانیت و انشراح ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور تعلق ہو جاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے۔ حدیث میں ہے۔

من جعل الهموم همًا واحدًا هو	(جس نے تمام غموں کو ایک غم بنا لیا اور وہ ہے
أخرة كفاه الله هو دنياه	آخرت کا غم تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیوی غموں
ومن تشتت الهموم احوال	میں کافی ہوگا اور جس نے مختلف غموں کو اپنے
الدنيا لم يبال الله فى اى	اوپر سوار کر لیا تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کس
اودية هلك الخ	وادی میں ہلاک ہوتا ہے)۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص۸۲،۸۵ [2] کمالاتِ اشرفیہ ص۹۲ [3] انفاسِ عیسیٰ ص۸۳۰ [4] پائیدار

[5] زیادہ لذیذ [6] زیادہ پسندیدہ۔

باب سوم - فاعلہ مفیدہ مع الخطر

پہلی فصل. تصور شیخ

عن ابن مسعود قال کانی	حضرت ابن مسعود رضؓ سے روایت ہے
انظر الی رسول اللہ صلے	وہ کہتے ہیں کہ میں گویا رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم یحکی نبیا	اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک نبی کی
من الانبیاء ضربہ قومہ	انبیاء میں سے حکایت فرماتے ہیں
فادموہ وھو یمسح الدم عن	جن کو ان کی قوم نے مارا تھا اور خون آلودہ
وجھہ ویقول اللھم اغفر	کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے چہرہ سے خون
لقومی فانھم لا یعلمون۔	پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے
متفق علیہ	اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں

گو تصور شیخ کی خصوصیات زائدہ ہے کہ وہ اس کی نفس حقیقت سے خارج ہیں اور اسی طرح جو اس سے غرض ہے اس سے بھی اس حدیث میں تعرض نہیں مگر اس کی جو نفس حقیقت ہے کہ غائب کی طرف مثل حاضر کے نظر کی جاوے وہ اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہے البتہ اس کی بعض خصوصیات پر بوجہ غلبہ جہل اہلِ زمانہ کے کچھ مفاسد مرتب ہوتے دیکھ کر محققین اکثر اس سے منع کرنے لگے ہیں۔

حقیقت تصورِ شیخ اس[1] کو برزخ، رابطہ اور واسطہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی تو آج تک کسی محقق نے نہیں فرمائے کہ خدا تعالیٰ کو پیر کی شکل میں سمجھے۔ یہ تو محض باطل ہے اگر اِنَّ اللّٰہَ خلق آدم علی صورتہ سے دھوکا ہو

---

[1] التکشف ص۲۴۷ [2] تعلیم الدین ص۱۱۲

تو سمجھ لینا چاہیئے کہ صورت ناک اور منہ ہی کو نہیں کہتے ۔مثلاً یہ بولتے ہیں اس مسئلہ کی یہ صورت ہے حالانکہ اس مسئلہ کی ناک و منہ نہیں ہے بلکہ صورت کے معنی صفت کے بھی آتے ہیں تو انسان کو آخر سمع و بصر وغیرہ عنایت ہوا ہے ۔اس لیے اس کو صورت حق کہا گیا ۔غرض یہ معنی تصورِ شیخ کے بالکل بے اصل ہیں ۔کتب فن میں اسی قدر مذکور ہے کہ شیخ کی صورت اور اس کے کمالات کے زیادہ تصوّر کرنے سے اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔اور نسبت قوی ہوتی ہے اور قوتِ نسبت سے طرح طرح کی برکات حاصل ہوتی ہیں اور بعض محققین نے تصوّرِ شیخ میں صرف یہ فائدہ فرمایا ہے کہ ایک خیال دوسرے خیال کا دافع ہوتا ہے ۔اس سے یکسوئی میسّر ہو جاتی ہے خطرات دفع ہو جاتے ہیں ۔چنانچہ حضرت شاہ کلیم اللہ صاحبؒ نے کشکول میں یہی حکمت فرمائی ہے ۔

اصل مقصود تصور حقتعالیٰ کا ہے مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مرئی نہیں ہیں ۔اس لیے جن لوگوں کی قوتِ فکریہ ضعیف ہوتی ہے ان کو یہ تصوّر جمتا نہیں ۔اس لیے ان کے ذہن میں خیالات بہت آتے ہیں ایسے لوگوں کو یکسوئی حاصل کرنے کے واسطے تصورِ شیخ تجویز کیا گیا کیونکہ علاج بالضد ہوتا ہے ۔یعنی خیال کے دفع کرنے کیلئے دوسرے خیال کو ذہن میں جمایا جائیگا خواہ وہ کوئی خیال ہو ۔پس ان خیالاتِ مختلفہ کے دفع کرنے کے واسطے ہر دیکھی ہوئی چیز کا تصور کافی ہے ۔جس پر بھی خیال جم سکے ۔لیکن ان سب خیالات میں سے شیخ کا تصور انفع ہے کہ وہ محبوب ہونے کی وجہ سے ذہن میں زیادہ جمے گا اس لیے دفعِ خیالات میں زیادہ مؤثر ہوگا ۔

تصورِ شیخ کوئی بالذات مطلوب نہیں ۔صرف توجہ الی اللہ کے وقت جو وساوس مجردکا ہجوم ہوتا[1] ہے وہ قطعِ وساوس کیلئے ہے اس سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے ۔پھر اس یکسوئی سے توجہ الی اللہ کی استعداد ہو جاتی ہے ۔پھر اس استعداد کو مقصود میں صَرف کرنا اور جب مقصود حاصل ہو جائے تو پھر ان ہیئات وقیود کی ضرورت نہیں رہتی ۔

اس کی مثال مکان میں جھاڑو دینے کی سی ہے ۔مکان کے صاف کرنے کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ ایک ایک تنکا اٹھا اٹھا کر باہر پھینکا جائے ۔اس میں جو کلفت ہے وہ ظاہر ہے ۔دوسرا یہ کہ سب تنکوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے ۔جب سب مجتمع ہو جائیں تو سب کو اٹھا کر باہر پھینک

---

[1] نفوس ا

دے۔ بس یہی دوسری صورت تصورِ شیخ کی ہے کہ سب تصورات کو ایک تصور میں جمع کر کے جب یکسوئی حاصل ہو جائے تو اس کو بھی ترک کر دیا جائے۔ تو وہ مقصود بالذات نہ ہوا، بلکہ مقصود بالغیر ہوا۔ اس لیے جب یہ غرض حاصل ہو جائے تو شیخ کا تصور بھی دل سے نکال دے، اور صرف ذاتِ حق کی طرف متوجہ ہو جائے۔ پھر احیاناً اگر خیالات آ جائیں تو پھر شیخ کا تصور کرے جب خیالات دفع ہو جائیں۔ پھر ذاتِ حق کی طرف متوجہ ہو جائے کیونکہ مقصود حقیقتاً یہی ہے اور خود حق تعالیٰ کا براہِ راست تصور کرے تو وہ بہتر ہے۔

بہرحال[۱] اس میں جو کچھ حکمت اور فائدہ ہو۔ راقم (حضرت مجدد تھانوی رح) کا تجربہ ہے کہ یہ شغل خواص کو تو مفید ہوتا ہے اور عوام کو سخت مضر کہ صورت پرستی کی نوبت آ جاتی ہے۔ اسی واسطے حضرت امام غزالی رح وغیرہ محققین نے عوام اور اغبیاء کے لیے ایسے ایسے اشغال کی تعلیم سے منع فرمایا ہے جس سے کشف وغیرہ ہوتا ہو۔ اس لیے عوام کو تو بالکل اس سے بچنا چاہیئے اور خواص بھی اگر کریں تو احتیاط کی حد تک محدود رکھیں۔ اس کو حاضر ناظر اور ہر وقت اپنا معین و دستگیر نہ سمجھ لیں کیونکہ کثرت تصور سے کبھی صورت مثالیہ روبرو حاضر ہو جاتی ہے۔ کبھی تو وہ محض خیال ہوتا ہے اور کبھی کوئی لطیفۂ غیبی اس شکل میں متمثل ہو جاتا ہے اور شیخ کو اکثر اوقات خبر تک بھی نہیں ہوتی، اس مقام پر اکثر ناواقف کو لغزش ہو جاتی ہے۔

(لہٰذا) مجدد کو اس[۲] (تصورِ شیخ) سے سخت انقباض ہے، اس طرح انہماک کے ساتھ کسی مخلوق کی طرف توجہ کرنا توحید کے خلاف ہے اس سے غیرت آتی ہے کہ غیر کی صورت ایسے طریق پر ذہن میں جمالیں جو حق تعالیٰ کے لیے زیبا تھا۔

دوسری فصل، عشق مجازی

مولانا جامی رح فرماتے ہیں[۳]

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست + کہ آں بہر حقیقت کارسازیست

ترجمہ: عشق سے اعراض نہ کرو اگرچہ وہ مجازی ہو۔ کیونکہ وہ عشقِ حقیقی کے لیے سبب ہے۔

۱؎ تعلیم الدین صـ۱۱۳۔ ۲؎ الکلام الحسن صـ۷۶، ۳؎ بوادر النوادر صـ۶۹۹ تا ۷۰۳ ملخصاً۔

اور مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سرست　　عاقبت مارا بداں شہ رہبرست

ترجمہ: عشق اگر اس شئے کا ہو یا اُس شئے کا۔ آخر کار ہمارے لیے اس شاہ (محبوب حقیقی) کی طرف رہبر ہے اور مثلاً بعض بزرگوں کی طرف ایسے واقعات کو منسوب کرنا۔ یہ وہ دلائل ہیں جو عشقِ مجازی کے جواز میں پیش کیے جاتے ہیں اور مدعیانِ تصوف کی ایک کثیر جماعت اس میں مبتلا ہے مگر چونکہ بعض کو اس میں اتنا غلو ہو گیا ہے کہ بجائے معصیت سمجھنے کے اس کو واسطۂ مشاہدہ حق سمجھ کر طاعت سمجھنے لگے ہیں پس اس اعتبار سے یہ غلطی اشد ہے اس میں دو مبحث ہیں ایک اجمالی ایک تفصیلی۔ اجمالی تو یہ ہے کہ ان ہی حضرات کے دوسرے اقوال اس کے خلاف بھی ہیں۔ مولانا جامیؒ ہی کا قول اس کے بعد یہ ہے ؎

ولے باید کہ در صورت نمانی　+　وزیں پل زود خود را بگذرانی

ترجمہ: لیکن یہ ضرور ہے کہ تو صورت (یعنی عشق مجازی) میں نہ رہ جائے (کیونکہ یہ مثل پل کے ہے) اور اس پل سے بہت جلد گزر جانا چاہیئے۔

اور مولانا رومیؒ کا قول اسی قول کے قریب یہ بھی ہے ؎

عشق ہائے کز پئے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود
عشق با مردہ نباشد پائیدار　　عشق را با حی و با قیوم دار
زانکہ عشقِ مردگاں پائندہ نیست　　چونکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
عشقِ آں زندہ گزیں کو باقی ست　　وز شرابِ جانفزایت ساقی ست

(ترجمہ: جو عشق رنگ روپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ حقیقت میں عشق نہیں۔ بلکہ اس کا انجام ندامت ہے (کیونکہ) عشق فانی شئے کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ عشق حی و قیوم (یعنی خداوند تعالیٰ) کے ساتھ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ فانی چیزوں کا عشق دائمی نہیں۔ کہ فانی چیزیں (فنا ہو کر) ہمارے پاس واپس نہیں آتیں۔ پس عشق اس زندہ کا اختیار کر جو ہمیشہ باقی ہے اور تجھ کو روح تازہ کرنے والی (محبت کی) شراب پلاتا ہے) اور چونکہ محققین محقین کے اقوال ان کے دوسرے اقوال و احوال سے متعارض نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے اقوال و احوالِ موہمہ ثابت بالنسبۃ کے محامل وہ نہیں ہیں جو متمکین

نے سمجھے ہیں۔ یہ تو اجمالی مبحث ہے اور تفصیلی مبحث یہ ہے کہ ان کے محامل صحیحہ کو بتلا دیا جائے اور وہ محامل عشقِ مجازی کے موصل الی الحقیقۃ ہونے کے طرق ہیں۔ اگر ایسا اتفاق ہو کہ عشقِ مجازی میں بلا قصد مبتلا ہو جائے تو اول عفت و پارسائی اختیار کرے۔ یعنی کوئی امر خلافِ شرع اس کے ساتھ نہ کرے۔ حتیٰ کہ اس کو قصداً نہ دیکھے، نہ اُس سے باتیں کرے نہ اُس کی باتیں کرے اور نہ دل میں قصداً اس کا خیال کرے۔ کیونکہ مخالفتِ شرع عشقِ حقیقی کے منافی ہے اور منافی کے ہوتے ہوئے کب امید ہے کہ عشقِ حقیقی حاصل ہو۔ دوسرے اس سے ظاہراً دوری اختیار کرے کہ اتفاقاً و مفاجاۃً بھی اس پر نظر نہ پڑے۔ نہ اس کی آواز کان میں پہنچے تاکہ اس سے قلب میں سوز و گداز پیدا ہو۔ اور اگر قصداً یا بغتۃً و اتفاقاً اس سے متمتع رہا تو عمر بھر اسی شغل میں رہے گا۔ کبھی نوبت نہ آوے گی کہ ادھر سے مطلوبِ حقیقی کی طرف توجہ ہو۔ تیسرے یہ کہ خلوت و جلوت میں یہ سوچا کرے کہ اس شخص کا کمال یا حسن و جمال کہاں سے آیا اور کس نے عطا کیا۔ جب موصوف مجازی کی یہ دلربائی ہے تو موصوفِ حقیقی کی کیا شان ہوگی۔ بقول ع

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگار ہا

(یعنی کیا شان ہوگی اس محبوب کی جس نے یہ تمام نگار بنائے ہیں) اس سے اس کا عشق مخلوق سے خالق کی طرف مائل ہو جاوے گا۔ یہی معنی ہیں اس قول کے کہ شیخ کامل عشقِ مجازی کا ازالہ نہیں کرتا امالہ کر دیتا ہے۔ جس طرح انجن گرم ہو کر الٹا چلتا ہو تو قطع مسافت کرنے والے کو مناسب نہیں کہ اس کو بجھا دے۔ بلکہ آگ تو روشن رکھنا چاہیئے۔ اور اس کی کل کو پھیر کر سیدھا چلا دیا جائے اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو قصداً عشقِ مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ مراد اس سے عشقِ حلال ہے۔ نہ حرام۔ کیونکہ معصیت تو موصل الی اللہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جو اس مشورہ سے غرض ہے وہ عشقِ حلال (اولاد بیوی وغیرہ) سے بھی حاصل ہے۔ کیونکہ عشق میں گو وہ مجازی ہو۔ یہ خاصیت ضرور ہے کہ اس سے قلب میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس میں باقی تعلقات قلب سے دفع ہو جاتے ہیں اور خیال میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اس تعلق کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیا جائے۔ تو بہت آسانی سے قلب خالی ہو جاتا ہے جیسے گھر میں جھاڑو دے کر تمام خس و خاشاک ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں۔ پھر ٹوکرے میں اٹھا کر باہر

ایک دم سے پھینک دیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر ایک ایک تنکا گھر سے اٹھا کر باہر پھینکا جائے تو طویل مدت صرف ہو۔ اور پھر بھی اس قدر صفائی نہ ہو۔ غرض اصلی مقصود ترکِ تعلقات یا قلب میں رقت و سوز و گداز پیدا کرنا ہے اور اگر طریق سے حاصل ہو جائے تو بھی کافی ہے بعض نے اس طریقِ مجازی کو اختیار کرایا مگر چونکہ اس زمانہ میں اس طریق میں خطرہ شدید ہے۔ کیونکہ نفوس میں شہوت پرستی و لذت جوئی زیادہ ہے اس لیے قصداً ایسے طریق کا بتلانا جائز نہیں۔ ہاں اگر اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو بطریقِ بالا اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف کر دینا چاہیئے۔ اور طریقوں کا بدل جانا زمانہ کے بدل جانے سے کوئی امر عجیب نہیں اور غضب یہ ہے کہ بعض اس کو ذریعہ قربِ الٰہی سمجھتے ہیں خدا کی پناہ اگر معصیت ذریعۂ قربِ الٰہی کا ہو تو سارے رنڈی بھڑوے کامل ولی ہوا کریں۔

طریقِ علاج اول یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بدوں ہمت کے آسان سے آسان کام بھی نہیں ہوتا۔ دیکھئے امراضِ ظاہری کے علاج کیلئے دوائے تلخ و ناگوار پینا پڑتی ہے۔ چونکہ صحت مطلوب ہوتی ہے اس لیے ہمت کر کے پی جاتے ہیں اور امراضِ باطنی میں تو اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ جب یہ امر معلوم ہو جائے تو اب اس کا علاج سنئے اور ہمت کر کے بنامِ خدا اس کا استعمال کیجئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ شفاء کامل عطا ہوگی۔ علاج اس کا چند اجزاء سے مرکب ہے۔

(۱) اس مردار سے قطعاً تعلق ترک کر دیجئے یعنی اس (محبوبِ مجازی) سے بولنا چالنا (اس کو دیکھنا بھالنا) آنا جانا۔ حتیٰ کہ دوسرا شخص بھی اگر اس کا تذکرہ کرے تو قطعاً رد کر دیا جائے۔ بلکہ قصداً بتکلف کسی بہانہ سے اس کو خوب برا بھلا کہہ کر اس سے خلاف و خصومت کی جائے۔ اس طور پر کہ اس کو ایسی نفرت ہو جائے کہ اصلاً اس کو ادھر میلان و توقع رام ہونے کی باقی نہ رہے اور اس سے ظاہراً اس قدر دوری اختیار کی جائے کہ کبھی غلطی سے بھی اس پر نظر نہ پڑے۔ غرض اس سے کلی انقطاع ہو جائے۔

(۲) ایک وقت خلوت کا مقرر کر کے غسل تازہ کر کے صاف کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر تنہائی میں روبقبلہ ہو کر اول دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے روبرو خوب استغفار اور توبہ کی جائے اور اس بلا سے نجات لینے کی دعا و التجا کی جائے اور پانچسو سے لیکر ہزار مرتبہ تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر اس طرح کیا جائے کہ لَآ اِلٰہَ کے ساتھ تصور کیا جائے کہ میں نے سب غیر اللہ کو قلب سے

نکالدیا۔ اور اِلّا اللہُ کے ساتھ خیال کیا جائے کہ میں نے محبت الٰہی کو قلب میں جمالیا۔ یہ ذکر ضرب کے ساتھ ہو۔

(۳) جس بزرگ سے عقیدت ہو اس کو اپنے قلب میں تصور کیا جائے کہ بیٹھے ہیں اور سب خرافات کو قلب سے نکال نکال کر پھینک رہے ہیں۔

(۴) کوئی حدیث کی کتاب یا ایسے ہی کوئی کتاب جس میں دوزخ اور غضبِ الٰہی کا جو نافرمانوں پر ہوگا ذکر ہو۔ مطالعہ کثرت سے کیا جائے۔

(۵) ایک وقت معین کر کے خلوت میں یہ تصور باندھا جائے۔ کہ میں حق تعالیٰ کے روبرو میدانِ قیامت میں حساب کے لیے کھڑا ہوں اور حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اے بے حیا تجھ کو شرم نہیں آتی کہ ہم کو چھوڑ کر ایک مردار کی طرف مائل ہوا۔ کیا تجھ پر ہمارا یہی حق تھا۔ کیا ہم نے تجھ کو اسی لیے پیدا کیا تھا۔ اے بیحیا ہماری ہی دی ہوئی چیزوں کو آنکھ کو دل کو ہماری نافرمانی میں تو نے استعمال کیا۔ کچھ شرم بھی آئی۔ بڑی دیر تک اسی مراقبہ میں غرق و مشغول رہنا چاہیئے۔

تنبیہ :۔ اگر ان تدبیروں کا اثر مرتب ہونے میں کسی عارض سے تاخیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوں۔ اس کوشش میں بھی اجر ملتا ہے جو اصل مقصود ہے۔ حتیٰ کہ اگر اسی میں جان بھی جاتی رہے تو شہادت کا ثواب ملتا ہے۔ من عشق فعف فکتم فصبر فمات فھو شھید (یعنی جو شخص عاشق ہوا۔ پس پاکدامن رہا اور چھپایا اور صبر کیا۔ پھر مر گیا تو وہ شخص شہید ہے) اور یہ جو مشہور ہے کہ بدوں عشق مجازی کے عشق حقیقی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ حظوظ نفسانیہ اور لذاتِ شہوانیہ حاصل کرنے کے لیے بزرگوں کے اقوال کو آڑ بنا رکھا ہے۔ اور دل کا حال اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے اور خود ان سے بھی پوشیدہ نہیں انصاف اور حق پرستی ہو تو سب کچھ امید ہے۔

(نوٹ) اس مقام پر حسن پرستی کے مضمون کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے۔ (مرتب)

تیسری فصل ۔ سماع

(غزوۂ خندق یا احزاب میں)

فلما رأى ما بهم من النصب والجوع قال اللّٰهم ان العيش عيش الاٰخرة فاغفر الانصار والمهاجرة فقالوا مجيبين له

نحن الذين بايعوا محمدًا
على الجهاد ما بقينا ابدًا

اخرجه الشيخان والترمذی

جب آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان (صحابہ) کی مشقت اور فاقہ کی حالت دیکھی تو (ان کے دل بڑھانے کو) دعا کی ۔ اے اللہ عیش تو آخرت ہی کا ہے ۔ سو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرمادیجئے ۔ صحابہ نے جواب میں (یہ کلام منظوم) عرض کیا ۔ ہم وہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم زندہ رہیں گے ۔

بعض اہلِ طریق کا یہ مذاق ہوا ہے کہ جب اسبابِ عارضہ سے طبیعت میں ملال یا فتور یا انقباض ہوا ہے ۔ اس کے رفع کے لیے موافق شرائط اباحت کے قدرے سماع سن لیا ہے تاکہ نشاط پیدا ہو کر طاعت مقصودہ سہل ہو جائے ۔ پس مقصود طاعت ہوتی تھی ۔ اور سماع اس مقصود کا معین ۔ اس حدیث سے اس کا اثبات ہو رہا ہے کہ خندق کا کھودنا جو اس وقت طاعت تھی اور جوع و نصب مظنہ فتور کا تھا اس میں کلام منظوم سے نشاط و انسداد کسل کا کام لیا ۔ تامل کرنے سے یہی مصلحت معلوم ہوتی ہے ۔ باقی سماع کو خود مقصود بنالینا یا اس میں رعایت شرائط کی نہ کرنا تلعب بالدین ہے ۔

ہر چند یہ مسئلہ اختلافی ہے ۔ لیکن اگر مانعین کے دلائل سے بالکل قطع نظر کر کے اس کو جائز سمجھا جائے ۔ تب بھی تو جواز کے بہت سے شرائط ہیں ۔ نہ اخوان ہیں ۔ نہ زمان نہ مکان ۔ صرف ایک رسم رہ گئی ہے ۔ ہر قسم کے لوگ مختلف نفسانی اغراض سے جمع ہوتے ہیں ۔ اور بزرگوں کے طریقے کی بدنامی ہوتی ہے ۔ اس مقام پر صرف حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ کے ارشاد فوائد

الفواد سے (اور راحت القلوب ملفوظات حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اور انیس الارواح خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ وغیرہ سے) نقل کیے دیتے ہیں۔

راحۃ القلوب مجلس چہارم ۲۷ شعبان ۶۵۵ھ واقعہ نمبر ۳۳

(۱) حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا۔ اہل سماع اس گروہ کے لوگ ہیں کہ جب وہ سماع و تحیر میں مستغرق ہوتے ہیں تو ایسے بے خبر ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے سروں پر لاکھ تلوار چلے تو انھیں ذرہ برابر خبر نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماع کی اہلیت اسی شخص میں ہے جس کو ایسا تحیر اکثر پیش آتا ہو۔

قول ۲۵ مجلس اوّل ملفوظ حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ از راحۃ المحبین۔

(۲) حضرت شبلیؒ نے شیطان سے پوچھا) کہ اولیائے خدا پر تجھے کب قابو ملتا ہے۔ اس نے کہا کہ سماع کے وقت جبکہ وہ غیر حق کیلئے سماع سنتے ہیں۔ اور ان کے دل یاد الٰہی سے غافل اور بیہوش ہو جاتے ہیں تو اس وقت مجھے خوب موقع ملتا ہے۔

(ف) اس سے ثابت ہوا کہ حضرت سلطان جی رح سماع لغیر الحق کو کیسا سمجھتے تھے۔

(۳) مجلس ۸ / شوال ۷۱۹ھ قول نمبر ۱۴۔

پھر کچھ سماع کا ذکر ہوا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ جو شئی حرام ہے وہ کسی کے حکم سے حلال نہیں ہوتی۔ اور جو شے حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہوتی۔ (فوائد الفواد)

(۴) فوائد الفواد۔ مجلس ۷ / ذیقعدہ ۷۱۵ھ عمل ۱۳۔

حضرت شیخ فرید الدین رح کو ایک دفعہ سماع کا شوق ہوا۔ قوال کوئی موجود نہ تھا۔ آپ نے مولانا بدر الدین اسحٰق سے فرمایا۔ کہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا مکتوب لاؤ۔ اور پڑھو۔ انھوں نے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا ہوا تھا[1] کہ فقیر حقیر ضعیف نحیف محمد عطا کہ بندہ درویشاں ست واز سر و دیدہ خاکِ قدم ایشان۔ شیخ نے اتنا سنا تھا کہ آپ پر ایک حال اور ذوق پیدا ہوا۔

(ف) دیکھئے ان حضرات کا سماع یہ تھا کہ نثر سے بھی وہی اثر لیتے تھے جو نظم سے لیتے تھے۔ ان رسوم معروفہ منکرہ سے مبرا تھے۔

---

[1] السنۃ الجلیۃ صہ ۲۱، ۱۲۷، ۲۸، ۶۴، ۶۶

(۵) فوائد الفواد مجلس ۹ رمضان ۷۱۹ھ عمل ۱۹

بندہ (حضرت علاء سنجری رح) نے عرض کیا کہ وہ (شیخ سیف الدین) سماع سنتے تھے۔ فرمایا۔ ہاں مگر اس طرح نہیں سنتے تھے کہ مجلس مرتب کریں اور برسمِ دعوت لوگوں کو بلائیں اور سماع سنیں بلکہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ حکایت و سخن فرماتے۔ جب کوئی وقت خوش دیکھتے تو فرماتے کوئی ہے کچھ کہے اس وقت قوال آتا کچھ کہتا پس ان کا سماع اس طرح کا تھا۔

(ف) ان بزرگوں کے سماع کا طرز اس سے معلوم ہوا کہ رسوم متعارفہ کے پابند نہ تھے۔

مزامیر | از انیس الارواح ملفوظ حضرت خواجہ عثمان ہارونی مرتبہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح

ایک ملفوظ حضرت خواجہ مودود چشتی رح کا نقل کیا ہے کہ خوارزم اور چند شہر کہ گرد اس کے ہیں راگ اور باجوں کی شامت سے اور بعض گناہوں کی وجہ سے خراب اور ویران ہوں گے اور سب آپس میں لڑ مریں گے۔

(ف) دیکھئے اس میں گانے بجانے کی کس قدر مذمت کی گئی ہے۔ اس کے عموم میں سماعِ متعارف بھی داخل ہے۔ باقی خود ان حضرات سے جو سماع منقول ہے اس کی تحقیق (اوپر درج) ہے۔

(۲) از اسرار الاولیاء ملفوظ حضرت شیخ فریدالدین رح گنج شکر چوتھی فصل قول ۲۷۔

فرمایا کہ اے درویش! اسے جو شنوائی دی ہے تو اسی لیے دی ہے کہ خدا کا ذکر سنے۔ جہاں کلام اللہ پڑھا جاتا ہو وہاں کان لگانے کہ کیا فرمانِ الٰہی ہے۔ نہ اس لیے کہ ہر ایک کی برائی اور تمسخر اور راگ باجہ اور نوحہ کی آواز سنے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اس قسم کی آوازوں پر کان لگائے گا۔ قیامت کو سیسہ پگھلا کر اس کے کانوں میں بھرا جائیگا۔

(۳) فوائد الفواد۔ ملفوظ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رح مجلس ۲ صفر ۷۱۱ھ قول نمبر ۳۲۔

حضرت خواجہ نے کہا کہ میں نے تو بالکل منع کر دیا ہے کہ مجلس میں مزامیر اور محرمات نہ ہوں۔ ...... پھر آپ نے فرمایا کہ مشائخ کبار نے سماع سنا ہے۔ اہل اور صاحبِ ذوق لوگ جیسے کچھ

له السنة الجلية ص ۲۲، ۲۵، ۵۷، ۵۶۔

درد ہے وہ تو کہنے والے کے ایک ہی بیت کے سننے میں رقت ہے آتا ہے۔ خواہ مزامیر ہوں یا نہ ہوں ..... تو معلوم ہوا کہ یہ کام درد سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ مزامیر وغیرہ سے۔

(ف) دیکھئے اس میں مزامیر و محرمات پر کس درجہ ناراضی ظاہر فرمائی۔

اسی طرح اقتباس الانوار میں بذیل تذکرہ حضرت شیخ داؤد گنگوہی رح بسلسلہ مناظرہ ملا عبد القوی شیخ حضرت موصوف کا قول نقل کیا ہے۔ جس میں اباحت مزامیر کا مرجوح ہونا اور ہمارے تمام مشائخ سے مزامیر سننے کی نفی اور دلالۃ النص سے اس کا عدم جواز مصرح ہے۔

از رسالہ قرع السماع۔

حضرت شیخ نصیر الدین محمود کبھی کبھی سماع سنتے تھے۔ تراں بھی طالب علموں اور درویشوں میں سے ہوتے تھے جوان کی خدمت میں رہ کر کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ برہان الدین غریب کے مکان میں سماع کی مجلس منعقد تھی۔ اور مزامیر بھی موجود تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود رح مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مکان پر آگئے۔ کسی نے کہا کہ آپ پیر کے طریقہ سے پھر گئے فرمایا کہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ اس خبر کو سلطان المشائخ کی خدمت میں لوگوں نے پہنچایا تو فرمانے لگے کہ انھوں نے بہت اچھا کیا اور حق ان کی جانب ہے...... شیخ نے فرمایا ہے کہ جو مزامیر سنے گا وہ ہماری بیعت اور مریدی سے خارج ہوجاوے گا۔

(ف) سماع مع المزامیر کی مذمت جو فرمائی ہے ظاہر ہے۔

خیر المجالس میں لکھا ہے کہ ایک عزیز شیخ نصیر الدین رح کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ کہاں جائز ہے یہ بات کہ مزامیر اور دف اور بانسری اور رباب یہ سب موجود ہوں اور صوفی رقص کریں۔ خواجہ رح نے فرمایا کہ مزامیر بالاجماع جائز نہیں ..... بالاجماع حرام ہیں۔

حلِ اشکال یعنی تحقیق مسئلہ سماع

خود علماء[1] میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ اہلِ علم پر ظاہر ہے سو حضرات چشتیہ رح نے بھی علماء ہی کا ایک قول لے لیا ہے۔ اور اس میں خاص قیود لگا دی ہیں۔ جس سے اس میں کسی قسم کا مفسدہ

---

[1] السنۃ الجلیہ ص ۸۵-۸۶

نہیں۔ باوجود اس کے کسی نے اس کو جزوِ طریق نہیں کہا اور طالبوں کو اس کا حکم نہیں دیا جس طرح ذکر و شغل کا حکم دیتے تھے۔ البتہ بعض ضرورتوں اور مصلحتوں سے خود سنا ہے۔

اس مقام پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ بعض مختصر ملفوظات حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ کے نقل کر دیئے جائیں۔ جو باب نمبر ۲۷ دُررِ نظامی میں مذکور ہیں۔ جس سے محققین اہلِ سماع کا مذاق واضح ہو جاوے گا۔

(۱) فرمایا سماع کی چار قسمیں ہیں۔ حلال، حرام، مکروہ، مباح (یعنی خلافِ اولیٰ) اگر صاحبِ وجد کا میلانِ خاطر حقیقت کی طرف زیادہ ہو تب تو حلال (مباح) ہے۔ اور اگر مجاز کی طرف زیادہ ہے تو مکروہ ہے اور اگر بالکل حقیقت ہی کی طرف۔ تب حلال ہے اور اگر بالکل مجاز ہی کا دھیان ہے تب حرام ہے۔

(۲) فرمایا:۔ سماع کے واسطے تین باتیں درکار ہیں۔ زمان، مکان، اخوان (الیٰ قولہ) سماع کے واسطے کئی باتیں درکار ہیں۔ جب یہ موجود ہوں اس وقت سماع سنے۔ مسمع۔ مستمع۔ مسموع۔ آلۂ سماع۔ مسمع یعنی گانے والا پورا مرد ہو۔ لڑکا یا عورت نہ ہو۔ مستمع سننے والا یادِ حق میں مشغول ہو۔ مسموع (یعنی گانا) فحش اور کسی کی ہجو نہ ہو۔ آلۂ سماع۔ یعنی مزامیر (وغیرہ) نہ ہو۔ تب یہ سماع سننا مباح ہے۔

(۳) حضرت کے ایک مرید نے عرض کیا کہ مولانا رکن الدین ایسی مجلس میں شریک ہوتے۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ عرض کیا اس مجلس میں بندہ کا کوئی دوست نہ تھا (جو میری تائید کرتا) اور گمان غالب تھا کہ میرے منع کرنے سے وہ لوگ باز نہ رہیں گے۔ حضرتؒ نے فرمایا تم منع کرو وہ لوگ باز آ جاتے فبہا ورنہ تم وہاں سے اٹھ کھڑے ہو۔

تتمہ مبحث

حاصل یہ ہوا کہ مزامیر تو مطلقاً ممنوع اور سماع محض اگر بلا شرائط ہو تو وہ بھی مطلقاً ممنوع اور اگر بشرائط ہو تو مختلف فیہ جس میں بعض صوفیہ نے اباحت کا قول لے لیا۔ اب یہ سوال باقی رہا کہ مذہب حنفی میں تو وہ بھی ناجائز ہے۔ صوفیہ حنفیہؒ نے اپنے مذہب کے خلاف کیوں کیا۔ ایک جواب تو یہ ہے کہ محقق اتنے اختلاف سے حنفیت سے نہیں نکلتا۔ دوسرا جواب وہ ہے جس کو اقتباس الانوار میں حضرت قطب صاحبؒ کے تذکرہ میں میر الاقطاب سے

حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی طرف منسوب کیا ہے اور گو خود صاحب اقتباسؒ نے اس نسبت پر وجدانی بحث کی ہے لیکن قطع نظر نسبت کے خود وہ تقریر مستقلاً بھی قواعد کے مطابق ہے۔ اس لیے ان ہی الفاظ کا ترجمہ نقل کرتا ہوں۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں ہوں حمید الدین کہ سماع سنتا ہوں اور مباح کہتا ہوں بوجہ علماء کی روایت کے۔ اس لیے کہ میں دردِ دل کا مریض ہوں اور سماع اس کی دوا ہے امام اعظم ابو حنیفہؒ نے شراب سے علاج کرنے کی ایسے وقت اجازت دے دی ہے۔ جبکہ ازالہ مرض کے لیے اور کوئی دوا ہی نہ ہو اور حکیموں کا اتفاق اس پر ہو گیا ہو کہ صحت بدون شراب ناممکن ہے۔ اس تقدیر پر میرے مرض کی دوا جو کہ لاعلاج ہے سرود کا سننا ہے لہٰذا اس کا سننا ہمارے لیے مباح ہے اور تم پر حرام ہے۔

(ف) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اباحت کا حکم ایسی اضطرار کی حالت میں ہے جس حالت میں حرام دوا حلال ہو جاوے کیا اس وقت ایسا اضطرار کسی میں مشاہد ہے۔

یہ[1] تھا ان حضرات کا سماع۔ مگر فقہاء اس کو بھی حرام کہتے ہیں کیونکہ سماع کی خاصیت ہے کہ وہ کیفیت موجودہ کو قوی کر دیتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر سماع کی بھی اجازت دے دی جائے گی تو عوام میں جو کیفیت اس وقت موجود ہے۔ اس کو قوت ہو گی اور زیادہ تر نفس میں شر ہے۔ اس کو قوت ہو کر وہ مفاسد کی طرف مفضی ہوگا۔ کیونکہ عوام میں شہوت اور نفس کی خواہش غالب ہے۔ سماع سے اس میں ہیجان ہوگا قوت بڑھ جائے گی اور اس سے سخت مفاسد پیدا ہوں گے اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے الغناء رقیة الزنا غناء زنا کا منتر ہے فقہاء چونکہ منتظم ہیں۔ اس لیے وہ بعض ایسی چیز کو بھی منع کرتے ہیں جس میں شرعاً کچھ گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ جس طرح وبا کے زمانہ میں ڈاکٹر کھیرے ککڑی کو مطلقاً منع کر دیتا ہے۔ اگرچہ قلیل مقدار مضر نہیں ہوتی اور صحیح المعدہ کو زیادہ مقدار بھی مضر نہیں ہوتی۔ لیکن ڈاکٹر اس تفصیل سے منع کرے گا۔ تو کوئی بھی اس کے کھانے سے باز نہ آئے گا۔ ہر شخص اپنے کو صحیح المعدہ سمجھنے لگے گا اور کثیر مقدار کو بھی قلیل ہی کہے گا۔ اس لیے انتظام کا مقتضیٰ یہی ہے کہ وبا کے زمانہ میں کسی کو بھی کھیرے ککڑی کی اجازت نہ دی جائے۔ یہی حالت فقہاء کی ہے کہ حضرات صوفیہ نے جس سماع کو اختیار کیا تھا اور شرعاً اس میں گنجائش بھی تھی۔ مگر فقہاء نے انتظاماً اس سے بھی منع فرما دیا۔

---

[1] بزم جمشید ص ۱۳، ۱۵

چنانچہ حضرت سلطان جیؒ کا سماع شرعاً ناجائز نہ تھا۔ کیونکہ وہ آداب اور حدود کی رعایت کے ساتھ تھا۔ مگر فقہاء اس کو بھی بدعت کہتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور عوام کو اجازت دینے میں مفسدہ ہے۔ حضرت سلطان جیؒ کے زمانہ میں قاضی ضیاء الدین سنامیؒ قاضی تھے وہ ہمیشہ حضرت سلطان جیؒ کے سماع پر نکیر کرتے تھے۔ قاضی صاحب کا (جب) انتقال ہو گیا (تو) حضرت سلطان جیؒ پر گریہ طاری ہو گیا اور فرمانے لگے کہ افسوس! آج شریعت کا ستون منہدم ہو گیا

(بزم جمشید ص۱۳، ۱۵)

(تفصیلِ بالا میں غور فرمائیں اور خود انصاف کریں کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے نیز اگر آپ اس مسئلہ کے متعلق بالتفصیل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو رسالہ "حق السماع" مصنفہ حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز کو ضرور ملاحظہ فرمائیں)

○

۷۔ توابع یعنی احوال کا بیان

اصلاحِ[1] باطنی کے ساتھ بہت سے امور اس کے متعلق ہیں۔ پھر ان متعلقات میں سے بعض امور وہ ہیں جو بمنزلہ ثمرات غیر اختیاریہ اصلاح کے ہیں۔ ان کو اصطلاح میں احوال کہتے ہیں (مگر یہ دین میں مقصود نہیں اس لیے کہ) دین[2] میں مقصود وہ ہوتا ہے۔ جو بدوں تحصیل کے حاصل نہ ہو (بلکہ) جس کا حصول صرف اختیار پر موقوف ہو۔ حالات[3] تو سڑک کے پھولدار درخت ہیں۔ نظر آئے تو کیا۔ نہ نظر آئے تو کیا سڑک تو بہر حال قطع ہوگی۔ بس چلتے رہنا شرط ہے اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر نظر نہیں آتے اگر کبھی ہم یہی نظر کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا۔ راستہ تو برابر قطع ہوتا ہے چاہے درخت نظر آئیں یا نہ آئیں۔

اکثر[4] سالکین اس سے پریشان ہوتے ہیں کہ ہماری فلاں حالت ضعیف ہوگئی یا فلاں کیفیت زائل ہوگئی۔ شاید ہم کو تنزل ہوگیا۔ اور اس سے مایوس اور شکستہ دل ہو جاتے ہیں۔ شیوخِ کاملین نے ان کی غلطی رفع کرنے کیلئے تحقیق فرمادی ہے کہ حالات کا غلبہ دائم نہیں ہوتا۔ بالخصوص مبتدی، کہ اس کو بہت تغیر و تبدل پیش آتا ہے جس کو تلوین کہتے ہیں۔ اور اہلِ تمکین کی بھی حالت میں ان کے مرتبہ کے موافق تفاوت ہوتا ہے اور یہ لوازم سلوک سے ہے۔ مضر نہیں۔ اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ وہ پریشانی البتہ مضر ہے۔

سالکین[5] جن احوال اور کیفیات کے فقدان سے پریشان ہوتے ہیں ان کا فقدان کوئی نقص نہیں بلکہ کمال یہی ہے کہ بدوں غلبۂ احوال کے استقامت حاصل ہو۔ اس کی حقیقت سمجھنے کیلئے دو مقدمے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ تمام سلوک کا مقصد حضرت حق میں فنا ہے۔ یعنی اپنی صفات کو صفاتِ حق میں فنا کر دینا اور متخلق باخلاق اللہ ہونا۔ ہماری صفات کے دو درجے ہیں۔ ایک مبدا، ایک منتہا۔ مبدا انفعال (یعنی تأثر) ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے اندر رحمت و شفقت کا مادہ ہے تو اس کا ایک

---

[1] التکشف صہ ۲۱۵ ، [2] انفاسِ عیسیٰ صہ ۱۲۵ ، [3] تصوف و سلوک صہ ۱۰۶ ، [4] التکشف صہ ۳۲۱

[5] انفاسِ عیسیٰ صہ ۱۲۹، ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۳۱

مبدأ ہے۔ ایک منتہا ہے۔ مبدأ یہ کہ کسی کی حالت اور مصیبت کو دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ یہ انفعال اور تأثر ہے اور دل دکھنے کے بعد ہم نے اس شخص کے ساتھ جو ہمدردی کی۔ اس کی اعانت کی یہ منتہا ہے اور فعل ہے اور صفت رحمت سے یہی مقصود ہے اسی طرح خوف میں مبدأ وہی تأثر و انفعال ہے کہ خدا کی عظمت و جلال کے خیال سے دل پر اثر ہوا۔ رقت طاری ہوئی۔ اور یہ منتہا ہے کہ خداتعالیٰ کی نافرمانی سے رک گئے۔ یہ فعل ہے اور یہی مقصود ہے۔ اسی طرح محبت کا مبدأ یہ ہے کہ دل میں عشق کی دھن پیدا ہو۔ اور محبوب کے خیال میں محو ہو جائے۔ یہ انفعال و تأثر ہے اور منتہا یہ ہے کہ محبوب کی رضاجوئی اور خوشنودی کی طلب میں لگ جائے۔ اللہ تعالیٰ تأثر و انفعال سے پاک ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ کی صفات میں مبادی نہیں ہوتے۔ بلکہ غایات اور منتہا ہی ہوتے ہیں۔ پس جس شخص کے اوپر خوف اور محبّت کی کیفیت غالب نہ ہو مگر استقامت افعال پر ہو کہ معاصی سے پوری طرح بچنے والا اور طاعات کا بجالانیوالا ہو تو اس میں صفات کے مبادی نہیں پائے گئے بلکہ صرف غایات پائے گئے اور یہ شخص متخلق باخلاق اللہ ہے اور جس پر ان کیفیات کا غلبہ ہو۔ اس میں اوّل مبادی پھر غایات پائے گئے تو یہ شخص اس درجہ کا متخلق باخلاق اللہ نہیں ہے پس اوّل تو کامل ہے اور دوسرا اس درجہ کا کامل نہیں ہے۔

(احوال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محمود، دوسرے مذموم) ان میں امتیاز کا معیار یہ ہے کہ جو کیفیت کسی گناہ کا مقدمہ ہو جائے وہ مذموم ہے ورنہ محمود ہے یعنی محمود وہ کیفیت ہے جس سے طاعت میں ترقی اور گناہ میں کمی ہو۔ (اس لیے کہ بعض اوقات معاصی کے ساتھ بھی بعضے احوال نفسانیہ باقی رہتے ہیں۔ جیسے وجد و استغراق، شوق و شگفتگی اور حیرت اور اسی قسم کی اور کیفیات تو ان کے بقا سے دھوکہ میں نہ آئے کہ میں ایسا مقبول ہوں کہ معصیت سے بھی مقبولیت میں خلل نہیں پڑا۔ کیونکہ یہ سب کیفیات دنیا ہیں دین نہیں۔ اور دنیا کا عطا ہوتے رہنا علامات مقبولیت سے نہیں۔ ان احوال کا نسبت سے کوئی تعلق نہیں اور نسبت معاصی کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ یہ احوال محض کیفیات نفسانیہ طبعیہ ہیں۔ جیسے فرح و سرور کیفیات طبعیہ ہیں۔ حاصل یہ کہ یہ احوال اپنی ذات میں دینی امور نہیں ہیں۔ بلکہ دنیوی امور ہیں۔ البتہ بعض اوقات دین میں معاون ہو جاتے ہیں اور اس معین ہو جانے سے ان کا دین کا جزو ہونا لازم نہیں آتا بلکہ بعض اوقات یہ احوال، حجاب بن جاتے ہیں اور احوال محمودہ) حجب[1] نورانیہ ہیں اور حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ

---

[1] انفاس عیسیٰ ص ۱۲۸ ، ۱۰۹

سے اشد ہیں کیونکہ حجب ظلمانیہ کی طرف سالک متوجہ نہیں ہوتا ان کو خود دفع کرنا چاہتا ہے اور حجب نورانیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور التفات کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے مقصود اصلی سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ (لہٰذا) قصداً انوار وکیفیات کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیئے لیکن اس کی بھی ضرورت نہیں کہ اس کے دفع کا اہتمام شدید کیا جائے۔ غرض نہ استحضار اس کا کیا جائے نہ استنکار کیا جائے کہ دونوں میں التفات الی غیر المقصود ہے۔ ایک میں اثباتاً ایک میں نفیاً۔ اور یہی التفات الی الغیر حجاب ہے۔

(والغرض) جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں۔ اسی کو اپنے لیے غنیمت جانیں اور اپنی خواہش سے کسی پسندیدہ حالت کی تمنا نہ کریں (اور اگر کوئی کیفیت جاتی رہے تو اس سے پریشان نہ ہوں) ؎

بدر دو صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　که آنچه ساقیٔ ما ریخت عین الطافست

یعنی تلچھٹ اور صاف شراب کا تجھ کو حکم نہیں، خاموش ہو جا، کہ ساقی نے جو کچھ دے دیا عین مہربانی ہے۔[1]

اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیں کہ ہمارے لیے جو بہتر ہوگا ہو کر رہے گا۔ خواہ حصول ہو یا عدم حصول۔

(اب یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ احوال محمودہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک احوال غیر محتملۃ الضرر، دوسرے محتملۃ الضرر۔ یعنی ایک وہ اعمال جن میں نقصان کا خطرہ اور احتمال نہ ہو۔ اور دوسرے وہ جن میں باوجود محمود ہونے کے نقصان کا بھی احتمال ہو سو یہ احوال اور حالات[2] رفیعہ بیشمار ہیں۔ مگر ہم چند مشہور احوال کا بیان کرتے ہیں۔

○

---

[1] انفاس عیسیٰ ص۱۲۸ [2] تعلیم الدین ص۶۱

باب اوّل

احوال غیر محتملۃ الضرر

(یعنی وہ حالات جو ضرر اور نقصان کا احتمال نہیں رکھتے۔ مقصد یہ کہ ذیل میں ذکر کیے جانے والے حالات وہ ہیں کہ ان سے اغلب نفع پہنچنے کی توقع ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان سے نفع کے بجائے نقصان و ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ جیسا کہ چند اوراق کے بعد کچھ ایسے حالات مستقل باب "احوال محتملۃ الضرر" میں ذکر کئے جائیں گے۔ جن سے گاہے نفع پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ واللہ اعلم)

پہلی فصل ۔ اجابتِ دعا

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ الآیۃ [1] — درخواست کرنیوالوں کی عرضی میں قبول کرلیتا ہوں جب وہ میرے حضور میں درخواست دے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

سألت ربي ثلثا فاعطاني ثنتين ومنعني واحدة (الحدیث) اخرجہ مسلم [2] — میں نے اپنے رب سے تین دعائیں مانگیں۔ سو دو تو منظور کیں اور ایک نامنظور کی۔

اکثر لوگ اجابتِ دعا کو لوازمِ ولایت سے سمجھتے ہیں اور اس اعتقاد پر کثرت سے مفاسد علمیہ و عملیہ مرتب ہوتے ہیں۔ اس اعتقاد کا غلط ہونا حدیث سے ظاہر ہے (البتہ [3] یہ احوالِ رفیعہ میں سے ہے۔ اس کے قصد کے مطابق کام بن جاتا ہے (اور اس) کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت [4] یہ ہے کہ بعینہ وہ شئی مطلوب مل جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بلا آنے والی ٹل جائے۔ مگر انسان کو چونکہ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہوا۔ کونسی بلا ٹل گئی۔ ایسے وقت بہت سے اوہام اور شکوک انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ اور عدمِ قبول کا شبہ ہونے لگتا ہے حالانکہ وعدہ ہے أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ

---

[1] بیان القرآن ص۱۰۵ ج۱ ۔ [2] التکشف ص۲۰۸ ۔ [3] تعلیم الدین ص۱۴۲ ۔ [4] مقالات حکمت نمبر ۵۵۔

(درخواست کرنیوالے کی عرضی قبول کر لیتا ہوں جب وہ میرے حضور میں درخواست دے) حدیث شریف میں آیا ہے۔ دعا مانگتے وقت اجابت کا یقین رکھو۔ جب شک اور شبہ کی ممانعت ہے تو پھر دعا مقبول کیونکر نہ ہوگی۔ البتہ صورتِ اجابت بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ بلا سے محفوظ ہوگیا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شئے مطلوب ذخیرہ رکھ دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی نادان لڑکا اشرفی یا روپیہ مانگے تو بعض اوقات اس کے نام سے کسی تجارت کی کوٹھی میں جمع کر دیتے ہیں اور بوجہ نادانی خود اس کو نہیں دیتے کہ جب ہوشیار ہوگا لے کر حسبِ مصلحت خرچ کرے گا۔ اب لے کر بجز اسکے کہ خراب کرے اور کیا کرے گا حق تعالیٰ بھی اپنے بندہ کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اس مسئول سے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ فرما دیتے ہیں۔

مذہبِ حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل بااختیار ہے۔ جب یہ ہے تو اس کی قدرت جس کی وجہ سے ممکن کا خود وجود اور ظہور ہوا۔ ممکنات کی تاثیرات کو ظاہر بھی کر سکتی ہے اور روک بھی سکتی ہے اسی وجہ سے دعا کی جاتی ہے کہ آپ اپنی مشیت کا تعلق اس سے فرمائیں۔ یہ تو جب ہے کہ اسبابِ خاصہ سے وہ مسبب پیدا ہو لیکن یہ خود بھی ضروری نہیں کہ تمام اسباب جمع ہونے پر ہی ترتب اثر ہو۔ بلکہ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وعنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا وزاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک نیک بی بی نے تنور میں سوختہ جھونک کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اللّٰھم ارزقنا (اے اللہ ہم کو رزق دے) تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا کہ تنور روٹیوں سے پُر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں قوتِ یقینیہ زیادہ تھی۔ پورا الیقین اس کی رزاقی پر تھا۔ چنانچہ اس کا ظہور بلا اسباب ہوا۔ (یعنی جتنے اسباب اس کی وسعت میں تھے اختیار کیے اور باقی کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا) اور یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ تھے۔ ابلیس کے یقین اور توقع اجابت دعا کی کیفیت دیکھئے کہ عین غضب اور قہاری کے موقع پر بھی اس کو پورا بھروسہ تھا کہ غضبِ الٰہی اجابتِ دعا کے لیے مانع نہیں ان رحمتی سبقت علی غضبی (بے شک میری رحمت میرے غضب پر سبقت رکھتی ہے) حالانکہ یہ سوال ایسا بعید ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی خلود اور دوام نہیں ہے

[illegible] ۱۲

عنایت کیا گیا۔ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ (ہم نے آپ سے پیشتر کسی انسان کو دوام عطا نہیں کیا) مگر شیطان نے رحمت کی وسعت کے بھروسہ پر اس کی دعا کر دی اور حکم بھی ہو گیا۔ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (بیشک تجھ کو قیامت تک مہلت دی جاتی ہے) دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو ضرور اثر ہوتا ہے اور یقین ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

(دعا کی حقیقت اور اس کا طریق معلوم کرنے کے لیئے اعمال کے بیان میں، دعا کی فصل ملاحظہ ہو۔)

دوسری فصل۔ الہام

قَالَ انا عمر ولم احرص على امركم ولكن المتوفى اوصى الى بذلك والله الهمه ذلك۔	حضرت عمر رضی نے فرمایا میں عمر ہوں اور تم پر حاکم بننے کی مجھ کو خواہش نہ تھی لیکن مجھ کو متوفی (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) نے اس کی وصیت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے انکے قلب میں اس کا القا فرمایا تھا۔
الحديث اخرجه مالك۔	

بعض اولیاء کا صاحب الہام ہونا منقول ہے۔ اس سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ بلا واسطہ نظر و اکتساب کے کوئی حقیقت قلب میں القاء ہو جائے (یا ہاتف غیبی کی آواز آئے)۔

الہام[2] کی مخالفت سے گناہ تو نہیں ہوتا مگر دنیا کا ضرر ہو جاتا ہے اور دنیا کے ضرر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو یہ ہے کہ مال یا جان کا ضرر ہو جائے۔ سو الہام کی مخالفت میں کبھی یہ ضرر بھی ہو جاتا ہے دوسری قسم دنیا کے نقصان کی یہ ہے کہ ذوق و شوق میں کمی آجائے اور الہام کی مخالفت سے زیادہ

۱۔ التکشف۔ صد ۳۵۹۔۳۶۵ ۲۔ اشرف المسائل، صد ۱۱۵

اسی نوع کا نقصان ہوتا ہے اور ذوق وشوق کو جو دنیا کی شے کہا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک نفسانی کیفیت غیر مختص باہل الدین ہے گو وہ بعض احوال میں معین دین بھی ہو مگر مطلوب بالذات نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ نافع ہوتا ہے۔

تیسری فصل۔ رؤیائے صالحہ

قالوا[1] وما المبشرات یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال الرؤیا الصالحۃ وبہ فسر قولہ تعالٰی وَلَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔	صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ صالح خوابات اور یہی تفسیر ہے اللہ تعالیٰ کے قول ولہم البشریٰ الخ کی۔ یعنی ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں۔
عن[2] عائشۃ رضؓ قالت اول ما بدیٔ برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم وکان لایری رؤیا الاجاءت مثل فلق الصبح الحدیث اخرجہ البخاری۔	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کی ابتداء اچھے خوابوں سے ہوئی اور جو خواب دیکھتے تھے۔ مثل نور صبح کے اس کا ظہور ہو جاتا تھا۔

سچا خواب ایک حال محمود ہے۔ حدیث سے اس کا وقوع ثابت ہوتا ہے۔ محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں۔ حدیث النفس (خیالات) تخویف الشیطان (شیطان بوجہ عداوت کے غمزدہ کرنے کے لیے مکروہ امور دکھلاتا ہے) اور بشارت من اللہ۔ روایت کیا اس کو بخاری ومسلم نے۔

---

[1] تعلیم الدین صنہ ۹۳ [2] التکشف صنہ ۴۳۰، ۴۰۵، ۴۶۴،

ع یعنی دینداروں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

اور حضرت جابر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں کوئی بُرا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور تین بار اعوذ باللہ پڑھ لے اور جس کروٹ پر تھا اس کو بدل دے ۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

بعض ناواقفان سلوک کو دیکھا ہے کہ خواب پر ان کو بہت ہی نظر ہوتی ہے ۔ اچھے خوابوں کی کمی ہو جاتی ہے تو اس کو علامت بعد من اللہ کی سمجھ کر مغموم اور متفکر ہوتے ہیں ۔ اچھے خواب نظر آ جاتے ہیں تو اس کو منتہائے مقصود سمجھ کر ناز کرتے ہیں ۔ کوئی واقعہ نظر آجاتا ہے تو اس پر پورا اعتماد کر لیتے ہیں ۔ کوئی بُرا خواب نظر آجاتا ہے ۔ تو اسی پریشانی میں گرفتار ہو جاتے ہیں ۔ حدیث میں ان سب خیالات کا غلط ہونا مصرح معلوم ہو گیا اور بُرے خواب کے ضرر سے بچنے کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا ۔ غرض خواب اتنی بڑی چیز نہیں جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے ۔ اصل فکر حالت بیداری کی چاہیئے کہ وہ مرضی عند اللہ ہے یا غیر مرضی ۔ کسی کا شعر بہت پسند آتا ہے ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(ترجمہ ؛ نہ رات ہوں ۔ نہ رات کا پرستار ہوں کہ خواب کی باتیں کہوں ۔ آفتاب کا غلام ہوں ۔ آفتاب کی باتیں کرتا ہوں)

(نیز یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ) خوابؔ مؤثر تو ہوتا نہیں (کہ قرب یا بعد میں اس کو دخل ہو) البتہ اگر واقعی خواب ہو تو اثر (یعنی کسی فعل نیک و بد کا) ہو سکتا ہے اور ہم جیسوں کے خواب ، خواب ہی نہیں ہوتے اس لیے نہ وہ مؤثر ہیں نہ اثر ۔ اس لیے وہ اصلاً قابلِ التفات نہیں ۔

چوتھی فصل ۔ فراستِ صادقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ تعالیٰ اخرجہ الترمذی ۔	مؤمن کی فراست سے ڈرو ۔ کیونکہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے ۔

لہ انفاسِ عیسیٰ صد ۱۲۷ ۔ ۲ہ تعلیم الدین صد ۹۳

منجملہ احوال رفیعہ کے فراستِ صادقہ ہے۔ یعنی سچی اٹکل، جو مطابق واقعہ کے ہو۔ صفائے[1] قلب کی بدولت جو کہ مواظبت ذکر اللہ و تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے اکثر وجدانی طور پر واقعات کے حقائق مدرک ہونے لگتے ہیں۔ اس کو فراست کہتے ہیں۔ گویا وہ کشف کا ایک شعبہ ہے حدیث صراحۃً اسکی مثبت ہے اور حدیث میں نور اللہ عبارت اسی صفا سے ہے جس کا سبب ذکر و تقویٰ ہے۔

صحابۂ[2] کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو مساجد اپنے فتوحات کے زمانے میں مختلف مقامات پر بنائی ہیں۔ ان کی جہت و قبلہ درست ہے۔ حالانکہ اس وقت ان کے پاس نہ قطب نما تھا نہ جغرافیہ نہ نقشہ۔ مگر بایں ہمہ کوئی بڑے سے بڑا مہندس اپنے آلات کے ذریعہ سے بھی ان میں نقص نہیں نکال سکتا۔ بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے ان کو ایسا علم عطا ہوا تھا کہ بے آلات ایسا کام انجام دیا۔

حضرت[3] شیخ عبد الحق رح نے لکھا ہے کہ ایک شخص ہمارے زمانے میں ایسا صاحبِ فراست ہے کہ صورت دیکھ کر آدمی کا نام بتلا دیتا ہے کیونکہ صورت میں اور نام میں خاص تناسب ہوتا ہے جسکو صاحبِ فراستِ صحیحہ دریافت کر سکتا ہے۔ مگر ایسی اعلیٰ فراست واقعی قابلِ حیرت ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک شخص نظر بد کر کے حاضر ہوا تو آپؓ نے مجملاً سب کو فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ ہمارے پاس ایسی حالت میں آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ یہ فراستِ کاملہ تھی اور اہل اللہ کو اس کا بڑا حصہ عطا ہوتا ہے۔ باقی گفتگو اور تحریر سے اندرونی امراض کا حال معلوم کر لینا یہ تو اب بھی بہت سوں کو حاصل ہے۔ مجھے (یعنی حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کو) بھی حق تعالیٰ نے ایسی فہم عطا فرمائی ہے کہ طرز گفتگو سے انداز طبیعت معلوم ہو جاتا ہے اور بحمد اللہ میں نے تجربہ کیا ہے کہ امراضِ باطنہ کے متعلق میری سو تجویزوں میں سے اگر سو پوری نہیں ہوئیں تو ننانوے تو ضرور صحیح ہوئی ہیں۔ جن میں سے اکثر کا اقرار خود مریض نے کیا۔ اور بعض کا ثبوت واقعات سے ہو گیا۔ البتہ ایسا ادراک بدون دلیلِ شرعی کے حجت نہیں۔

---

[1] التکشف ص ۳۳۸، [2] مقالات حکمت نمبر ۲۱

[3] الجعبین ص النفعلن ص ۲۲

پانچویں فصل فناء وبقاء

فناء[1] دو قسم کی ہے۔ فنائے واقعی اور فنائے علمی۔ فنائے واقعی یہ کہ افعال ذمیمہ ملکات ردیہ زائل ہو جائیں۔ مثلاً ظاہری معاصی چھوٹ جائیں۔ قلب سے حب غیر اللہ، حرص، طولِ امل و کبر و عجب و ریا وغیرہ سب نکل جائیں۔ اس کو فنائے واقعی اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں جو چیز زائل ہوئی ہے یعنی افعال و ملکات ردیہ واقع میں بھی فنا ہو گئے۔ بخلاف دوسری قسم کے جیسا عنقریب آتا ہے اور اس کو بعضے اصطلاحاً فنائے حسّی بعضے فنائے حسیبی بھی کہتے ہیں اور فنائے علمی یہ کہ غیر اللہ اس کے قلب سے مرتبہ علم میں نکل گیا۔ یعنی اس کو غیر اللہ کے ساتھ تعلق علمی نہیں رہا۔ بایں معنی کہ جیسا التفات واستحضارِ غیر کا پہلے تھا وہ نہ رہا۔ بلکہ ملکہ یادداشت کا راسخ ہو گیا۔ اور غیر سے ذہول ہو گیا۔ جیسا محبتِ مجازیہ میں بھی غلبہ کے وقت ایسا ہی ہوتا ہے کہ محبوب دل میں زیادہ بسا رہتا ہے۔ غیر کی طرف کسی بڑی ہی ضرورت سے توجہ ہوتی ہے ورنہ گنجائش نہیں ہوتی۔

پھر اس کے مراتب حسبِ استعدادِ سالک مختلف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کو استغراقِ محض ہو جاتا ہے کسی پر سکر غالب ہوتا ہے۔ کوئی مجذوب محض ہو جاتا ہے کوئی پھر بعض احوال کی تکمیل کیلئے یا دوسروں کی تکمیل کیلئے علم بالاشیاء کی طرف عود کرایا جاتا ہے مگر ابتداء کے علم بالاشیاء سے یہ علم بالاشیاء کمّاً وکیفاً وغایۃً مختلف ہوتا ہے اس حالت کو بقاء کہتے ہیں۔ جیسا کہ قسمِ اول میں بھی عین فنا کے اضداد (یعنی افعال و اخلاقِ حمیدہ) کے حصول کا نام بقا ہے۔ اس قسم ثانی کو فنائے علمی اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں جو چیز اس کے تعلق علمی سے خارج ہو گئی وہ واقع میں فانی و معدوم نہیں ہوئی۔ مثلاً ہم کو زید کا خیال نہ آیا تو واقع میں زید معدوم نہیں ہوا۔ فناء کی اس دوسری قسم کا نام گمشدنی ہے۔ پس مطلق فنا مقسم اور عام ہے اور گمشدنی اس کی ایک قسم خاص ہے۔ قسم اوّل کا فائدہ ظاہر ہے کہ مضرات شرعیہ کا ترک ہے جس کو تقویٰ کہنا چاہیئے۔ اور قسمِ ثانی کا فائدہ یہ ہے کہ یہی علمِ بالاشیاء بعض اوقات مفضی الی المعاصی ہو جاتا ہے پس اسبابِ بعیدہ سے بچنا تقویٰ کا کمال ہے۔ پھر بعض اوقات اس فناء کا بھی علم نہیں ہوتا۔ جیسے سوتے میں اکثر اوقات یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ میں سوتا ہوں۔ اس کو فناء الفناء کہتے ہیں اور بعض کی اصطلاح

---

[1] التکشف صـ۳۱ و تعلیم الدین صـ۹۲

میں فنار الفنار بقار کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ بیخودی جو فنار کہلاتی تھی جاتی رہی اور یہ شخص افاقہ میں آ گیا۔ اس لیے اس کو فنار الفنار کہا۔ اور فنائے صفاتِ بشریہ کو قربِ نوافل اور فنائے ذات کو قربِ فرائض بھی کہتے ہیں۔

چھٹی فصل۔ وجد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

انی احب[1] ان اسمعه من غیری فقرأت علیه وفیه فاذا عیناه تذرفان۔ اخرجه الخمسة الا النسائی۔

میں بھی چاہتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے (قرآن مجید) سنوں، سو میں نے آپ کو پڑھ کر سنایا اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ کے آنسو بہنے لگے۔
(بخاری مسلم، ابوداؤد و ترمذی نے اس کو روایت کیا)

نیز حضرت اسمار رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے:۔

ما کان احد من السلف یغشی علیه ولا یصعق عند تلاوة القرآن و انما کانوا یبکون و یقشعرون ثم تلین جلودهم وقلوبهم الی ذکر الله اخرجه رزین

سلف (صحابہ و تابعین) میں سے تلاوتِ قرآن کے وقت نہ کسی پر بے ہوشی ہوتی تھی اور نہ کوئی چیختا تھا، صرف رویا کرتے تھے اور ان کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ پھر خدا کی یاد کی طرف ان کے پوست اور قلوب نرم ہو جاتے تھے

کسی حالت محمودہ غریبہ کا غلبہ اصطلاح میں وجد کہلاتا ہے۔ تذرفان سے اس کی اصل ثابت ہوتی ہے۔ ان احادیث میں کاملین کا وجد مذکور ہے اور قرآن مجید میں بھی اسی کا تذکرہ ہے اور غشی و صعق جسکو عوام وجد سمجھتے ہیں۔ وہ وجد کی متوسط درجہ کی قسم ہے۔ جو سلف میں کم پائی جاتی ہے سلف کو بوجہ قوت تحمل کے اس درجہ کا وجد کم ہوتا تھا لیکن احیانا ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا جیسا کہ ترمذی شریف جلد ثانی صـ۶۸ میں حضرت ابوہریرہ رضـ کا بیہوش ہو جانا مروی ہے۔

اللہ[2] تعالیٰ کی طرف سے جو کیفیت قلب پر وارد ہو۔ اور اس کو اس کی حالت سے بدل ڈالے جیسا

۱ـ التکشف صـ۳۲۶، ۴۵۲، ۳۲۷ ۲ـ تعلیم الدین صـ۹۱

حزن و سرور۔ یہ وجد کہلاتا ہے اور اگر صاحبِ وجد کو بیخود کر دے۔ اس کو وجود کہتے ہیں اور اگر خود تغیر نہ ہو مگر سالک تغیر پیدا کرنے کا قصد کرے۔ اس کو تواجد کہتے ہیں اور پھر ترتیب اس کے مراتب کی یہ ہے کہ قصود، پھر ورود، پھر شہود، پھر وجود، پھر خمود۔ جیسے کسی دریا پر آنے کا ارادہ کیا۔ پھر اس پر آ پہنچا۔ پھر اس کو دیکھا۔ پھر سوار ہوا، پھر اس میں ڈوب گیا اور مر گیا۔ البتہ تواجد اگر بقصدِ ریا ہو۔ تو گناہ ہے۔

ساتویں فصل۔ وحدۃ الوجود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

قال اللہ تعالیٰ یؤذینی ابن آدم یسب الدھر بیدی (وانا الدھر) الامر اقلب اللیل و النھار۔ اخرجہ الثلثۃ و ابوداؤد	حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ابنِ آدم مجھ کو آزردہ کرتا ہے کہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہوں (آگے اس کی تفسیر ہے کہ) میرے ہی قبضہ میں سب کام ہیں (جو کہ زمانہ میں واقع ہوتے ہیں)۔

رات اور دن کو (کہ زمانہ کے حصے ہیں) میں ہی اول بدل کرتا ہوں (جس کی طرف آدمی واقعات کو منسوب کرتا ہے۔ سو زمانہ تو مع مافیہ کے خود میرے قبضہ میں ہے۔ پس یہ سب تصرفات میرے ہی ہیں تو اس کو برا کہنے سے درحقیقت مجھ کو برا کہنا لازم آتا ہے) روایت کیا اس کو بخاری و مسلم و مالک و ابوداؤد نے۔

ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور زمانہ دونوں متحد نہیں ہیں۔ مگر باوجود عدم اتحاد کے ایک تاویل سے جس کی تقریر بضمنِ ترجمہ کی گئی ہے۔ لفظ اتحاد کا حکم کیا ہے۔ محققین کے نزدیک اسی تاویل سے واست کا حکم ہمہ پر کیا گیا ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ ہمہ کا جو مصداق ہے۔ وہ سب مع اپنے افعال و آثار قبضۂ حق میں ہے۔ پس متصرفِ حقیقی و موجود مستقل صرف حق تعالیٰ ہے۔ ہمہ کوئی چیز نہیں۔ پس حدیث سے اس قول صوفیہ کی تائید ظاہر ہے۔

لہ التکشف ص ۶۰۰ تا ۵۸۰،۴۳۸ سے پہلے جیت متعلقہ معارف و حقائق بغور مطالعہ فرمائیں۔ م

کل ممکنات تو موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی موصوف بکمالِ ہستی نہیں بجز ذاتِ حق کے۔ اِسی مضمون کو ہمہ اوست سے تعبیر کر دیتے ہیں مطابق محاورات روزمرہ کے یہ ایک جملہ ہے جس طرح کوئی حاکم کسی فریادخواہ سے کہے کہ تم نے پولیس میں رپٹ لکھوائی۔ تم نے کسی وکیل سے مشورہ بھی کیا اور وہ عرض کرے کہ جناب پولیس اور وکیل سب آپ ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہوتا کہ حاکم اور پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کوئی چیز قابلِ شمار نہیں۔ آپ ہی صاحبِ اختیار ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمہ اوست کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمہ اور اُو ایک ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی قابلِ اعتبار نہیں۔ صرف او کی ہستی لائق شمار ہے اور باقی جتنے موجودات ہیں۔ ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے مگر ان کی ہستی ہستیِ کامل کے سامنے محض ایک ظاہری ہستی ہے حقیقی یعنی کامل نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر صفت میں دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک کامل ایک ناقص۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ کامل کے روبرو ناقص ہمیشہ کالعدم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ادنیٰ درجہ کا حاکم اپنے اجلاس میں شانِ حکومت دکھلا رہا تھا اور پندارِ منصب سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا کہ ناگہاں بادشاہ وقت برسرِ اجلاس بطریقِ دورہ آپہنچا۔ اس کے دیکھتے ہی ہوش اڑ گئے اور سب پندار و دعویٰ و نشہ و غرور ہرن ہو گیا اب جو اپنے اختیارات کو اقتدارِ شاہی کے روبرو دیکھتا ہے تو اس کا کہیں نام و نشان نہیں پاتا۔ نیچے کو گرا جاتا ہے۔ نہ آواز نکلتی ہے نہ سر اوپر اٹھتا ہے۔ اس وقت گو اس کا منصب و عہدہ معدوم نہیں ہوا۔ مگر کالعدم ضرور ہے۔ پس اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ گو ممکنات موجود ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے۔ موجود کیوں نہ ہوتے۔ مگر وجودِ حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص وضعیف وحقیر ہے۔ اس لیے وجودِ ممکن کو وجودِ حق کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے۔ مگر کالعدم ضرور کہیں گے۔ جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتدبہ ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی وحدۃ الوجود کے ہیں کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے۔ وجود کا ایک ہونا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ گو دوسرا ہے سہی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں ہے اس کو مبالغۃً وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے۔ حضرت حق کو مثل زندہ کے سمجھو اور ممکن کو مثل مردہ کے۔ کہ گو نعش مردہ بھی کسی درجہ کا وجود رکھتی ہے۔ آخر جسم تو ہے مگر زندہ کے روبرو اس کی ہستی قابلِ اعتبار نہیں۔ کیونکہ مردہ کی ہستی ناقص ہے اور زندہ کی ہستی کامل۔ کامل کے سامنے ناقص بالکل مضمحل اور

ناچیز محض ہے۔ اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیقِ علمی میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فناء کہلاتا ہے۔ یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حاصل وحدۃ الشہود کا ہے۔ جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کا ترجمہ ہے۔ ایک ہونا شہود کا یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں جیسا اوپر کی مثالوں سے واضح ہو چکا ہے۔ ایک اور مثال سب سے واضح تر شیخ سعدی نے بیان فرمائی ہے ؎

نگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ ✤ بتابد بشب کرمکِ چوں چراغ

یکے گفتش اے مرغکِ شب فروز ✤ چہ بودت کہ بیرون نیائی بروز

ببیں کاتشیں کرمکِ خاک زاد ✤ جواب از سرِ روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بصحرا نیم ✤ ولے پیشِ خورشید پیدا نیم

(یعنی جگنو جو رات کو مانند چراغ کے چمکتا ہے۔ اس سے کسی نے کہا کہ تو دن میں باہر کیوں نہیں نکلتا تو اس نے بہت ہی اچھا جواب دیا کہ میں رات دن جنگل ہی میں ہوتا ہوں۔ لیکن سورج کی روشنی کے سامنے میری روشنی ظاہر نہیں ہوتی)

پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے کما قال مرشدیؒ۔ مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے اس لیے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔ جو بہ نسبت عنوان متروک کے اس معنی میں زیادہ ظاہر ہے کیونکہ لفظ وحدۃ الوجود کی دلالت معنی مذکور پر مجازی ہے اور وحدۃ الشہود کی دلالت اس معنی پر حقیقی ہے اور دلیلِ نقلی اس مسئلہ کی یہ ہو سکتی ہے کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ جیسا شارح عقائد نسفی نے تفسیر کی ہے۔

ظاہر ہے کہ تمام کمالات حقیقۃً اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں اور مخلوقات کے کمالات عارضی طور پر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا و حفاظت کے سبب ان میں موجود ہیں۔ ایسے وجود کو اصطلاح میں وجود ظلی کہتے ہیں اور ظل کے معنی سایہ کے ہیں۔ سو سائے سے یہ نہ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی جسم ہے یہ عالم اس کا سایہ ہے بلکہ سایہ کے معنی وہ معنی ہیں جیسے کہا کرتے ہیں۔ ہم آپ کے زیر سایہ رہتے ہیں۔

لہ تعلیم الدین صہ ۹۵۔

یعنی آپ کی حمایت اور پناہ میں۔ اور ہمارا امن و عافیت آپ کی توجہ کی بدولت ہے اسی طرح چونکہ ہمارا وجود بدولت عنایتِ خداوندی ہے۔ اس لیے اس کو وجودِ ظلی کہتے ہیں۔ پس یہ بات یقیناً ثابت ہوئی کہ ممکنات کا وجود حقیقی اور اصلی نہیں ہے۔ عارضی اور ظلی ہے۔ اب وجودِ ظلی کا اگر اعتبار نہ کیا جائے تو صرف وجود حقیقی کا ثبوت ہوگا اور وجود کو واحد کہا جاوے گا۔ یہ وحدۃ الوجود ہے اور اگر اس کا بھی اعتبار کیجیے کہ آخر کچھ تو ہے۔ بالکل معدوم تو ہے ہی نہیں۔ گو غلبۂ نورِ حقیقی سے کسی مقام پر سالک کو وہ نظر نہ آوے یہ وحدۃ الشہود ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ نورِ ماہتاب نورِ آفتاب سے حاصل ہے۔ اگر اس نورِ ظلی کا اعتبار نہ کیجیے تو صرف آفتاب کو منور ماہتاب کو تاریک کہا جاوے گا یہ مثال وحدۃ الوجود کی ہے اور اگر اس کے نور کا بھی اعتبار کیجیے کہ آخر اسکے کچھ تو آثارِ خاصہ ہیں۔ گو وقتِ ظہورِ نورِ آفتاب کے وہ بالکل مسلوب النور ہو جاوے۔ یہ مثال وحدۃ الشہود کی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہے۔ مآل کار دونوں کا ایک ہے اور چونکہ اصل و ظل میں نہایت قوی تعلق ہوتا ہے اس کو اصطلاحِ صوفیہ میں عینیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے۔ یہ تو صریح کفر ہے۔ چنانچہ وہی صوفیہ محققین اس عینیت کیساتھ غیریت کے بھی قائل ہیں۔ پس یہ عینیت اصطلاحی ہے۔ نہ لغوی۔ مسئلے کی تحقیق تو اسی قدر ہے اس سے زیادہ اگر کسی کے کلام منثور یا منظوم میں پایا جاوے۔ وہ کلام حالتِ سکر کا ہے نہ قابلِ ملامت ہے نہ لائق نقل و تقلید۔

مسئلہ[1] وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود، مسائل کشفیہ سے ہیں۔ کسی نص کے مدلول نہیں۔ ایسے مسائل کے لیے یہی غنیمت ہے کہ وہ کسی نص سے مصادم نہ ہوں۔ یعنی کوئی نص ان کی نافی نہ ہو۔ باقی اس کی کوشش کرنا کہ نص کو ان کا مثبت بنایا جائے۔ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر نص اس کی محتمل ہو تو درجۂ احتمال تک اس کا رکھنا غلو تو نہیں مگر تکلف ہے اور اس کو درجۂ احتمال سے بڑھا دینا غلو ہے اور اگر وہ محتمل بھی نہ ہو۔ تو اس کا دعویٰ کرنا احتمالاً یا جزماً صریح تحریف ہے نص کی۔ البتہ اگر وہ دعویٰ بطور تفسیر یا تاویل کے نہ ہو محض بطور علمِ اعتبار کے ہو۔ تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ حکم اگر کسی اور نص سے ثابت ہو۔ تب تو وہ اعتبار داخل حدود ہے اور اگر وہ کسی اور نص سے ثابت نہ ہو تو

---

[1] بوادر النوادر ص ۶۶۳، ۶۶۵

وہ بھی تکلف ہے۔

ضروری وصیت اول تو تمام مسائل کلامیہ میں عموماً اور ان میں سے ان مباحث میں جن کا تعلق ذات و صفات سے ہے خصوصاً بدون قطعی عقلی یا نقلی کے محض ظنیات کی بناء پر کہ کشف سب سے انزل ہے کوئی حکم کرنا، خصوص حکم جازم کرنا۔ بلکہ بلا ضرورت کچھ بھی گفتگو کرنا، سخت محل خطر و خلاف مسلک سلف صالحین ہے اور جن بزرگوں نے کچھ کلام کیا ہے۔ ان میں اکثر کی غرض محض اہلِ اہوا کا دفع تھا۔ (جیسا حضرت مجدد صاحبؒ نے بغرض اصلاح غلاۃ وجودیہ اس میں کلام فرمایا۔) گو بعض نے اس کو مقصود بنا لیا جو کہ خلاف احتیاط ہے۔ اسلم ایسے مسائل میں یہی ہے کہ نصوص سے تجاوز نہ کریں اور سلف کے مسلک پر اور ان کے اس ارشاد پر کہ اَبْهِمُوْا مَا اَبْهَمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی عمل رکھیں۔ اور اگر کوئی حقیقت زائدہ علی النص کسی دلیل ظنی سے کہ کشف بھی اس میں داخل ہے۔ منکشف ہو اور کسی دلیلِ عقلی قطعی اور نیز کسی نص قطعی یا ظنی کے مخالف بھی نہ ہو تو اس میں بھی خوض نہ کریں۔ دونوں جانب کو محتمل سمجھتے رہیں چونکہ یہ مسئلہ متکلم فیہ ابھی ان ہی مسائل سے ہے جن کا تعلق ذات و صفات سے ہے کیونکہ حاصل اس کا ارتباط الحادث بالقدیم ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ رکھیں اور اجمالاً یہ اعتقاد تو جزم کے ساتھ رکھیں کہ عالم پہلے ناپید تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے علم و قدرت و ارادہ سے پیدا فرمایا۔ باقی یہ کہ کس طرح پیدا فرمایا اس میں خوض نہ کریں نہ کلام کریں۔ جیسے مسئلہ قدر میں احادیث میں بھی تعلیم منصوص ہے کہ اجمال کے درجہ میں اس کے اعتقاد کو فرض اور شرطِ ایمان فرمایا۔ اور تفصیل کے درجہ میں خوض یا کلام کو منع فرمایا ہے۔

باب دوم۔ احوال محتملۃ الضرر

(یعنی وہ احوال جن میں نقصان کا اندیشہ ہے۔ مقصد یہ کہ ذیل میں ذکر کیے جانے والے حالات وہ ہیں کہ اگرچہ ان سے نفع پہنچنے کی بھی توقع ہے۔ تاہم احتمال اس کا بھی ہے کہ وہ کسی وقت ضرر کا باعث ہو جائیں۔)

فصل اوّل ۔ استغراق

لوگوں[1] نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ لڑکی (آپ کی صاحبزادی کی طرف اشارہ کر کے جو آپؓ کے ساتھ جا رہی تھیں) آپ کی ہے تو آپ بہت غور سے اس کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ہاں گھر والے کہتے تو ہیں کہ یہ میری لڑکی ہے یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے بلکہ گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔

کیفیتِ[2] استغراقیہ جو حضرات صوفیہ سے متوسطین کو حاصل ہوتی ہے کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ جیسا کہ عام لوگ سمجھ رہے ہیں۔ اگر استغراق بڑا مرتبہ ہوتا تو نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد صادر نہ ہوتا۔ کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز کو طول دوں۔ مگر نماز میں کسی بچہ کی آواز سن کر تخفیف کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت آپ کو استغراق نہ ہوتا تھا۔ البتہ محمود ضرور ہے۔ (بشرطیکہ اس استغراق سے کوئی شرعی عیب پیدا نہ ہو)

دوسری فصل تصرف و تاثیر (توجہ)

حضرت ابی بن کعبؓ (ایک لمبی حدیث میں) روایت ہے۔

فلما[3] رای رسول اللہ صلی اللہ	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری
علیہ وسلم ما قد غشینی ضرب	یہ حالت دیکھی جو مجھ پر غالب ہو رہی تھی۔
فی صدری ففضت عرقا وکانما	آپؐ نے میرے سینہ میں ہاتھ مارا میں
انظر الی اللہ خوفا۔	پسینہ پسینہ ہو گیا اور خوف سے میری یہ
الحدیث رواہ مسلم۔	حالت ہوئی کہ گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں

ہاتھ مارنا جس سے یہ حالت پیدا ہوئی۔ تصرف ہے۔ بعض[4] لوگ فطرتاً صالح للتصرف ہوتے

---

[1] حرائق القلندر صـ۳۹ ، [2] مقالات حکمت نمبر ۸۷ ، [3] التکشف صـ۴۴۴ ،

[4] انفاس عیسیٰ صـ۱۰۲

ہیں۔ گو صاحبِ نسبت نہ ہوں۔ اس کا طریق صرف ہمت کا صرف کرنا ہے۔ دوسرے کی بھی ہمت اگر قوی ہو تو اس سے روک سکتا ہے۔ طریقِ تصرف کی تحصیل صرف مشاقی پر ہے۔

ضیاء القلوب میں ہے۔ اما ایں تصرفات عجیبہ وغریبہ بدون حصول نسبت فنا و بقاء دست نمی دہد۔ و ایں معاملات از متوسطان سلوک اکثر واقع شوند۔ اس ارشاد کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ تصرفات عجیبہ و غریبہ بدون حصولِ نسبت فنا و بقاء حاصل نہیں ہوتے۔ بریں معنی مشاقی یا قوتِ فطریہ کے ساتھ (نافع فی الدین ہونا) بھی شرط ہے کیونکہ سالک کا اصل موضوع یہی نفع فی الدین ہے۔ مراد بعض تصرفات عجیبہ و غریبہ سے وہی تصرفات ہیں جو سلوک سے متعلق ہیں۔

تصرف[1] وتاثیر دو طرح سے ہے۔ تاثیر کرنا باطنِ مرید میں۔ جس سے اس کو حق تعالےٰ کی طرف کشش پیدا ہو اور تاثیر دوسری اشیائے عالم میں خواہ ہمت سے یا دعا سے۔

توجہ[2] (تصرف) کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ تو غیر اختیاری ہے وہ یہ کہ دل چاہتا ہے کہ فلاں شخص میں ذوق و شوق۔ محبتِ حق، خوف وغیرہ پیدا ہو جائے۔ اس کے واسطے دعا کر دے۔ اس کا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ دوسرا درجہ توجہ کا متعارف مصطلحہ ہے۔ وہ یہ کہ شیخ اپنے قلب کو سب خطرات سے خالی کر کے خاص توجہ کرتا ہے۔ اس میں تصور بقصدِ تصرف ہوتا ہے۔ یہ گو جائز ہے مگر ذوقاً پسند نہیں اور اس میں فاعل قوت برقیہ ہوتی ہے۔ جو انسان کے اندر ودیعت رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ زمین میں بھی یہ قوت بہت ہے۔ نظر لگنے میں بھی اسی کا اثر ہوتا ہے۔ مسمریزم اور توجہ متعارف کا منشاء و ماخذ ایک ہے۔ ایک بُری جگہ صرف ہوتا ہے اور ایک اچھی جگہ۔ صرف اتنا ہی فرق ہے اور یہ مشق پر موقوف ہے۔ اس لیے مشق کی جاتی ہے کہ دوسروں پر نسبت کا القاء کریں گے۔ بعض مشائخ کے یہاں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے مگر اس کا نفع باقی نہیں رہتا۔ طالب کیفیت کو نفع سمجھ کر اس کو کافی جانتا ہے۔ اس لیے کام چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں چند خلجان ہیں۔ اول تو سنت میں منقول نہیں۔ دوسرے اس سے اکثر کو کام میں سستی ہونے لگتی ہے۔ خود دوسرے پر اثر پڑے اس کا مضائقہ نہیں۔ باقی خود توجہ کرنے میں تو اس وقت قلب میں خدا کی طرف توجہ مطلق نہیں رہتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یوں تو معمولی بات چیت میں بھی توجہ الی اللہ نہیں ہوتی۔ تو جواب یہ ہے کہ یہ اس سے اشد ہے۔ کیونکہ اس میں قلب کو قصداً خالی کیا جاتا ہے اور خدا کی طرف سے

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۱۰۰، [2] کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۶۶

توبہ ہٹا نا غیرت کی بات معلوم ہوتی ہے حلقہ متعارف میں یہی ہوتا ہے بس مسنون طریقہ اصلاح کا وعظ نصیحت، دعا ہے۔ اور توجہ تام حق تعالیٰ کا حق ہے۔ البتہ اس کے کچھ آداب ہیں۔

ایک[۱] یہ کہ غرض اور طریق مباح ہو۔ دوسرے یہ کہ ظاہراً یا باطناً اس پر عجب نہ ہو اور اس کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ اس کو مقرون بالدعا کر دیا جائے۔ جیسا حدیث میں دعا بھی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس میں زیادہ اشتغال نہ کرے کہ فاعل و منفعل دونوں کے لیے کثرت میں فتنہ ہے۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بکثرت منقول نہیں۔ جیسا کہ آجکل بعض نے اختیار کیا ہے اور فتن اس کے مشاہد ہیں۔ ان میں اعظم یہ ہے کہ عموماً اس کو کمال سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ عمل محض ضرورت کے لیے ہے۔ والضروری یتقدر بقدر الضرورۃ (ضروری چیز پر بقدر ضرورت اکتفا کیا جاتا ہے) بعض اکابر نے تصریح کی ہے کہ جب مرید میں کوئی ذکر اثر نہ کرے۔ تب پیر توجہ سے کام لے وجہ اس کی وہی تقدر بقدر الضرورۃ (اکتفا بقدر ضرورت) ہے۔

بعضے[۲] ناواقف غلطی سے یوں سمجھتے ہیں کہ فیض پہنچانا شیوخ کے قبضہ و اختیار میں ہوتا ہے مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارہ میں اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ الخ مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ کہ آپ اپنے چچا ابوطالب کو اسلام کی ترغیب دے رہے تھے (اور وہ نہ مانتے تھے۔) اس حدیث سے اس غلطی کی پوری اصلاح ہوتی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں نہ ہو تو دوسروں میں تو اس کا کب احتمال ہے۔ اور جب نفع دینی ہو جو اصل کام شیخ کا ہے مستقلاً خارج از اختیار ہے تو نفع دنیوی تو بدرجۂ اولیٰ استقلالاً اختیار میں نہ ہوگا۔ بہت سے جہلاء اس میں بھی گرفتار ہیں۔ کہ نعوذ باللہ اہل اللہ کو ساری خدائی کا مالک سمجھتے ہیں۔ بدلالۃ النص اس کی بھی اصلاح ہوگئی۔

۱؎ التکشف ص ۳۶۵ ۲؎ التکشف ص ۳۴۰

تیسری فصل سکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

قال جبرئیل[1] یا محمد لو رأیتنی	حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے
وانا اخذ من و حال البحر و	محمدؐ! اگر آپ مجھ کو (اس وقت) دیکھتے (تو تعجب
ادسه فی فیه مخافة ان	فرماتے) کہ میں دریا کی کیچڑ لے کر فرعون کے منہ
تدرکه الرحمة اخرجه	میں ٹھونستا تھا۔ اس اندیشہ سے کہ اس کو
الترمذی۔	رحمتِ الٰہیہ نہ پالیوے۔ (ترمذی شریف)

باوجودیکہ مدار قبولِ ایمان کا بعد اجتماعِ شرائط کے قلب پر ہے باوجود اس کے اس کے منہ میں کیچڑ دینا یہ بسبب غلبۂ سکر کے تھا۔ اور سبب اس غلبہ کا غایت درجہ بغض فی اللہ تھا۔

وارد غیبی کے ظاہری و باطنی احکام میں امتیاز کا اٹھ جانا سکر ہے اور اس امتیاز کا عود کر آنا صحو ہے۔ جب عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مرگیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس پر نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے (منع نہیں فرمایا۔ بخاری، مسلم، ترمذی نسائی) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قلب پر بغض فی اللہ کا ورود ایسا قوی ہوا کہ ان کو اس طرف التفات نہ ہوا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً و فعلاً کیا معاملہ کر رہا ہوں۔ جو صورۃً ادب سے مستبعد ہے۔ سو ایسی حالت میں شارع علیہ السلام نے معذور رکھا ہے۔ پھر جب حالت صحو میں آئے۔ تو حدیث میں آیا ہے کہ بعد میں مجھ کو اپنی جرأت پر تعجب ہوا۔ اور نادم ہوا۔

غلبۂ[2] حال جس طرح ناقصین کو ہوتا ہے۔ اسی طرح گاہے کاملین پر بھی ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ انبیاء کرام پر بھی ہوتا ہے۔ واقعۂ بدر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی فتح کیلئے دعا فرما رہے تھے حتیٰ کہ یہ بھی فرمایا اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابة لم تعبد بعد الیوم۔ یعنی اے اللہ!

---

[1] التکشف صـ ۳۳۵، ۳۳۰ [2] الیواقیت الجواہر صـ ۱۸!، العید والوعید صـ ۹

اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہوگئی جو اس وقت میرے ساتھ ہے تو پھر آج کے بعد کوئی آپ کا نام نہ لیگا۔ کوئی آپ کی پرستش نہ کرے گا۔ اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبۂ حال تھا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ کوہِ طور پر گئے تھے۔ وہاں ان پر صاعقہ نازل ہوئی جس سے سب ہلاک ہو گئے۔ اس وقت موسیٰؑ نے دعا کی۔ جس میں یہ جملہ بھی ہے

اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ — یہ تیری آزمائش ہے۔ اس کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے

تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ — بے راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ پر ڈال دیتا ہے

فرماتے ہیں کہ یہ عبادتِ عجل (بچھڑے) کا قصہ آپ ہی کا تو کرشمہ ہے۔ یہ بھی غلبۂ حال ہی تھا۔ ورنہ بدون غلبۂ حال کے انبیاء کرام علیہم السلام ایسی بات نہیں فرما سکتے۔ اسی طرح بعض کاملین پر بھی غلبۂ حال ہوتا ہے۔ جس میں وہ معذور ہوتے ہیں۔ مگر ان کو غلبۂ حال ایسا نہیں ہوتا کہ مسلوب الحواس ہو جائیں بلکہ ان کے حواس غلبۂ حال میں بھی درست رہتے ہیں اور ذرا سے محرک سے حالتِ سکر مبدل بصحو ہو جاتی ہے۔ مگر اس حالتِ (سکر) کے اقوال (و اعمال) میں ان کی تقلید نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ باتیں غلبۂ حال اور درجۂ معذوری میں کہتے ہیں۔ اور معذوری کی حالت کا اتباع نہیں ہو سکتا صاحبِ حالِ صادق پر جب تک عذر غالب نہیں ہوتا بہت ضبط سے کام لیتا ہے۔ جب ضبط کی طاقت نہیں رہتی اور اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس سے ایسی حرکات اور ایسے اقوال شطحیہ صادر ہونے لگتے ہیں۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند — چو طاقت نماند گریباں درند

حالتِ صحو میں ضبط واجب ہے اور ایسی حالت میں اخفاءِ حال میں کوشش کرو۔ کیونکہ اہلِ زمانہ فتنہ انگیز ہیں اور ایسے امور میں فتنہ برپا کرتے ہیں اور لوگوں کو فتنہ میں ڈالنا یا خود فتنہ میں پڑنا درست نہیں اور زمانہ سکر میں جو کچھ اظہارِ اسرار ہو گیا ہے۔ اب اشکِ ندامت سے سکر کے اس دھبہ کو خرقۂ وجود سے دھونا چاہیئے۔ یعنی اس سے عذر اور توبہ چاہیئے۔ کیونکہ صحو میں ورع و تقویٰ واجب ہے۔ اور مافات کی تلافی لوازمِ تقویٰ سے ہے اور رہا یہ کہ سکر میں تو گناہ ہوا ہی نہ تھا۔ پھر توبہ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ بعض اوقات تو سکر بھی ناقص ہوتا ہے جس

ف۱ التکشف ص۲۳۳

ہیں من کل الوجوہ معذور نہیں ہوتا۔ یعنی اختیار رہتا ہے مگر ناتمام جس میں ضبط متعذر (ناممکن) نہیں۔ بلکہ متعسر (مشکل) ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت گناہ لکھا جانا بعید نہیں۔ اور اگر سکر تمام بھی ہو تب بھی فی نفسہ تو کلمات غیر مشروعہ قبیح ہیں۔ اس کا قبح (بُرا ہونا) مقتضی معذرت ہے۔ جیسا بلا اختیار کسی بزرگ کو اپنی ٹھوکر لگ جائے۔ تو اطلاع ہونے پر کس قدر شرماتا ہے اور معذرت کرتا ہے۔ تیسرے اس لیے کہ خلق ضلالت سے محفوظ رہے۔ جیسا حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہٗ جب صحو میں آتے اور سنتے کہ میں نے حالتِ سکر میں سبحانی ما اعظم شانی کہا تھا تو فرماتے لو قلت سبحانی ما اعظم شانی فانا مجوسی فاقطع زناری و اقول اشھد ان لا الٰہ الا اللہ (یعنی اگر میں نے سبحانی الخ کہا ہے تو میں مجوسی ہو گیا کہ میں زنار توڑتا ہوں۔ اور اشہد الخ پڑھتا ہوں۔)

(خلاصہ مطلب یہ ہے کہ) حتی الامکان حالات باطنی کا ضبط چاہیئے۔ کہ نااہلوں سے یا حکم کو ضرر ہو گا۔ یا خود ان کو انکار کا ضرر ہو گا۔ یا ان کے انکار سے خالی الذہن لوگوں کو مخالفت اہلِ حال کا ضرر ہو گا۔ یا ان نااہل نافہموں میں بعضے معتقد ظاہر پر محمول کر کے اپنا دین خراب کریں گے تو ایسی حالت بے اختیاری یعنی سکر کی باتیں قابلِ تقلید نہیں۔ مگر ان پر انکار بھی نہ کرنا چاہیئے۔

چوتھی فصل۔ قبض و بسط

عن عائشۃ رض فی حدیث طویل ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حزن حزنا غدا منہ مرارا کی یتردی من رؤس شواھق الجبال فکلما اوفی بذروۃ جبل لکی یلقی نفسہ منہ تبدی لہ	حضرت عائشہؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابتداء نبوت میں جبکہ وحی میں توقف ہوا) اس درجہ مغموم ہوئے کہ غم کے سبب کئی بار اس ارادہ سے تشریف لے گئے۔ کہ پہاڑ کی بلندی پر سے گر کر جان دیدیں۔ سو جب کسی پہاڑ کی چوٹی

جبریل فقال یا محمد انک رسول اللہ حقا فیسکن لذلک جاشہ و تقر نفسہ۔ (رواہ البخاری)	پہاڑ پر اپنے کو گرانے کی غرض سے چڑھتے۔ تو جبرئیل آپ کو نظر آتے اور فرماتے اے محمد! (مغموم مت ہو) آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو سچ مچ اس سے آپ کے قلب کو سکون ہو جاتا اور جی ٹھہر جاتا۔

واردات کا انقطاع جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے۔ قبض ہے۔ حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ خوف[1] و رجا جب بڑھ جاتا ہے۔ قبض و بسط ہوتا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ خوف و رجاء آئندہ کی حالت یاد کر کے ہوتا ہے اور محبوب[2] کی تجلی جلالی یعنی آثار عظمت و استغناء کے فی الحال وارد ہونے سے قلب کا گرفتہ ہونا قبض کہلاتا ہے۔ اسی حالت کو (حدیث عبداللہ بن کعب واقعہ تخلف عن تبوک میں) ضیق ارض و ضیق النفس سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور قبض کے مقابل حالت بسط ہے۔ یعنی آثار لطف و فضل کے ورود سے قلب کو سرور و فرحت ہونا۔

کبھی سوء[3] اعمال کی وجہ سے سالک سے لذت فی الطاعات مفقود ہو جاتی ہے اور گاہے بوجہ فتور و کسل و ملال کے طبعًا پیش آتی ہے اور کبھی بمصلحت امتحان کے کہ یہ حق کا طالب ہے یا لذت کا۔ منجانب اللہ وارد کی جاتی ہے۔

قبض کا سبب صرف عدم رضائے حق نہیں۔ بلکہ بعض دفعہ حکمتوں کی وجہ سے قبض طاری کیا جاتا ہے۔ سالک کی اصلاح کے لیے یا سنبھالنے کیلئے بھی بسط کو سلب کر لیا جاتا ہے تاکہ عجب و کبر میں مبتلا نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ جب بندہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص مرتبہ مقدر ہوتا ہے۔ جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے جسد اور اس کے اہل اور اس کے مال کو کسی بلا میں مبتلا کر دیتا ہے پھر وہ صبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہوا تھا۔ حضرت حاجی صاحبؒ (یعنی شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز) نے فرمایا کہ قبض حقیقۃً بصورت قہر، لطف ہے ۔۔

---

[1] تعلیم الدین صد ۹۱ [2] التکشف صد ۳۳۶ [3] انفاس عیسیٰ صد ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو آں صلاح تست آئیں دل مشو

(ترجمہ: - اے سالک جب تجھے قبض پیش آئے تو تو اس سے دل گرفتہ نہ ہو کہ وہ تیری اصلاح کا ذریعہ ہے)۔

قبض منافع میں بسط سے بھی زیادہ ہے۔ گو عین قبض کے وقت وہ منافع معلوم نہ ہوں مگر بعد میں اکثر معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر معلوم بھی نہ ہوں تب بھی حاصل تو ہوتے ہیں اور حصول ہی مقصود ہے نہ کہ حصول کا علم۔ چنانچہ غایتِ انکسار اور عبدیت کے آثار مثلاً مشاہدۂ عجز و ضعف اور غلبۂ انکسار و افتقار و فنائے دعویٰ حالاً کا ترتب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اکابر کا الہام ہے۔ انا عند منکسرۃ القلوب {میں (خدا تعالیٰ) شکستہ دلوں میں ملتا ہوں}

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ :. جز شکستہ مے نگیرد فضل شاہ

(ترجمہ: - عقل و سمجھ کو تیز کرنا حقیقت میں راہ نہیں یعنی اس سے اسرار اور مقاصد حاصل نہیں ہوتے شکستہ دل کے سوا بادشاہ حقیقی کا فضل کوئی حاصل نہیں کر سکتا یعنی اس کا فضل متواضع لوگوں پر متوجہ ہوتا ہے)۔

قبض سے عجب کا علاج ہوتا ہے۔ عبدیت کی حقیقت کا اس میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ فنا اور تہیدستی رای العین ہو جاتی ہے۔ اختیاری کام کی پابندی ایسے ہی وقت دیکھنے کے قابل اور محلِ امتحان ہے۔ اگر اس امتحان میں پاس ہو گیا اعلیٰ درجہ کے نمبر کا مستحق ہوگا۔

قبض فی نفسہ تو مضر نہیں مگر جب اس کا سبب کوئی فعل قبیح ہو تو وہ قبض مضر ہے اسکی اصلاح یہی ہے کہ اس فعل کا تدارک کیا جائے۔

جو امر غیر اختیاری ہو محمود ہے۔ قبض خود حالتِ نافعہ ہے۔ اس کا علاج ضروری نہیں۔ اور جو علاج کے عنوان سے بزرگوں نے کچھ لکھا ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس کا ازالہ کیا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ قبض کے وقت یہ عمل کیا جائے۔ گویا یہ اعمال آداب و حقوق ہیں قبض کے۔ پھر ان کے بعد خواہ قبض رہے یا جائے دونوں حالتوں میں رضا و تفویض چاہیئے۔ غسل تازہ کر کے کپڑے بدل کر عطر لگا کر دو رکعت نفل پڑھ کر استغفار کرنا اور ایک ہزار بار یا باسط پڑھنا قبض کے لیے نافع ہے۔ ذکر جس قدر ہو سکے کر لیں۔ اگرچہ کسی قدر تکلیف بھی کرنی پڑے

اور اگر چہ اس میں دلچسپی بھی نہ ہو اور جس سے زیادہ کلفت ہو ۔ اس کو تخفیف کر دیں اور استغفار کی کثرت رکھیں اور جب تک یہ حالت رہے ۔ ایک بار یا دو بار ہفتہ میں (اپنے شیخ کو) اطلاع دیتے رہیں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد یہ حالت رفع ہو جائے گی ۔ سب کو یہ حالت پیش آتی ہے (یہ) راہ قطع ہونے کی علامت ہے اور یہ سب راستے کی گھاٹیاں ہیں ۔

پانچویں فصل ۔ مشاہدہ

عن[۱] حنظلة (فی حدیث طویل) قلت نکون عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم یذکرنا بالنار والجنة کانا رأی العین الخ اخرجہ مسلم والترمذی۔	حضرت حنظلہؓ سے (ایک لمبی حدیث میں) روایت ہے میں نے کہا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ہم کو دوزخ بہشت یاد دلاتے ہیں تو اس وقت ایسے ہوتے ہیں ۔ گویا کھلی آنکھوں ان کو دیکھ رہے ہیں ۔

کسی امر کے استحضار اور خیال کا قلب پر غالب اور قوی ہو جانا مشاہدہ کہلاتا ہے ۔ اس حدیث میں اسی کا اثبات ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جنت دوزخ کی یاد کی نسبت یہ فرمایا کہ گویا کھلی آنکھوں دیکھنے لگتے ہیں ۔ مراد اس سے یہی غلبۂ استحضار ہے اور مشاہدہ کے لغوی معنی مراد نہیں ہوتے ۔ بعضے ناواقفی سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں ۔

مشاہدہ[۲] (حق) کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک مشاہدہ تام یعنی رؤیت یہ تو جنت میں ہوگا ۔ دنیا میں نہیں ہو سکتا ۔ دوسرے مشاہدہ ناقص یعنی استحضار تام ۔ یہ دنیا میں ہوتا ہے ۔ گو مشاہدہ تام کے سامنے یہ دوسری قسم استتار ہی میں داخل ہے ۔ مگر چونکہ دنیا میں سالک کو اس سے بہت کچھ تسلی ہو جاتی ہے ۔ اس لیے یہاں کے اعتبار سے استحضار تام ہی کو مشاہدہ کہا جاتا ہے ۔ یہ مشاہدہ خواہ تام ہو یا ناقص ۔ اس کا دوام بندہ کی مصلحت کے خلاف ہے ۔ نہ اس لیے کہ وہاں سے کچھ کمی

۱ے التکشف ص ۳۲۲ ، ۳۲۱ ۲ے کمالات اشرفیہ ص ۳۱ ،

ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ بندہ کو دوام مشاہدہ کا تحمل نہیں۔ کیونکہ دنیا میں تجلی دائمی سے بندہ مغلوب ہو جاتا ہے اور ہر وقت ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی ہے اور مغلوبیت میں اعمال کے اندر کمی آجاتی ہے جس سے قرب کم ہو جاتا ہے کیونکہ مدار قرب اعمال ہی پر ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں کیا کہ حضور تام کے ہوتے ہوئے یا رؤیت کے ہوتے ہوئے حضور یا رؤیت سے منع کر دیا ہو۔ کیونکہ یہ صورت سالک کیلئے اشد ہے بلکہ یہ کیا کہ سالک کو مخلوق کی طرف متوجہ کر دیا اور جنت میں بعض اوقات لغائذ نفس کی طرف متوجہ کر دیں گے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک محبوب نے عاشق کو دیکھا کہ یہ بڑے غور سے مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ کہیں زیادہ دیکھنے سے مر نہ جائے۔ تو اب ایک صورت تو یہ تھی کہ عاشق کو اپنے سامنے رکھ کر دیدار سے منع کر دے کہ ہم کو مت دیکھو۔ یہ صورت بہت سخت ہے۔ اس میں عاشق کو سخت بے چینی ہوتی ہے۔ اس لیے محبوب نے یہ تو نہ کیا۔ بلکہ اس نے تھوڑی دیر کے واسطے عاشق کو بازار بھیج دیا کہ جاؤ آم لے آؤ۔ اس صورت میں گو محبوب سے فی الجملہ استتار ہو گیا مگر اس سے شوق معتدل ہو جاوے گا اور بازار جانے میں عاشق کی لذت بھی کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ تعمیل حکم محبوب کی بھی ایک خاص لذت ہے۔ جو لذت دیدار ہی کے قریب ہے (عشاق اس کو خوب سمجھتے ہیں)

اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی حضور تام تجلی باقی رکھ کر دیدار مشاہدہ سے منع نہیں کیا بلکہ تجلی کو مستتر کر دیا اور عشاق کو دوسری طرف متوجہ کر دیا کہ ہر وقت حضور و مشاہدہ سے عشاق کے دل پھٹ نہ جاویں اور اس کا شوق معتدل رہے۔

چھٹی فصل۔ کرامت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ	(حضرت زکریا) یوں فرماتے کہ اے مریم!
هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ	یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آئیں
عِنْدِ اللّٰهِ۔ الآیۃ	وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔

ا ۔۔۔ الآیۃ ۔۔۔

عن[1] ابی هریرۃ فی الحدیث الطویل عن بعض بنات الحارث کانت تقول لقد رأیتہ یاکل من قطف عنب وما بمکۃ یومئذ ثمرۃ وانہ لموثق بالحدید الخ (اخرجہ البخاری)	حضرت ابوہریرہ رضؓ سے ایک طویل حدیث میں حارث کی ایک دختر سے منقول ہو وہ کہتی ہے میں نے ان (حضرت خبیبؓ) کو انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا۔ اور اس وقت مکہ میں میوہ یا پھل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اور خود وہ لوہے میں مقید تھے۔ (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔)
عن انس قال کان اسید بن حضیر و عباد بن بشر عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ مظلمۃ فخرج من عندہ فاذا بنورین بین ایدیھما فلما افترقا صار مع کل واحد منھما نور اخرجہ البخاری۔	حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تاریک رات میں حاضر تھے۔ پھر دونوں آپ کے پاس سے چلے گئے۔ سو ان دونوں کے آگے دو نور نمودار ہو گئے جب دونوں جدا ہوئے تو ایک ایک نور ہر ایک کے ساتھ ہو گیا۔
اھتز العرش لموت سعد بن معاذ۔ اخرجہ الشیخان والترمذی۔	(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) کہ عرش سعد بن معاذ کے مرنے سے ہل گیا۔
فقال ان الملئکۃ کانت تحملہ اخرجہ الترمذی۔	(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) ارشاد فرمایا کہ ملائکہ (بھی) ان (کے جنازہ) کو اٹھائے ہوئے تھے۔

(قرآن اور احادیث) میں عظیم کرامتیں مذکور ہیں جو کہ بشرط اتباع شریعت اہل اللہ کے حالاتِ رفیعہ میں سے ہیں۔

---

[1] التکشف ص ۳۸۶، ۴۰۱، ۴۰۶، ۴۰۷، ۳۸۶، ۹۰ تا ۱۱۱

کرامت کی حقیقت

کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو کسی نبی کے کسی متبع کامل سے صادر ہو۔ اور قانونِ عادت سے خارج ہو۔ پس اگر وہ امر خلاف عادت نہ ہو تو کرامت نہیں ہے اور جس شخص سے وہ امر صادر ہوا ہے اگر وہ کسی نبی کا متبع اپنے کو نہیں کہتا۔ وہ بھی کرامت نہیں ہے۔ جیسے جوگیوں، ساحروں وغیرہم سے بعض ایسے امور سرزد ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ شخص مدعی اتباع کا تو ہے۔ مگر واقع میں متبع نہیں ہے۔ خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو جس طرح اہلِ بدعت۔ یا فروع میں۔ جیسے فاسق و فاجر۔ اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو وہ بھی کرامت نہیں ہے۔ بلکہ استدراج ہے۔ جس کا ضرر یہ ہے کہ یہ شخص بوجہ خرقِ عادت کے اپنے کو کامل سمجھتا ہے اور اس دھوکا میں کبھی حق کے طلب کرنے اور اتباع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نعوذ باللہ کس قدر خسرانِ عظیم ہے۔ پس کرامت اس وقت کہلائے گی جبکہ اس کا محل صدور مومن متبع سنت کامل التقویٰ ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی فعلِ عجیب سرزد ہو جاتا ہے۔ اس کو غوث و قطب قرار دیدیتے ہیں۔ اس شخص کے کیسے ہی عقائد ہوں اور کیسے ہی اعمال و اخلاق ہوں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا۔ یا پانی پر چلتا ہوا دیکھو مگر وہ شریعت کا پابند نہ ہو تو بالکل ہیچ سمجھو۔

(۲) جاننا چاہیئے کہ کرامت کیلئے نہ اس ولی کو اس کا علم ہونا ضروری ہے اور نہ اس کے قصد کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ احیاناً علم ہوتا ہے اور قصد نہیں ہوتا اور کبھی علم و قصد دونوں امر ہوتے ہیں اس بنا پر کرامت کی تین قسمیں ٹھہریں۔ ایک قسم[۱] وہ جہاں علم بھی ہو قصد بھی۔ جیسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فرمان مبارک سے دریائے نیل کا جاری ہونا۔ اور دوسری[۲] وہ جہاں علم ہو۔ اور قصد نہ ہو۔ جیسے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے فصل میووں کا آجانا۔ تیسری قسم وہ جہاں نہ علم ہو۔ نہ قصد۔ جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دو چند، سہ چند ہو جانا۔ چنانچہ خود حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا جس سے ان کے علم و قصد کا پہلے سے متعلق نہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور ایک احتمال حصرِ عقلی میں سے خلاف واقع ہے کہ قصد ہو اور علم نہ ہو۔ کیونکہ بدوں علم قصد ممکن نہیں

اور لفظ تصرف و ہمت کا صرف قسم اول پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ قسم ثانی و ثالث کو تصرف نہیں کہتے البتہ برکت و کرامت کہلاتی ہے۔

(۳) اور جاننا چاہیئے کہ ایک اور اعتبار سے کرامت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حسی ایک معنوی۔ عوام لوگ اکثر حسی کو جانتے ہیں۔ اور اسی کو کمال شمار کرتے ہیں۔ جیسے مافی الضمیر پر مطلع ہو جانا۔ پانی پر چلنا، ہوا پر اڑنا وغیرہ اور خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامت معنوی ہے یعنی شریعت پر مستقیم رہنا مکارم اخلاق کا خوگر ہو جانا۔ نیک کاموں کا پابندی و بے تکلفی سے صادر ہونا۔ حسد و کینہ و دیگر صفات مذمومہ سے قلب کا طاہر ہو جانا۔ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرنا۔ یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال نہیں۔ بخلاف قسم اول کے کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے۔ اسی واسطے کاملین صدور کرامت کے وقت بہت ڈرتے ہیں۔ کہ یہ استدراج نہ ہو۔ یا خدانخواستہ اس سے نفس میں عجب پیدا نہ ہو جائے۔ یا اس کی وجہ سے عوام میں شہرت و امتیاز پیدا ہو کر موجب ہلاکت نہ ہو۔ بلکہ بعض نے فرمایا ہے کہ بعض اولیاء نے مرتے وقت تمنا کی ہے کہ کاش دنیا میں ہماری کوئی کرامت صادر نہ ہوتی تاکہ اس کا عوض و اجر بھی آخرت میں ملتا۔ کیونکہ یہ امر مقرر ہے کہ جس قدر دنیا میں کسی نعمت میں کسی کو کمی رہے گی۔ اس کا بدلہ آخرت میں عنایت ہوگا۔

(۴) اور جاننا چاہیئے کہ بعض علماء نے کرامت کی قوت ایک خاص حد تک معین کی ہے۔ اور جو امور نہایت عظیم ہیں۔ جیسے بدوں والد کے اولاد پیدا ہونا۔ یا کسی جماد کا حیوان بن جانا۔ یا ملائکہ کا باتیں کرنا، اس کا صدور کرامت سے ممتنع قرار دیا ہے۔ مگر محققین کے نزدیک کوئی حد نہیں۔ کیونکہ وہ فعل پیدا کیا ہوا اللہ تعالیٰ کا ہے۔ صرف ولی کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہو گیا ہے۔ واسطے اظہار کرامت و قرب و مقبولیت اس ولی کے۔ سو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جب کوئی حد نہیں۔ پھر کرامت محدود کیسے ہو سکتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ معجزہ کے ساتھ مساوات لازم آنے کا احتمال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب صاحب کرامت خود کہتا ہے کہ میں نبی کا غلام ہوں تو جو کچھ اس سے ظاہر ہوا ہے یہ تبعیت اس نبی کے ہے استقلالاً نہیں جو اس شبہ کی گنجائش ہو۔ البتہ جس خرق عادت کی نسبت نبی علیہ السلام

کا ارشاد ہو کہ اس کا صدور مطلقاً محال ہے وہ بطور کرامت کے سرزد نہیں ہو سکتے۔ جیسے قرآن مجید کا مثل لانا۔

(۵) اور جاننا چاہیئے کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا واجب ہے مگر جہاں اظہار کی ضرورت ہو۔ یا غیب سے اذن ہو یا حالت اس قدر غالب ہو کہ اس میں قصد و اختیار باقی نہ رہے۔ یا کسی طالب حق و مرید کے یقین کا قوی کرنا مقصود ہو۔ وہاں اظہار جائز ہے۔

(۶) اور جاننا چاہیئے کہ بعض اولیائے کاملین کا مقام غلبۂ عبودیت و رضا کا ہوتا ہے۔ اس لیئے کسی شے میں وہ تصرف نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ان کی کرامتیں نہیں معلوم ہوتیں۔ اور بعضوں کو قوت تصرف ہی عنایت نہیں ہوتی تسلیم و تفویض ہی ان کی کرامت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کیلئے کرامت کا ظہور، یا وجود ضروری نہیں۔

(۷) اور جاننا چاہیئے کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات و خوارق سرزد ہوتے ہیں اور یہ امر معنئ حد تواتر تک پہنچ گیا ہے۔

(۸) اور جاننا چاہیئے کہ کرامت کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ اسباب طبعیہ سے وہ اثر پیدا نہ ہوا ہو خواہ وہ اسباب جلی ہوں یا خفی۔

اس مقام پر لوگوں کو دو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں بعض تو مطلق عجیب امور کو کرامت سمجھتے ہیں اور عامل کے کمال معتقد بن جاتے ہیں۔ آجکل اس قسم کے بہت قصے واقع ہو رہے ہیں مسمریزم، فریلیسن، حاضرات، ہمزاد کا عمل، عملیات و نقوش، طلسمات و شعبدات، تاثیرات عجیبہ، ادویات سحر، چشم بندی وغیرہا کہ اس میں بعض کے آثار تو محض خیالی ہیں اور بعض کے واقعی بھی ہوں تو اسباب طبعیہ خفیہ سے مربوط ہیں۔ کرامت ان سب خرافات سے منزہ ہے اور بعض کرامات کو بھی قوت طبعیہ پر محمول کر کے سب کو ایک لکڑی ہانکتے ہیں صاحب بصیرت طالب حق کو قرائن قویہ سے بنظر انصاف فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں قوی طبعیہ کو دخل ہے۔ یا محض قوت قدسیہ ہے۔ یا کسی قوت کو بھی دخل نہیں محض کائن عن الغیب ہے۔

(۹) اور جاننا چاہیئے کہ جس فعل کا ظاہری قویٰ سے کرنا ممنوع ہے۔ باطنی قوی سے بھی ممنوع ہے۔ جیسے کسی بے گناہ کو قتل کر دینا۔ یا کسی کے قلب پر زور ڈال کر اس سے کچھ روپیہ لے لینا یا کسی کا

راز پنہانی معلوم کرنا۔ یا قصداً نامحرم کی طرف التفات کرنا۔ بعض لوگ مطلقاً خرقِ عادت کو شعبہ ولایت کا سمجھ کر ان سب تصرفات کو حلال اور داخلِ کرامت سمجھتے ہیں

(۱۰) اور جاننا چاہیئے کہ ولی سے احیاناً کوئی امر ناجائز صادر ہو جانا۔ بشرطیکہ اس پر اصرار نہ ہو اور تنبیہ کے وقت توبہ کرے۔ یا کسی اختلافی مسئلہ میں غلط شق کو اختیار کرنا ولایت و کرامت میں قادح نہیں۔

کرامت[1] کا مرتبہ ذکرِ لسانی سے بھی گھٹا ہوا ہے اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ذکر سے کچھ تو قرب ہوتا ہے۔ اگرچہ توجہ سے بھی نہ ہو اور کرامت سے تو کچھ قرب نہیں ہوتا۔ بلکہ خود وہ قرب سے ناشی ہے۔ قرب اس سے ناشی نہیں۔ تو غایت مافی الباب وہ قرب کی علامت ہے بشرطیکہ وہ کرامت بھی ہو۔

خوارق[2] کا ہونا ولایت کے لیے ضروری نہیں۔ بعض صحابہ سے عمر بھر میں ایک خرق عادت بھی واقع نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ سب اولیاء سے افضل ہیں۔ فضیلت کا مدار قرب الٰہی و اخلاصِ عبادت پر ہے۔ خوارق اکثر جوگیوں سے بھی واقع ہوتے ہیں۔ یہ ثمرہ ریاضت کا ہے خرقِ عادت کا رتبہ ذکر قلبی سے بھی کم ہے۔ صاحب عوارف نے غیر اہل خوارق کو اہل خوارق سے افضل کہا ہے۔ عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہوں۔ اور بڑا کشف یہ ہے کہ طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں۔ شیخ اکبرؒ نے لکھا ہے کہ بعضے اہلِ کرامت نے مرنے کے وقت تمنا کی ہے کہ کاش ! ہم سے کرامتیں ظاہر نہ ہوتیں۔ رہا یہ شبہ کہ پھر اولیاء کا اولیاء ہونا کس طرح معلوم ہو۔ سو اول تو ولایت ایک امر خفی ہے اس کے معلوم ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر معلوم کرنے سے یہ مقصود ہے کہ ہم ان سے مستفید ہوں تو ان کی صحبت و تعلیم سے شرف حاصل کرو۔ جب اپنی حالت روز بروز متغیر پاؤ گے۔ خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ شخص صاحبِ تاثیر ہے۔

---

[1] انفاس عیسیٰ صفحہ ۱۲
[2] تعلیم الدین صفحہ ۱۰۷ مع مختصر

ساتویں فصل۔ کشف

بخاری، مسلم اور ترمذی کی حدیث میں حضرت انس[۱] بن نضر رض کا قول مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ:۔

انی لاجد ریحھا من دون احد الحدیث اخرجه الشیخان والترمذی	میں جبل احد کے پیچھے سے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔
عن سعد بن ابی وقاص قال رایت علی یمین رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وعلی شماله یوم احد رجلین علیهما ثیاب بیض یقاتلان اشد القتال ما رأیتهما قبل ولا بعد یعنی جبرئیل و میکائیل علیهما السلام اخرجه الشیخان۔	حضرت سعد بن ابی وقاص رض سے روایت ہے کہ میں نے غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنے بائیں دو شخص دیکھے جن پر سفید کپڑے تھے اور بہت سخت لڑائی لڑ رہے تھے۔ میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا یعنی وہ دونوں شخص جبرئیل ع و میکائیل تھے۔ (بخاری، مسلم)

عالم غیب کی اشیاء کا منکشف ہونا ایک حال رفیع ہے جبکہ اتباع شریعت کے ساتھ ہو۔ حدیث کی دلالت ظاہر ہے۔ حضرت جبرئیل ع و میکائیل ع کا حضرت سعد رض کو نظر آ جانا حدیث میں صریحاً مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ فرشتے اوروں کو بھی نظر آتے تھے تب مدلول حدیث مسئلہ تمثل ہے اور اگر اوروں کو نظر نہ آتے تھے تو مدلول حدیث کشف ملائکہ ہے۔

---

[۱] التکشف صفحہ ٣٨٥، ٣٨٦

کشف[۱] دو طرح سے ہے۔ کشفِ کونی، کشفِ الٰہی، کشفِ کونی یہ کہ بُعد مکانی یا زمانی اس کے لیے حجاب نہ رہے۔ کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے۔ کشفِ الٰہی یہ کہ علوم و اسرار و معارف متعلق سلوک کے یا متعلق ذات و صفات کے اس کے قلب پر وارد ہوں۔ یا عالم مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر مکشوف ہوں۔ اور وارداتِ[۲] غریبہ و مواجید مثل ذوق و شوق۔ محبت و انس و ہیبت و انکشاف اسرار احکام و حسن معاملہ فیما بینہ و بین اللہ وغیرہ فائض ہوں جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہے (اور یہ امور حالات کہلاتے ہیں یہی علوم کشفِ الٰہی کہلاتے ہیں)۔ کشف کونی نہ لذت میں اس کی گرد کو پہنچتا ہے۔ نہ قرب میں اس کو اس کا سا دخل ہے۔

بعض[۳] اوقات اہل کشف کو خود اپنے کشف کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا۔ چنانچہ (حدیث بخاری شریف میں) حضرت اسید بن حضیر کو ملائکہ کا کشف تو ہوا۔ مگر یہ اطلاع نہ ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں محققین نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ جو شخص اس تحقیق سے آگاہ ہو جاوے گا وہ کشف میں اپنی فہم و رائے پر ہرگز اعتماد نہ کرے گا اور ایسا شخص بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔

بزرگوں[۴] کو جو کشف ہوتا ہے۔ یہ ان کے اختیار میں نہیں (بلکہ) ان کے اختیار سے باہر ہے (یہاں تک کہ) نبیوں کے اختیار میں بھی نہیں۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کو مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ اس بے خبری سے جو کچھ ان کو رنج و غم پہنچا مشہور ہے کہ روتے روتے نابینا ہو گئے۔ تو اگر کشف امر اختیاری تھا۔ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو کیوں خبر نہ ہوئی (اور جب خبر ہونے کا وقت آیا تو میلوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتہ کی خوشبو آنے لگی۔ پس جبکہ کشف اختیاری چیز نہیں تو یہ بھی ضروری نہیں کہ بزرگوں کو ہر وقت کشف ہوا ہی کرے۔ (بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ) کشف[۵] ہونا کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ اور ریاضت کرے تو اس کو بھی کشف ہونے لگتا ہے۔ نیز مجنونوں کو بھی کشف ہوتا

---

۱ تعلیم الدین ص۱۰۷ ۲ تصوف و سلوک ص۶۲ ۳ التکشف ص۳۳۱
۴ گناہ کی مضرت ص۱۴ ۵ علم و عمل کی فضیلت ص۲۴۔

ہے۔ میں نے خود ایک مجنونہ عورت کو دیکھا کہ اس کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔

کشف[1] والہام سے علمِ ظنی حاصل ہوتا ہے اگر موافق قواعد شرعیہ کے ہے قابلِ عمل ہوگا ورنہ واجب الترک ہے اور اگر قواعد شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔ لیکن خود کشف میں باہم اختلاف ہو تو اگر وہ دونوں کشف ایک شخص کے ہیں تب تو آخیر کشف کا اعتماد ہوگا اور اگر وہ دونوں کشف دو شخصوں کے ہیں تو صاحبِ صحو کا کشف بہ نسبت صاحبِ سکر کے قابلِ عمل ہوگا اور اگر دونوں صاحبِ صحو ہیں تو جس کا کشف اکثر شرع کے موافق ہوتا ہو وہ قابلِ اعتبار ہے اور اگر اس میں بھی دونوں برابر ہیں تو جس شخص میں آثار قربِ الٰہی ومقبولیت کے زیادہ پائے جائیں۔ اس کے کشف کو ترجیح ہوگی اور اگر اس میں بھی برابر ہیں تو جس کو اپنا دل قبول کرے۔ اس پر عمل جائز ہے اور اگر ایک کشف ایک شخص کا دوسرا کشف کئی شخصوں کا ہو تو جماعت کے کشف کو قوت ہوگی۔ البتہ اگر وہ تنہا سب سے اکمل ہے تو اس کے کشف کو ترجیح ہوگی۔

---

[1] تعلیم الدین ص ۱۰۶

۸ معارف وحقائق

(اقسام علوم اور اس کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ معارف و حقائق میں، ہر شخص[1] کا جداگانہ مذاق ہے مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حقائق و معارف وہ مقبول ہیں جن کو شریعت رد نہ کرے۔ سیریہ میں ابوسلیمان دارانیؒ کا قول منقول ہے۔

ربما یقع فی قلبی النکتة	اکثر میرے دل میں کوئی نکتہ اسرارِ صوفیہ
من نکت القوم ایاما فلا	میں سے آتا ہے مگر میں اس کو بلا دو
اقبل منه الا بشاهدین	عادل گواہوں کے کہ وہ کتاب اللہ اور
عدلین الکتاب والسنة۔	سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے قبول نہیں کرتا۔

ابوخرازؒ کا قول ہے :-

کل باطن یخالفه ظاهر فهو	جو باطن کہ ظاہر کے خلاف ہو۔ وہ باطل
باطل[2]۔	اور مردود ہے۔

اور ان علوم کی دلیل کشف ہے اور بس۔ اور قرآن و حدیث کے اندر ان مسائل کا داخل کرنا تکلف سے خالی نہیں (البتہ) اگر کسی[1] کو شوق ہو تو (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) اطاعت میں لگ جائے تو خود ہی سب حقائق (ومعارف) منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہوگا۔ ؎

بینی اندر دِل علومِ انبیاؑ بے کتاب و بے معید و اوستا

(بغیر کسی تعلیم و معلم کے انبیاء کے علوم منکشف ہو جائیں گے۔)

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوتے ہیں محض عمل اور اطاعت ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔

---

[1] تعلیم الدین صہ ۹۵ [2] تفصیل الدین صہ ۵۲، ۵۳

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے۔ بلکہ شکستگی اور انقیاد سے خدا کا فضل متوجہ ہوجاتا ہے (یعنی ان حقائق و معارف کی معرفت اطاعت اور عبدیت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ عقل پرستی اور زیادہ قیل وقال سے حاصل نہیں ہوتی) جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع و محبوب ہو تو بادشاہ اسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ آرام گاہ ہے لیکن اگر وہ از خود پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہے اور خزانہ کہاں ہے تو ایسی بے نقط سنائی جائے گی کہ حواس باختہ ہوجائیں گے۔ پس اسرار (اور حقائق و معارف) کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی ہے کہ آدمی اپنے کو (شاہ حقیقی کے سامنے بالکل) فنا کردے اور اپنی عقل و فہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے۔ فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزموں را یک زمانے خاک باش

یعنی عقل کی اطاعت میں سنگدل بنے ہوئے تو بہت دن ہوگئے۔ اس نے کچھ بھی حقیقت نہ بتلائی۔ اب ذرا کچھ دنوں خاک ہوکر دیکھو پھر کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(یعنی بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے۔ خاک ہو تاکہ پھر رنگارنگ پھول کھلیں) پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے۔

(معلوم ہونا چاہیئے کہ حقائق) اور معارف[۱] حسب اختلاف مذاق بے شمار ہیں مگر اس مقام پر چند معارف اختصار کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں جو زیادہ مشہور ہیں (مثلاً تجدد امثال تنزلات ستہ اور وحدۃ الوجود۔ اب ہر ایک کو الگ الگ فصل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] تعلیم الدین ص ۹۵، ۹۸، ۹۶

پہلی فصل ۔ تجدد امثال

مخلوقات ہر وقت اپنے وجود میں فیضانِ الٰہی کی محتاج ہیں ۔ اگر ادھر سے وجود کی حفاظت نہ ہو تو فوراً نیست و نابود ہو جائے ۔ اب اہلِ کشف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وجود ہر آن میں جدا آتا ہے ۔ مگر اتصال و تشابہ وجودات کی وجہ سے حس کو امتیاز تغائر کا نہیں ہوتا نہ درمیان کا عدم معلوم ہوتا ہے ۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بتی کے سرے پر جو آگ کا شعلہ ہے اس میں چراغ سے ہر وقت نیا تیل آتا ہے اور وہ فنا ہو کر دوسرا آتا ہے ۔ اسی طرح تمام تیل ختم ہو جاتا ہے ۔ مگر حس میں ہرگز معلوم نہیں ہوتا ۔ کہ پہلا کب فنا ہو گیا اور دوسرا کب آیا ۔ اس کو تجدد امثال کہتے ہیں ۔

دوسری فصل تنزلات ستہ

یہ ظاہر ہے کہ مصنوعات سے صانع کا ظہور ہوتا ہے ورنہ کیونکر پتہ لگے ۔ پھر خود صانع میں ایک مرتبہ ذات کا ہوتا ہے ۔ ایک صفات کا ۔ پھر صفات میں بھی ایک مرتبہ جامعیت اور اجمال کا ہوتا ہے ۔ ایک مرتبہ تفصیل کا ، اور ہمیشہ ذات کا نشان صفات سے لگتا ہے اور اجمال کا پتہ تفصیل سے ۔ جب یہ سب باتیں سمجھ میں آگئیں تو اب سمجھئے کہ مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا ہم کو علم ہوا ۔ تو ظہور علمی کے اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظہور اللہ تعالےٰ کا مخلوقات سے ہوا ۔ پھر اسی قاعدۂ مذکورہ کے موافق اللہ تعالیٰ کی صفاتِ تفصیلیہ سے صفات اجمالیہ کا اور ان سے ذات کا پتہ لگے گا اس لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اول ظہور اللہ تعالیٰ کا صفتِ جامعیت و اجمالیہ سے ہوا ۔ پھر صفات تفصیلیہ سے ہوا پھر مخلوقات سے ہوا ۔ اب مخلوقات میں ایک عالم ارواح ہے ۔ ایک عالم اجسام اور چونکہ

ے تفصیل کے لیے تنزلات ستہ وحدۃ الوجود کا بیان ملاحظہ ہو ۔

ان میں بوجہ غایت لطافت وکثافت کے مناسبت ہے نہیں۔ انکے تعلق کے لیے ایک ایسی چیز پیدا کی جس کو دونوں سے مناسبت ہے۔ اس کو عالمِ مثال کہتے ہیں۔ تو مخلوقات کی ترتیب میں روح پہلے ہوئی۔ پھر عالمِ مثال۔ پھر عالمِ اجسام، پھر عالمِ اجسام میں سب سے آخر انسان پیدا ہوا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی صفتیں پیدا کر دیں۔ اس وجہ سے اس کو جامع کہتے ہیں۔ جس ترتیب سے مخلوقات پیدا ہوتی گئیں ظہور صانع کا بڑھتا گیا۔ تو اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد ظہور مرتبہ صفات تفصیلیہ کے عالمِ ارواح سے ظہور رہا۔ پھر عالمِ مثال سے پھر عالمِ اجسام سے۔ پھر انسان سے۔ پس دو مرتبے ظہور کے تو صفات میں تھے۔ اور چار مخلوقات میں۔ تو یہ چھ ظہور علی الترتیب[1] اعتبار کیے گئے۔ ان ہی چھ ظہور کو تنزلات ستہ کہتے ہیں۔ اور تنزل ان کی اصطلاح میں ظہور کو کہتے ہیں۔ نہ آسمان سے زمین پر یا انسان کے اندر آجانے کو۔[2] سو تنزلات کے تو چھ مرتبے ہوئے اور وجود کے سات مرتبے۔ کیونکہ ایک مرتبہ وجود کا خود ذاتِ حق ہے۔ سو مرتبہ ذاتِ حق کو **ھاھوت** کہتے ہیں۔ اور مرتبہ صفاتِ اجمالیہ کو **لاھوت** اور حقیقت محمدیہ اور مرتبۂ صفاتِ تفصیلیہ کو **جبروت** اور اعیانِ ثابتہ اور حقیقت آدم اور عالم ارواح و مثال کو **ملکوت** اور عالمِ اجسام کو **ناسوت** اور عالمِ انسان کو **مرتبۂ جامعہ** کہتے ہیں۔ یہ سب اصطلاحی الفاظ ہیں ورنہ یقینی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آدمؑ مخلوقات الٰہی سے ہیں۔ نہ کہ صفاتِ

---

[1] مگر ذات وصفات میں تو ترتیب محض اعتباری ہے۔ یہ نہیں کہ کسی وقت میں صفات نہ تھیں پھر دفعتہً پیدا ہو گئیں ورنہ صفات کا حادث اور مخلوق ہونا لازم آدے گا۔ یہ اعتقاد محض باطل ہے۔ البتہ مخلوقات تو ہر طرح موخر اور حادث ہیں ۱۲۔

[2] یہ تو حلول ہے جس کا اعتقاد کفر ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رضؓ کا ارشاد قشیریہ میں منقول ہے۔ من زعم ان اللہ فی شیئ او من شیئ فقد اشرک اذ لو کان فی شیئ لکان محصورا ولو کان من شیئ لکان محدثا ۱۲

الٰہیہ سے۔ تحقیق اس مسئلے کی اسی قدر ہے اس سے آگے اہلِ سُکر کا غلبہ ہے جس میں ان کی زبان و قلم سے موہم الفاظ نکلے اور ناواقف لوگ اصطلاح کو لغت سمجھنے لگے۔

تیسری فصل۔ وحدۃ الوجود

(تفصیل کے لیے احوال کے باب میں وحدۃ الوجود کا بیان مع وصیت نامہ صـ ۳۰۹ تا ۳۱۳ ملاحظہ ہو۔)۔

۹۔ اصطلاحات

تصوف[1] کی اصطلاحات دو قسم پر ہیں۔ایک وہ جو مقاصد کے متعلق ہیں وہ تو شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ مقاصد میں تصوف کی اصطلاحات کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے اور دوسری وہ اصطلاحات ہیں جو امور زوائدہ کے متعلق ہیں۔وہ شریعت سے جدا ہو سکتی ہیں۔جیسے تجدد امثال، توحید وجودی شغل رابطہ وغیرہ۔یہ صوفیہ[2] کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لیے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں۔ورنہ وہ قرآن وحدیث سے جدا ہو کر کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ہاں علماء خشک جو ان کی اصطلاحات کو نہیں سمجھ سکتے ان پر اعتراض کر دیتے ہیں جو واقع میں ان پر نہیں ہوتا۔بلکہ اپنی فہم پر ہوتا ہے۔

اصطلاحاتے ست مر ابدال را

(ترجمہ:۔ ابدال کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں۔)

ان اصطلاحات کو دو فصول میں لکھا جاتا ہے۔اول اقسام اولیاء اور دوم متفرق اصطلاحات۔

پہلی فصل۔ اولیاء اللہ اور ان کے اقسام

اَلَآ[3] اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ الآیۃ

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) آگاہ ہو جاؤ کہ بے شک اللہ کے ولی نہ ان پر کچھ خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے۔

---

[1] اشرف المسائل ص۳۴ [2] الشریعت ص۱۶

[3] تعلیم الدین ص۷۰

عن شریح بن عبید قال ذکر	شریح بن عبید سے روایت ہے کہ حضرت
اھل الشام عند علی وقیل	علی رضی کے روبرو اہلِ شام کا ذکر آیا۔ کسی
العنھم یا امیر المؤمنین	نے کہا کہ اے امیر المومنین! ان پر لعنت کیجئے
قال لا۔ انی سمعت رسول	فرمایا نہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	وسلم سے سنا ہے۔ فرماتے تھے۔ کہ ابدال (جو
یقول الابدال یکونون	ایک قسم ہے اولیاء اللہ کی) شام میں رہتے ہیں
بالشام وھم اربعون رجلا	اور وہ چالیس آدمی ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص
کلما مات رجل ابدل اللہ	ان میں سے مرجاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ
مکانہ رجلا یسقی بھم الغیث	دوسرا شخص بدل دیتا ہے۔ ان کی برکت سے
وینتصر بھم علی الاعداء و	بارش ہوتی ہے اور ان کی برکت سے اعداء پر
یصرف عن اھل الشام بھو	غلبہ ہوتا ہے اور ان کی برکت سے اہلِ شام
العذاب رواہ احمد	سے عذاب (دنیوی) ہٹ جاتا ہے۔

مکتوبات و ملفوظات صوفیہ میں ابدال و اقطاب و اوتاد و غوث وغیرہم الفاظ اور ان کے مدلولات کے صفات و برکات و تصرفات پائے جاتے ہیں۔ حدیث میں جب ایک قسم کا اثبات ہے تو دوسرے اقسام بھی مستبعد نہ رہے۔ ایک نظیر سے دوسری نظیر کی تائید ہونا امر مسلّم و معلوم ہے۔ برکات تو اس حدیث میں منصوص ہیں۔ اور تصرفات تکوینیہ قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہوتے ہیں۔

اقسامِ اولیاء اللہ اس[2] باب میں بزرگوں کی مختلف عبارتیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ سب بارہ گروہ ہیں۔ ابدال[1]، ابرار[2]، اخیار[3]، اقطاب[4]، امامین[5]، اوتاد[6]، عمد[7]، غوث[8]، مفردان[9]، مکتومان[10]، نجبار[11]، نقباء[12]

۱۔ ابدال چالیس ہوتے ہیں۔ بائیس یا بارہ شام میں اور اٹھارہ یا اٹھائیس عراق میں رہتے ہیں۔

---

۲ التکشف ص ۴۵۳ تعلیم الدین ص ۱۰۳۔

۲۔ ابرار — اکثر نے ان ہی کو ابدال کہا ہے۔

۳۔ اخیار — پانچ سو یا سات سو ہوتے ہیں اور ان کو ایک جگہ قرار نہیں۔ سیاح ہوتے ہیں۔ ان کا نام حسین ہوتا ہے۔

۴۔ اقطاب — قطب العالم ایک ہوتا ہے۔ اس کو قطب العالم و قطبِ اکبر و قطب الارشاد و قطب الاقطاب و قطب المدار بھی کہتے ہیں اور عالمِ غیب میں اسکا نام عبداللہ ہوتا ہے۔ اس کے دو وزیر ہوتے ہیں جو امامین کہلاتے ہیں وزیر یمین کا نام عبدالملک وزیر یسار کا نام عبدالرب ہوتا ہے۔ اور بارہ قطب اور ہوتے ہیں۔ سات تو سات اقلیم میں رہتے ہیں۔ ان کو قطبِ اقلیم کہتے ہیں اور پانچ یمن میں ان کو قطبِ ولایت کہتے ہیں۔ یہ عدد تو اقطاب معینہ کا ہے اور غیر معین، ہر شہر اور ہر قریہ میں ایک ایک قطب ہوتا ہے۔

۶۔ اوتاد — چار ہوتے ہیں۔ عالم کے چار رکن میں رہتے ہیں۔

۷۔ عمد — چار ہوتے ہیں۔ زمین کے چاروں گوشوں میں رہتے ہیں۔ سب کا نام محمد ہوتا ہے۔

۸۔ غوث — ایک ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قطب الاقطاب ہی کو غوث کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ اور ہوتا ہے۔ اور وہ مکہ میں رہتا ہے بعض نے اسمیں بھی اختلاف کیا ہے

۹۔ مفرداں — غوث ترقی کر کے فرد ہو جاتا ہے اور فرد ترقی کر کے قطب وحدت ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ مکتوماں — مکتوم تو مکتوم ہی ہیں (یعنی پوشیدہ اور چھپے ہوئے)

۱۱۔ نجبار — ستر ہوتے ہیں اور مصر میں رہتے ہیں۔ سب کا نام حسن ہے۔

۱۲۔ نقباء تین سو ہوتے ہیں۔ ملکِ مغرب میں رہتے ہیں۔ سب کا نام علی ہوتا ہے۔

قطب الارشاد و قطب التکوین

اولیاء[1] اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے متعلق خدمت ارشاد و ہدایت و اصلاحِ قلب و تربیت نفوس و تعلیم طرق قرب و قبول عند اللہ ہے اور یہ حضرات اہلِ ارشاد کہلاتے ہیں اور ان میں سے اپنے عصر میں جو اکمل و افضل ہو۔ اور اس کا فیض اتم و اعم ہو۔ اس کو قطب الارشاد کہتے ہیں۔ اور یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حقیقی نائب ہوتے ہیں۔ لوگوں[2] کے قلوب میں انوار و برکات ان کی وجہ سے آتے ہیں۔ برکات سے متمتع ہونے کی شرط ان کے ساتھ اعتقاد ہے۔

اور[3] ان کا طرز، طرزِ نبوت ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جن کے متعلق خدمت اصلاحِ معاش و انتظام امور دنیویہ و دفع بلیات ہے کہ اپنی ہمت باطنی سے باذنِ الٰہی ان امور کی درستی کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات اہلِ تکوین کہلاتے ہیں۔ جن کو ہمارے عرف میں اہلِ خدمت کہتے ہیں اور ان میں سے جو اعلیٰ اور اقویٰ اور دوسروں پر حاکم ہوتا ہے۔ اس کو قطب التکوین کہتے ہیں اور ان کی حالت مثل حضرات ملائکہ علیہم السلام کے ہوتی ہے۔ جن کو مدبراتِ امر فرمایا گیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اسی شان کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مقام و منصب کے لیے ایسے تصرفاتِ عجیبہ کا ہونا لازم ہے۔ بخلاف اہلِ ارشاد کے کہ ان کا خود صاحب خوارق ہونا بھی ضروری نہیں۔ البتہ ان حضرات کی کرامات اور طور کی ہوتی ہیں کہ ان کا ادراک عوام کو نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ امور ذوقی و وجدانی ہیں کہ اکثر اوقات ان کی خدمت و صحبت سے جو شخص مستفید ہوتا ہے۔ اس کو معلوم ہوتے ہیں۔ باقی یہ کہ جب نفع طریقت اہلِ ارشاد ہی سے ہوتا ہے تو اہلِ تکوین کے کمالات بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ تو اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک علمی دوسرا عملی

---

[1] التکشف صفحہ ۹۳ [2] کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۱۲۸ [3] التکشف صفحہ ۹۳

علمی تو یہ کہ ایک کام کی بات معلوم ہو جائے۔ تاکہ علم ناقص نہ رہے۔ عملی یہ کہ اکثر ایسے لوگ ظاہر صورت سے خستہ حال و شکستہ بال و ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ اگر یہ مسئلہ کسی کو معلوم ہوگا تو مساکین کی تحقیر و توہین تو نہ کرے گا۔ خوب سمجھ لو۔

(جاننا چاہیئے کہ) قطب[1] التکوین کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے قطب ہونے کا علم ہو کیونکہ وہ ایک عہدہ ہے۔ جیسا حسن میمندی جو سلطان محمود کا وزیر تھا۔ اس کو تو اپنے وزیر ہونے کا علم تھا۔ مگر ایاز کو اپنے محبوب ہونے کا علم ضروری نہیں۔ کیونکہ محبوبیت کوئی عہدہ نہیں قرب کی ایک قسم ہے۔ پس قطب الارشاد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اپنے قطب ہونے کو جان بھی لے۔ ایک وقت میں قطب متعدد بھی ہو سکتے ہیں۔ شیخ ابن عربی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہر بستی میں خواہ وہ کفار ہی کی ہو۔ قطب ہوتا ہے۔ اس کلام کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ وہاں ہی کے باشندوں میں ہو اور باطن میں مسلمان ہو مگر کسی خاص حالت کی وجہ سے اخفاء کرے اور یہ بعید نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اس جگہ مقیم نہ ہو۔ لیکن وہ بستی اس کے تصرف میں ہو۔ جیسا تھانیدار کہ اس کا تعلق دیہات سے بھی ہوتا ہے اور وہ خاص حالت موجب اخفاء ذرا دقیق ہے اور وہ بھی شیخ ابن عربی ہی کے کلام سے مفہوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس میں عقل نہ ہو۔ جس کی وجہ سے کہ وہ مکلف نہ ہو۔ مگر صحیح الحواس ہو جیسے حیوانات اور صبیان کے حواس درست ہوتے ہیں۔ مگر اس کی ایک خاص علامت ہے اور وہ علامت یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل باطن کا اس کے ساتھ معاملہ دیکھا جائے۔ اگر وہ اس کا ادب کرتے ہوں تو ادب کرے اور اس کے بارے میں کف لسان کرے۔ ورنہ ہر کافر کا معتقد نہ بنے۔ کیونکہ اس طرح تو جہاد وغیرہ سب بند ہو جائے گا۔

سالک مجذوب و مجذوب سالک

جو شخص[2] مقامات کو (جو کتاب الاعمال میں مذکور ہوئے ہیں) اوّل طے کرے۔ پھر عالم غیب سے کشش کیا جاوے وہ سالک مجذوب ہے اور جس کو پہلے کشش ہو۔

---

[1] الکلام الحسن صہ ۸۷ [2] تعلیم الدین صہ ۹۸۔

پھر مقامات طے کرے وہ مجذوب سالک ہے اور اوّل شخص کو محب اور دوسرے کو محبوب کہتے ہیں۔

قلندر

اصطلاحِ صوفیہ[۱] میں وہ جماعت قلندر کہلاتی ہے جن میں اعمال قالبیہ یعنی اعمالِ ظاہرہ تو کم ہوتے ہیں۔ مگر اعمالِ قلبیہ ان کے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اور اعمال قلبیہ یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھا جائے۔ قلب کی نگہداشت رکھی جائے کہ غیر حق کی طرف متوجہ نہ ہونے پاوے۔ بلکہ اکثر اوقات قلب کو ذکر میں مشغول رکھا جائے نیز قلب میں کسی مسلمان کی طرف سے غل[۲] و حقد نہ ہو۔ سب کے ساتھ خیر خواہی ہو۔ نیز حقوق وقت ادا کئے جاویں کہ کوئی وقت ذکر سے خالی نہ جاوے۔ نیز خوشی و غمی کے حقوق ادا کیے جاویں۔ نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے۔ حزن و غم میں دل خدا تعالیٰ سے راضی رہے۔ اس کے سوا اور بہت اعمال قلبیہ ہیں۔

طریق[۲] القلندر کے دو جز ہیں۔ ایک عمل جو حقیقت ہے طریق پارسائی کی اور دوسرا محبت۔ اور طریقِ قلندران دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اصطلاح متقدمین کے اعتبار سے رہِ قلندر میں یہ بھی قید ہے کہ جس میں اعمال ظاہرہ مستحبہ کی تقلیل ہو۔ بہت نفلیں اور وظائف نہ ہوں۔ بلکہ محبت کی خاص رعایت ہو۔ یعنی تفکر اور مراقبہ زیادہ ہو اور ایک اصطلاح اور ہے یعنی خواہ ان اعمال کی تکثیر بھی ہو۔ مگر غلبہ آزادی کو ہو یعنی خلق سے آزادی۔ نہ رخالق سے۔ کیا معنی کہ قلندر کو دنیا کی وضع اور رسوم کی پرواہ نہیں۔ نہ مصالح پر نظر ہوتی ہے اس کا دل صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ اس کی بڑی مصلحت یہی ہوتی ہے کہ ایک کو نے کر سب کو ترک کر دو ؎

عاشقِ بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

ملامتی

ملامتی[۳] وہ ہے جو اعمال میں تکثیر تو کرتا ہے۔ مگر ان کے اخفاء کا اہتمام کرتا ہے۔ جس سے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دوسروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرتے

---

[۱] انفاس عیسیٰ ص۳۹۹ [۲] طریق القلندر ص۱۰ ملخصاً ؎ کینہ و حسد [۳] انفاس عیسیٰ ص۳۴۳

وہ[1] ڈاکوؤں سے بچنے کیلئے اپنے اعمال چھپاتے ہیں اور رندوں کی سی وضع بنائے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہجوم عوام سے ان کے معمولات میں خلل پڑتا ہے۔ اس لیے وہ عوام کو ڈاکو سمجھتے ہیں۔

مجذوب

مجنون[2] وہ ہے جس کی عقل اخلاطِ فاسدہ کے غلبہ سے زائل ہوجائے اور مجذوب وہ ہے کہ جس کی عقل کسی واردِ غیبی کے غلبہ سے زائل ہوجائے۔ مگر کبھی احوال و واردات کے غلبہ سے اخلاط میں بھی تغیر ہوجاتا ہے۔ اس لیے علت سے تو اس کی پہچان مشکل ہے۔ مجذوب کے پاس بیٹھ کر قلب کو آخرت کی طرف کشش ہوتی ہے علامت یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل بصیرت (محققین جامع شریعت و طریقت) اس شخص پر نکیر نہ کرتے ہوں۔

یہ[3] ضروری نہیں کہ ہر مجنون مجذوب ہی ہوا کرے۔ اس میں ایک نکتہ ہے جس کی وجہ سے لوگ مجذوبوں کے طالب ہیں وہ یہ ہے کہ مجذوب جو کچھ کہہ دیتا ہے۔ وہی ہوجاتا ہے۔ حالانکہ اس کے کہنے سے نہیں ہوتا ہے وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ یعنی جب کوئی کام منجانب اللہ ہونے والا ہوتا ہے تو ان کو اس کا انکشاف ہوجاتا ہے نہ کہ وہ کام اس کے کہنے کی وجہ سے ہوتا ہے بلکہ ان کا کہنا اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ بھی کہتے تو تب بھی ہوتا۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے تار بابو کے پاس تار آتا ہے اور وہ اس کو لکھ کر لوگوں کو تقسیم کر دیتا ہے۔ اس میں ان کو دخل نہیں۔ اگر اس پر یہ آمد نہ ہو تو پھر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اب اگر کوئی اپنی بیوقوفی سے تار بابو کو مٹھائیاں اور نذرانہ پیش کرنے لگے تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہے اور اس بیوقوفی کا کیا علاج۔ یہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ خبریں اس بابو کے اختیار میں ہیں۔ خواہ اچھی خبریں دے خواہ بری خبریں دیں۔ حالانکہ بابو کو اس کے اخفاء و اظہار میں کوئی دخل نہیں بلکہ تم اگر اس کو برا بھی کہو گے تب بھی وہ اس میں کمی زیادتی نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ مجذوب وغیرہ کے قول کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لوگ ناحق اپنا وقت خراب کرتے ہیں (اس لیے کہ) مجذوب[4] سے نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے۔ نہ دین کا۔ دین کا اس لیے نہیں کہ وہ تعلیم و نصیحت پر موقوف

---

[1] کمالاتِ اشرفیہ صـ۲۲ [2] القول الجلیل صـ۳۰ [3] مزید المجید صـ۲۷ [4] علم و عمل کی فضیلت صـ۳۵

ہے اور تعلیم و نصیحت اس سے حاصل نہیں ہوتی۔ جیساکہ ظاہر ہے اور دنیا کا اس لیے نہیں کہ وہ دعا سے ہوتا ہے اور مجذوب دعا کرتے نہیں کیونکہ وہ لوگ صاحبِ کشف[ع] ہوتے ہیں۔ ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس طرح ہوگا تو اس کے موافق دعا کرنا تو فضول و بیکار ہے۔ اور اس کے خلاف دعا کرنا تقدیر کا مقابلہ کرنا ہے۔ بہرحال وہ لوگ دعا نہیں کرتے۔ البتہ کشف کی بنا پر کبھی بطور پیشین گوئی کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں یوں ہوگا سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا۔ اس طرح ہو جانا کچھ ان کے کہنے کے سبب نہیں ہوا۔ غرض کہ مجذوب سے کسی طرح کا نفع نہیں ہوتا۔ ہاں دوسرے بزرگوں سے ہر طرح کا نفع ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں تعلیم و نصیحت بھی ہوتی ہے اور دعا بھی دین کا بھی نفع ہوتا ہے اور دنیا کا بھی۔ بلکہ مجذوبوں کے چکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں۔ شریعت کی وقعت و عظمت ایسے لوگوں کے دلوں سے جاتی رہتی ہے کیونکہ مجذوب مکلف نہ ہونے کے سبب شریعت کی پیروی تو کرتے نہیں۔ پس ان کی فکر کرنے والے بھی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ مجذوب لوگ تو بوجہ عقل جاتی رہنے کے معذور ہیں۔ اور ان لوگوں میں عقل و سمجھ سب کچھ ہے اس لیے یہ معذور نہیں۔ (لہٰذا یہ اپنا دین برباد کرتے ہیں) تو یہ کتنا بڑا ضرر ہے جو مجذوبوں کی بدولت بجائے نفع کے پہنچتا ہے اس لیے ان کے پیچھے نہ پڑنا چاہیئے۔ (مطلب یہ کہ ان کی صحبت اور ان سے کسی غرض کے لیے ملنا جلنا بالکل ترک کر دینا چاہیئے۔ البتہ مجذوب کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔ پس) دعا تو سالک سے کرانی چاہیئے کہ ان کی دعا کا اثر ہوتا ہے اور خلاف انکشاف بھی دعا کر سکتے ہیں۔ بخلاف مجذوب کے کہ ان کو اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ کیونکہ بوجہ نقصانِ حال اس انکشاف کا یقین ہو گیا ہے اور سالک کو بوجہ کمالِ حال کشف کا یقین نہیں ہوتا۔

مجذوب[ا] کی نظر کبھی تو چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر ہو جاتی ہے اور نہ ہو تو بڑی سے بڑی بات پر بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ جذب کی وجہ سے استغراقی کیفیت ان حضرات پر

[ا] کمالات اشرفیہ صد ۲۰۷،۱۵ [ع] کشف کا بیان ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۳۲۹

غالب رہتی ہے۔ اسی لیے ان کا فعل حجت نہیں۔ مجذوبوں کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ زیادہ نہیں ہوتا وہ صرف معذور ہوتے ہیں۔

مجذوب[1] گو مقبول ہیں مگر کامل نہیں۔ کیونکہ وہ اعمال سے محروم ہیں اور ترقی اعمال ہی سے ہوتی ہے۔ ورنہ ارواح کو عالمِ ارواح سے عالمِ اجسام میں نہ بھیجا جاتا۔ کیونکہ عالمِ ارواح میں ارواح حاملِ احوال تھیں۔ مگر حاملِ اعمال نہ تھیں۔ چنانچہ ارواح میں محبت اس درجہ تھی کہ اسی محبت ہی کی وجہ سے حملِ امانت پر آمادہ ہوگئیں۔ اس کا منشا محبت و عشق ہی تھا مجذوب کی خدمت اگر ہو سکے کردے لیکن توجہ کا ان سے ہرگز طالب نہ ہو۔ اور اگر ان کے حواس کی درستی میں شبہ ہو۔ تو ان کی دی ہوئی چیز کو بھی نہ لے۔ اگر لے لے تو اس سے لقطہ کا معاملہ کرے۔

طالبین کے اقسام اور ان کا طریق

طالب[2] تین قسم کے ہیں۔ مبتدی، منتہی اور متوسط الحال۔ مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر ہوتا ہے۔ (وہ) حال سے مغلوب ہوتا ہے گو ایسا مغلوب نہ ہو کہ حد شرع کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیونکہ ایسا شخص تو مبحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا سی بات پر رونے لگتا ہے۔ ذرا سی بات پر وجد آجاتا ہے۔ زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو عوام کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آجائے۔ اور حال اس میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لیے بڑی بصیرت چاہیئے اس کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ منتہی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیاء کو تو لوگوں نے پہچان لیا۔ اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کو نہ پہچان سکے۔ (چنانچہ انبیاء کے بارے میں کہا گیا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ترجمہ:۔ نہیں ہو تم مگر ہم جیسے آدمی) متوسط اولیاء

---

[1] انفاسِ عیسیٰ، صـ ۳۶۳، ۲۶۳ ، [2] وعظ میرٹھ صـ ۱۰

میں تو جوش و خروش دیکھتے ہیں۔ اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغنار ہوتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ قصداً اظہار تو کہاں۔ ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو۔ کیمیا گر کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ ٹھگ کمالات دکھاتے پھرا کرتے ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعبدے ہی ہوتے ہیں جس کے اندر کچھ ہے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اور جو کچھ دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ بھی نہیں۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے۔ قلندر فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم

گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(ترجمہ:۔ مجھے اپنی آنکھوں سے شرم ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تیرا چہرہ دیکھیں اور کانوں کو بھی تیری باتیں سننا میں پسند نہیں کرتا)

یہ لوگ امتثالِ امر میں لگے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو پہچانے یا نہ پہچانے۔ کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے۔ ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفار بے ادبی ہے۔ کیونکہ اطاعت تعمیل حکم اور رضا ہے جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہئے۔ جب کہیں خاموش رہ خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جا۔ تو بلا تامل کھل جائے یہ کھل جانا بھی طاعت ہے۔ اس وقت اخفار اتباع نفس ہے اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہوگی جو پہلے اخفار میں تھی۔ غرض صاحبِ کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا۔ نہ اخفار میں نہ اظہار میں۔ بس تعمیلِ حکم میں فنا ہوتا ہے اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرتا پھرتا ہے وہ اب تک فنا ہی نہیں ہوا جب صاحب کمال سر تا پا محو ہوا۔ امتثالِ امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طلب بھی نہ کرتا مگر حکم ہے۔ اس لیے بغرض اس کی

تعمیل کے طلب کرتا ہے۔

دوسری فصل متفرق اصطلاحات

ابرو وچشم وجمال[1] کلام والہام غیبی را گویند (کلام اور الہام غیبی کو کہتے ہیں)۔

ابن الوقت وابو الوقت ابن الوقت کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے۔ ایک وہ سالک جو مغلوب الحال ہو یعنی جو حالت اس پر وارد ہو۔ اس کے آثار میں مغلوب ہو جاوے۔ اس کے مقابل ابو الوقت ہے یعنی وہ سالک جو اپنے حال پر غالب ہو۔ یعنی جس کیفیت و حالت کو چاہے اپنے اوپر وارد کر لے۔ جس کیفیت کی طرف توجہ و قصد کرے اس کے آثار اس میں پیدا ہو جائیں مثل انس وشوق وفنا ووجد وغیرہا۔ دوسرے معنی ابن الوقت کے دونوں مذکور معنوں کو عام اور شامل ہیں۔ یعنی وہ سالک جو واردات مقتضائے وقت کا حق ادا کرے۔ خواہ وہ واردات اس پر غالب ہوں یا یہ ان پر غالب ہو۔

اتحاد عبارت است از استغراق در ہستی حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ (یعنی خدا تعالیٰ کی ہستی میں مستغرق ہونے کا نام اتحاد ہے۔)

اتصال ماسوی اللہ سے منقطع ہونے کو حق کے ساتھ اتصال کہتے ہیں۔ اور ذات کا اتصال ذات سے نہیں ہوتا۔ یہ جسم کا خاصہ ہے۔ حق تعالیٰ کی شان میں اس کا اعتقاد کفر ہے۔ جیسا جہلاء سمجھتے ہیں کہ قطرہ کی طرح سمندر میں مل گیا۔ مولانا رح فرماتے ہیں ؎

---

[1] اکثر اصطلاحات تعلیم الدین سے ماخوذ ہیں اور جو دوسری کتب سے منقول ہیں۔ ساتھ ہی قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

(یعنی پروردگار عالم کو لوگوں کے ساتھ جو اتصال ہے وہ کیفیت و قیاس سے بالاتر ہے) اور قطرہ و سمندر میں تو بے تکیف (بے کیف) اتصال نہیں ہوتا۔ اس سے اس جہل کی تردید ہوتی ہے اور جو کسی شعر وغیرہ میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔ وہ قابلِ تاویل ہیں قشیریہ میں ہے۔

سال ابن شاهين الجنيد عن معنى مع ، فقال مع على معنيين مع الانبياء بالنصرة والكلاءة قال تعالى انى معكما اسمع وارى ومع العامة بالعلم والاحاطة قال الله تعالى ما يكون من نجوى ثلاثةٍ الا هو رابعهم۔ الآيہ۔	ابن شاہین نے حضرت جنید رح سے معیت کے معنی پوچھے تو فرمایا کہ معیت کے دو معنی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو باعتبار نصرت اور حفاظت کے معیت ہوتی ہے جیسا اس آیت میں فرمایا انی معکما اسمع واری۔ اور عوام کے ساتھ علم اور احاطہ کے اعتبار سے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں ہوتی تین آدمیوں کی سرگوشی مگر ضرور اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔

غرض بعد انقطاعِ خلق کے جس مقام اور حال میں ہے خوف میں یا رجاء میں، انس میں یا ہیبت میں، سب وصال ہے۔

اجتباء — بلا واسطہ اکتساب و مجاہدہ جو احوال باطنیہ حاصل ہو جاتے ہیں اس کو جذب کہتے ہیں۔ اور اجتباء و محبوبیت اور مرادیت بھی کہتے ہیں۔

(التکشف ص ۶۲)

آزادی۔ حریت — آزادی کے معنی ہیں اپنے نفس کی بندگی اور اطاعت سے نکل جانا نہ یہ کہ خدا کی بندگی اور احکام شرع سے باہر ہو جانا کہ عین گرفتاری ہے۔ احکامِ شرع کبھی معاف نہیں ہوتے۔ البتہ پہلے جو اطاعت دشواری سے ہوتی ہے وہ اب آسانی سے ہونے لگتی ہے۔ تو تکلیف ساقط نہیں ہوتی بلکہ کلفتِ تکلیف ساقط ہو جاتی

ہے ــ

من ازاں روز کہ در بندِ توام آزادم
پادشاہم کو بدست تو اسیر افتادم

(یعنی میں جس روز سے تیری قید میں ہوں۔ آزاد ہوں۔ جب سے تیرے ہاتھ میں قیدی ہوا بادشاہ ہوں۔)

اقامت غلبۂ عشق راگویند۔
(عشق کے غلبہ کو کہتے ہیں۔)

اوباش آنکہ غمِ ثواب وعقاب نہ کند (جو ثواب وعذاب کا غم نہ کرے۔)

بادہ وشراب عشق ومحبت راگویند۔
(عشق اور محبت کو کہتے ہیں۔)

بازگشت وآں این ست کہ ہر بارے کہ ذکر بزبانِ دل کلمہ طیبّہ را گوید۔ در عقب آں بدل مناجات کند کہ الٰہی مقصودِ من توئی و رضائے تو (یعنی بازگشت یہ ہے کہ جب بزبانِ دل کلمۂ طیبہ کا ذکر کیا جائے تو اس کے بعد دل میں خدا سے دعا کرے۔ کہ خدایا تو اور تیری رضا ہی میرا مقصود ہے۔)۔

بادہ فروش، پیر مغاں، پیر خرابات وخمار

مرشد راگویند (مرشد و راہبر کو کہتے ہیں۔)

بامداد مقامِ بازگشت، احوال واوقات (حالات واوقات کے بازگشت کے مقام کو کہتے ہیں)۔

بت وشاہد معانِ مقصود راگویند (معانی مقصودہ کو کہتے ہیں)۔

بت خانہ، بت کدہ، شراب خانہ، دیر، خرابات، عالم معنی

باطن عارف راگویند (عارف کے باطن کو کہتے ہیں۔)

بروز[1] کوئی روح کسی زندہ کے بدن میں تصرف کرے۔ یہ تصرف جن شیاطین کی تو معمولی بات ہے اور انسان سے بطور خرقِ عادت واقع ہوتا ہے۔

بوسہ و غمزہ و فیض جذبہ باطن راگویند (باطنی جذبہ کو کہتے ہیں)

تجرید و تفرید دنیاوی و اخروی اغراض کو ترک کر دینا تجرید ہے اور کسی چیز کی اپنی طرف نسبت نہ کرنا تفرید ہے۔

تجلی و استتار تجلی، ظہور کو کہتے ہیں۔ اور استتار، پوشیدہ ہونے کو۔ تجلی کی کئی قسمیں ہیں اور ہر ایک کے جدا آثار ہیں۔ ایک تجلی ذاتی ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اگر سالک کے وجود عنصری کے صفات و آثار کچھ باقی ہیں۔ تب تو بے ہوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر بے ہوش ہو گئے اور اگر وجود عنصری کے آثار بالکل فانی ہو چکے ہیں تو مشاہدہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ قبل موت تو یہ خلعت

---

[1] تنبیہ۔ ہنود جو تناسخ یعنی آواگون کے قائل ہیں وہ اہلِ حق کے نزدیک باطل ہے (جمعہ جس کا بیان ہوا اور تمثل اور خلع بدن، جن کا بیان آئندہ آئے گا) کے وقوع سے کسی کو جواز تناسخ کا دھوکہ نہ ہو جائے۔ تناسخ میں اور ان میں صریح فرق ہے۔ تمثل میں تو ذات کو اپنی کسی حالت سے انتقال نہیں ہوتا۔ اور تناسخ میں روح کا منتقل ہونا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس سے تو یہ فرق ہے اور خلع بدن میں جو روح دوسرے بدن میں آگئی ہے اس کی ابھی موت نہیں آئی تھی اور تناسخ بعد مرنے کے قرار دیا گیا ہے اور بروز میں جس بدن میں روح نے اپنا اثر کیا۔ اس میں پہلے سے روح موجود ہے۔ بخلاف تناسخ کے کہ یہی روح اس بدن میں آتی ہے۔ ان فرقوں کو اچھی طرح سمجھ لو۔

خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت ہوا۔ اور بعد موت سب مؤمنین کو جنت میں دیدار ہوگا۔ دوسری تجلی صفاتی۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر صفات جلالی تجلی کریں تو سالک پر خشوع وخضوع کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر صفات جمالی تجلی کریں۔ تو سالک کو سرور وانس ہوتا ہے۔ تیسری تجلی افعالی۔ اس کی علامت یہ ہے کہ سالک کی نظر کسی مدح وذم، نفع وضرر ورد و قبول پر نہیں رہتی۔

تجلی روح کے وقت سالک کے اندر عجب وپندار پیدا ہوتا ہے اور تجلی حق کے وقت فناء وعجز طاری کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ مگر خود سالک پر فناء وعجز کا ورود نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تجلی اسی روح کی ہے جس کے سامنے تمام عالم سربسجود نظر آتا ہے۔ پھر اس پر فناء وعجز کیونکر طاری ہوگا۔ اور تجلی حق کے وقت خود اس کی روح پر بھی فناء وعجز کا ورود ہوتا ہے اور تمام عالم کے ساتھ خود اس کی روح بھی بسجود ہوتی ہے اسوقت سالک پر فناء و عجز کا غلبہ ہوتا ہے۔ (اشرف المسائل ص۸۸)۔

بعض اوقات سالک، روحانی تجلی کو ربانی تجلی سمجھ کر گمراہ ہوتا ہے اس مقام پر شیخ کامل محقق کی ضرورت ہے۔

ترسا مرد روحانی را گویند کہ از صفاتِ ذمیمہ ونفس امارہ خلاص یافتہ باشد و موصوف بصفاتِ حمیدہ شدہ باشد۔ (یعنی ترسا، اس روحانی آدمی کو کہتے ہیں کہ جو بُری صفات اور نفس امارہ سے خلاصی پائے ہوئے ہو۔ اور اچھی صفات رکھتا ہو۔)

ترسا بچہ واردات غیبی را گویند کہ از عالمِ غیب در دلِ سالک فرود آید (یعنی ترسا بچہ، ان وارداتِ غیبی کو کہتے ہیں۔ جو عالمِ غیب سے سالک کے دل میں وارد ہوں۔)

تزکیہ اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا۔ جس طرح جسم ظاہری کے لیے ایک حالت صحت کی ہے اور ایک مرض کی، اسی طرح باطن کے لیے بھی ایک حالت صحت کی ہے اور ایک مرض کی۔ اور نفس کو امراضِ باطنیہ سے پاک کرنا یہی تزکیہ ہے

جس کا شریعت میں نہایت تاکید سے امر ہے اور اسی کو مدار فلاح ٹھہرایا گیا ہے۔

(اشرف المسائل ص۵۳)

تفرد عبارت است از تنہا کردن از جمیع ماسوی اللہ تعالیٰ (تمام غیر اللہ سے اپنے آپ کو خالی کر لینا۔)

تلوین و تمکین سالک کے قلب کے حالات کا مختلف ہونا کہ کبھی قبض ہو کبھی بسط، کبھی سکر، کبھی صحو۔ بالخصوص مبتدی کہ اس کو بہت تغیر پیش آتا ہے۔ اس کو تلوین کہتے ہیں۔ یہ لوازم سلوک سے ہے مضر نہیں۔ اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ وہ پریشانی البتہ مضر ہے۔ (اور) دوام طاعت و کثرتِ ذکر میں استقامت کے ساتھ مشغول رہنے سے حسبِ استعداد آخر میں مناسب حالت محمودہ پر قرار ہوتا ہے۔ جس کو اصطلاحِ تصوف میں تمکین کہتے ہیں۔ تمکین کے بعد تمام اشیاء کے حقوق بخوبی ادا ہوتے ہیں۔ اسی تمکین کا نام، توسط و اعتدال ہے۔ اسی توسط کی وجہ سے اس امت کا نام امتِ وسط ہے تلوین والا پہچانا جاتا ہے اور صاحب تمکین کی حالت عوام جیسی ہو جاتی ہے۔ پس صاحبِ تلوین صاحبِ حال ہے اور صاحب تمکین، حقیقت شناس ہے۔ صاحبِ تلوین ابھی راہ میں ہے اور صاحبِ تمکین واصل ہو چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں زنانِ مصر صاحبِ تلوین تھیں اور حضرت زلیخا صاحب تمکین۔

تمثل کوئی ذات باوجود بقا اپنی حالت و صفت کے کسی دوسری صورت میں ظہور کرے۔ اس دوسری صورت کو صورتِ مثالی کہیں گے جیسے حضرت جبرئیل صورت بشریہ میں متمثل ہوتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ فرشتہ سے آدمی بن جاتے تھے ورنہ تمثل نہ ہوتا۔ استحالہ وانقلاب ہوتا۔ خواب و مکاشفات میں حق تعالیٰ کو صورتِ مثالیہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی تجلی مثالی سے

---

[1] التکشف ص۳۲۱ [2] انفاس عیسیٰ ص۱۳۴،۶۵ [3] فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا الآیہ۔ [4] رأیت ربی فی احسن صورۃ ۱۲۔

نور الٰہی کو دیکھا ۔ ذاتِ خداوندی کو نہیں دیکھا ۔ ورنہ طالبِ دیدار نہ ہوتے ۔ پس اللہ تعالےٰ مثل سے پاک ہے مگر مثال خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی بیان فرمائی ہے ۔ کیونکہ دو چیزوں میں کچھ صفات مشترک ہوں ۔ ان میں ایک کو دوسری کی مثال کہتے ہیں ۔ مثلاً حسین آدمی کو چاند سے تشبیہ دیں تو وہ آدمی چاند نہیں ہو گیا ۔ مگر صفت حسن میں اشتراک ہونے سے چاند کو آدمی کی مثال کہیں گے اور اس کی شناخت سے حسنِ انسانی کی کسی قدر شناخت ہو جاوے گی گو کامل شناخت نہ ہو ۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لو ۔ اس میں غور نہ کرنے سے کفر و الحاد لازم آ جاتا ہے ۔

جفا پوشانیدن دلِ سالک از مشاہدہ (مشاہدہ سے سالک کے دل کو باز رکھنا ۔)

جمع و فرق و جمع الجمع مخلوق کو یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی فاعل اور موصوف بصفات فرمایا ہے ۔ فرق ہے اور یہ سمجھنا کہ ان میں نہ کوئی فعل ہے نہ کوئی صفت حقیقتہً فاعل اور موصوف ذاتِ حق ہے اور سب اس کا پرتو ۔ یہ جمع ہے اور بالکل مخلوق پر نظر نہ رہنا یہ جمع الجمع ہے اور ایک اصطلاح اس میں اور ہے ۔ ممکنات کو فاعل و موصوف سمجھنا فرق ہے اور صرف حق پر نظر ہونا جمع ہے اور مخلوق کو آئینہ صفاتِ حق سمجھنا جمع الجمع ہے ۔

جور باز داشتن سالک از سلوک عروج (یعنی سالک کو مقاماتِ عالیہ پر نہ چڑھنے سے روکنا ۔

چلیپا عالمِ طبائع را گویند (عالم طبائع کو کہتے ہیں)

حال و مقام سالک کے قلب پر جو کیفیت غیب سے نازل ہو جس میں اس کا کچھ اختیار نہیں ۔ اس کو حال کہتے ہیں اور جس مرتبۂ سلوک میں اس نے پختگی و استقامت حاصل کی ہو وہ مقام ہے ۔ مقامات سلوک ذیل اعمال باطنہ

لہ لیس کمثلہ   ؎ مثل نورہ کمشکوٰۃ الآیہ

ہیں۔ جن کی تحصیل کا شریعت نے امر کیا ہے اور ہر مسلمان خصوصاً سالک ہمیشہ ان کے طے کرنے میں مشغول ہے۔ کسی وقت توقف نہیں ہوتا مقام تو سالک کے تحت میں ہوتا ہے اور حال کے تحت میں سالک ہوتا ہے (الرحیل ص۳۱)

حجابات

اہلِ کشف نے فرمایا ہے کہ ہر لطیفہ میں دس دس ہزار حجابات ظلمانی و نورانی ہیں۔ اور لطیفہ قالبیہ کو ملا کر سات لطیفے ہیں۔ تو ستر ہزار حجاب ہوئے۔ ذکر سے ظلمت دفع ہوتی ہے اور لطیفہ کا نور سالک کو نظر آتا ہے۔ یہ علامت ان حجابات کے اٹھ جانے کی ہے مثلاً حجاب نفس کا، شہوت و لذت ہے اور حجاب دل کا، نظر کرنا غیر حق پر۔ اور حجاب عقل کا معانی فلسفیہ میں خوض کرنا اور حجاب روح کا مکاشفات عالم مثال کے۔ وعلیٰ ہذا ان میں کسی کی طرف ملتفت نہ ہو۔ مقصود حقیقی کی طرف متوجہ رہے اور غیر مقصود کی نفی کرتا رہے۔ اشعار۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیرِ حق براند
در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت
مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہو جاتا ہے تو معشوق کے سوا سب کو نذر آتش کر دیتا ہے غیر اللہ پر لا کی تلوار چلا اور پھر دیکھ کہ لا کے بعد کیا رہتا ہے۔ بس اِلَّا اللّٰہُ رہ جائیگا۔ باقی سب ختم ہو جائے گا)۔

حجابات[۱] کے چار مرتبے ہیں۔ مرتبۂ لاہوت، مرتبۂ جبروت، مرتبۂ ملکوت، مرتبۂ ناسوت۔ یہ مقامات سلوک نہیں ہیں۔ بلکہ یہ مراتبِ وجود ہیں۔ بعضوں نے ایک اور قافیہ نکالا ہے۔ ہاہوت۔ نہ معلوم یہ لغت بھی ہے یا نہیں۔ ہاہوت درجۂ ذاتِ حق ہے۔ اگر یہ

۱۔ مقالاتِ حکمت ص۵۳ و الرحیل ص۳۱

لغت صحیح ہو اور لاہوت مرتبۂ اجمال صفات ہے اور جبروت مرتبۂ تفصیل صفات ہے اور ملکوت عالم ملائکہ ہے اور ناسوت عالم انسان ہے۔ ہاہوت و لاہوت و جبروت کا طے کرنا تو انسان سے محال ہے۔ ذات و صفات حق کے مراتب کون طے کر سکتا ہے کہ امکان کا انقلاب وجوب کی طرف لازم آتا ہے اور ناسوت کے طے کرنے کی ضرورت ہی نہیں اس میں تو آپ موجود ہی ہیں اور ملکوت میں پہنچنا ممکن تو ہے۔ مگر اختیاری نہیں۔ بعد موت کے خود بخود ہر شخص وہاں پہنچ جائے گا حتیٰ کہ کافر بھی پہنچ جائے گا۔ مرتبۂ لاہوت و مرتبۂ جبروت غیر مخلوق ہیں۔ غیر مرتبۂ صفاتِ اجمالیہ تفصیلیہ۔ اس کا جس قدر انکشاف ہے وہ بے شک مقصود ہے۔ باقی دو مرتبے جو مخلوق ہیں وہ حجاب ہیں۔ مرتبۂ ملکوتی حجاب نورانی ہے اور مرتبۂ ناسوتی حجابِ ظلمانی۔ مرتبہ ناسوتی چونکہ مبتذل و حقیر ہے۔ اس وجہ سے چنداں حاجب نہیں۔ برخلاف مرتبۂ ملکوتی کے، کہ وہ زیادہ حاجب ہے۔

خاطر

قلب پر جو خطاب وارد ہوتا ہے وہ خاطر ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔ ایک اللہ کی طرف سے۔ دوسرا فرشتہ کی طرف سے۔ تیسرا نفس کی طرف سے۔ چوتھا شیطان کی طرف سے۔ اوّل کو خاطرِ حق، دوسرے کو الہام تیسرے کو ہواجس، چوتھے کو وسواس کہتے ہیں پہچان یہ ہے کہ اگر نیک بات دل میں آوے اور اس کے خلاف پر عمل کر سکے تو الہام ہے اور اگر خلاف پر عمل نہ کر سکے تو خاطرِ حق ہے اور اگر بُری بات دل میں آئے تو اگر شہوت و غضب و تکبر وغیرہ صفاتِ نفس کی طرف رغبت ہوتی ہے تو ہواجس ہے اور اگر کسی گناہ کی طرف میلان ہے تو وہ وسواس ہے۔ بعضوں نے اور طرح فرق بیان کیا ہے۔

چہاردہ خانوادہ

۱:۔ زیدیاں منسوب بخواجہ عبدالواحد بن زید رح

۲:۔ عیاضیاں منسوب بخواجہ فضیل بن عیاض رح

۳:۔ خانوادہ ادہمیاں منسوب بخواجہ ابراہیم ادہم رح

۴:۔ خانوادہ ہبیریاں منسوب بہ ابوہبیرۃ البصری رح

۵ :- خانوادہ چشتیاں منسوب بخواجہ ممشاد علی دینوری رح

۶ :- خانوادہ عجمیاں منسوب بخواجہ حبیب عجمی رح

۷ :- خانوادہ طیفوریاں منسوب بہ سلطان العارفین بایزید بسطامی ملقب بطیفور رح

۸ :- خانوادہ کرخیاں منسوب بمعروف کرخی رح

۹ :- خانوادہ سقطیاں منسوب بہ سری سقطی رح

۱۰ :- خانوادہ جنیدیاں منسوب بہ سید الطائفہ جنید بغدادی رح

۱۱ :- خانوادہ گازرونیاں منسوب بہ ابو اسحاق گازرونی رح

۱۲ :- خانوادہ طوسیاں منسوب بہ شیخ علاءالدین طوسی رح

۱۳ :- خانوادہ سہروردیاں منسوب بہ شیخ نجیب الدین سہروردی رح

۱۴ :- خانوادہ فردوسیاں منسوب بشیخ نجم الدین کبریٰ فردوسی رح

یہ خانوادے تو اصل ہیں ۔ اور ان کے آگے اور شاخیں نکلی ہیں ۔ ان کے نام یہ ہیں ۔

اوّل خانوادہ قادریہ غوثیہ منسوب بہ حضرت غوث الاعظم (شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

دوم خانوادہ :- یسویہ منسوب بخواجہ احمد یسوی رح

سوم :- خانوادہ نقشبندیہ منسوب بخواجہ بہاؤ الدین نقشبند رح

چہارم :- خانوادہ نوریہ منسوب بہ شیخ ابوالحسن نوری رح

پنجم :- خانوادہ خضرویہ منسوب باحمد خضرویہ رح

ششم :- خانوادہ شطاریہ عشقیہ منسوب بہ شیخ عبداللہ شطار رح

ہفتم :- خانوادہ حسینیہ بخاریہ منسوب بہ سید جلال مخدوم جہانیاں بخاری رح

ہشتم :- خانوادہ زاہدیہ منسوب بخواجہ بدر الدین زاہد رح

نہم :- خانوادہ انصاریہ منسوب بہ حضرت شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری رح

دہم :- خانوادہ صفویہ منسوب بہ شیخ صفی الدین رح

یازدہم خانوادہ عیدروسیہ منسوب بہ سید عبداللہ المکی العیدروسی رح

دوازدہم خانوادہ مداریہ منسوب بحضرت بدیع الدین مدار رح

خشم | ظہورِ صفات قہر را گویند۔
(صفاتِ قہر کے ظہور کو کہتے ہیں۔)

خلعِ بدن | کوئی روح اپنا بدن حالتِ حیات میں چھوڑ کر دوسرے مردہ بدن میں چلی جائے۔ یہ بات ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے

خلوت در انجمن | آنست کہ بظاہر با خلق و بباطن با حقتعالی بود با ذکر و عبارت از ذکر لسانی و قلبی است۔ یعنی دور کردن غفلت بذکرِ حق تعالی

(خلوت در انجمن یہ ہے کہ ظاہر میں مخلوق کے ساتھ اور باطن میں بواسطۂ ذکر حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اور ذکر سے مراد ذکرِ زبانی اور قلبی ہے۔ یعنی غفلت کو حق تعالیٰ کے ذکر سے دور کرنا۔)

دلبر | صفت قابضی را گویند۔
(قبض کی صفت کو کہتے ہیں۔)

دلبر و دوست و صنم و محبوب و یار | تجلی صفات را گویند
(صفات کی تجلی و انکشاف کو کہتے ہیں۔)

دلدار | صفت باسطی را گویند۔
(صفت بسط کو کہتے ہیں)

دیر | عالمِ انسانی را گویند
(عالمِ انسانی کو کہتے ہیں۔)

رابطہ | رابطہ خاص ایک شغل کا نام ہے جس میں شیخ کی صورت ذہن میں حاضر کر کے نظر قلب سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھکر اور خیال کو سادھ کر دیکھا جاتا ہے۔

نیفرض کانہ حاضر ناظر لکن یہ فرض کیا جائے کہ شیخ حاضر ناظر ہے۔

؎ اس مقام پر تصورِ شیخ کا بیان بھی ملاحظہ کیا جائے۔

تصوراً فقط لا اعتقاداً فانه — لیکن یہ صرف تصور کے درجہ میں ہو نہ کہ
شرک ولذا یمنع منه العوام — اعتقاد کے، کیونکہ یہ شرک ہے۔ اسی لیے
و هذا هو المراد فی کلام — عوام کو اس سے روکا جاتا ہے اور یہی مقصد
بعض الاکابر حیث ادخل هذا — ہے اکابرین کی ان عبارات کا جن میں
فی عموم قوله تعالیٰ ما — تصور شیخ کو ما هذه التماثیل
هذه التماثیل التی انتم — کے عموم میں داخل کیا ہے (جس کی رو سے
لها عاکفون۔ — حرمت ثابت ہوتی ہے۔)

یہ تو حقیقت ہے اس کی اور فائدہ اس کا شیخ کے ساتھ شغف ہے جس سے بے تکلف اس کا اتباع اخلاق و اعمال میں ہونے لگتا ہے چونکہ احوال ثمرات ہیں۔ اعمال کے۔ اس لیے وہ احوال بھی اس پر وارد ہونے لگتے ہیں لیکن۔

لما کان ضررہ العوام — جب کہ عوام کے حق میں اس کا ضرر زیادہ
اکثر من هذا النفع المذکور — ہے اس نفع سے جو ذکر کیا گیا تو اس سے
لم یعتبر هذا النفع فی — ممانعت میں نفع کا اعتبار نہ کیا جاوے
منعهم منه (التکشف ص۲۱)۔ — گا۔

رجعت — رجعت از مقامِ وصول بقهر بطریقِ انقطاع را گویند۔ (یعنی وصول کے مقام سے بسبب قہر بصورت انقطاع لوٹنے کو رجعت کہتے ہیں۔)

زلف — غیب ہویت را گویند (ذات و حقیقت کے غائب ہونے کو کہتے ہیں۔)

زنار — علامت یک رنگی و یک جہت شدن را گویند۔ (یک رنگی اور یک جہتی کی علامت کو کہتے ہیں۔)

ساغر و پیمانہ — کسے کہ مشاہدۂ انوارِ غیبی و ادراک مقامات کند (جو شخص غیبی انوار کا مشاہدہ اور مقامات کا ادراک کرے۔)

ساقی و مطرب | فیض رسانندگانِ معنی را گویند۔
(معنوی فیض پہنچانے والوں کو کہتے ہیں۔)

سالک، واقف، راجع | فوائد الفواد میں ہے کہ سالک وہ ہے جو راہ چلے اور واقف وہ ہے جو بیچ میں اٹک جائے۔ پس جب سالک عبادت میں کوتاہی کرتا ہے اگر جلدی سے توبہ اور استغفار کر کے بدستور پھر سرگرم ہو گیا تو پھر سالک بن جاوے گا۔ اگر خدانخواستہ وہی غفلت رہی تو اندیشہ ہے کہ کہیں راجع یعنی واپس نہ ہو جائے۔

اس راہ کی لغزش کے سات درجے ہیں۔ اعراض، حجاب، تفاصل، سلب مزید، سلبِ قدیم، تسلی، عداوت،

اوّل اعراض ہوتا ہے۔ اگر معذرت و توبہ نہ کی۔ حجاب ہو گیا۔ اگر پھر بھی اصرار رہا۔ تفاصل ہو گیا۔ اگر اب بھی استغفار نہ کیا تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق و شوق کی تھی۔ وہ سلب ہو گئی۔ یہ سلب مزید ہے۔ اگر اب بھی اپنی بیہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت و حلاوت کہ زیادتی سے قبل اصلِ عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہو گئی۔ اس کو سلب قدیم کہتے ہیں اگر اس پر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل گوارا کرنے لگا۔ یہ تسلی ہے سو اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت، مبدل بعداوت ہو گئی۔ نعوذ باللہ منہا۔

سعادت | عبارت است از استغراق در ہستی حضرت حق سبحانہ تعالیٰ
(خدا تعالیٰ کی ہستی میں مستغرق ہو جانا۔)

سفر در وطن | آنست کہ سالک از طبیعت بشری سفر کند۔ یعنی از صفات ذمیمہ بصفات حمیدہ برآید کہ معنی تخلقوا باخلاق اللہ است۔ (سفر در وطن یہ ہے کہ سالک طبیعتِ بشریہ سے سفر کرے۔ یعنی صفاتِ ذمیمہ کو چھوڑ کر صفاتِ حمیدہ اختیار کرے جو تخلقوا باخلاق اللہ کے معنی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنانا اور اپنے اندر وہ اخلاق پیدا کرنا)

شمع نورِ اللہ را گویند
(اللہ کے نور کو کہتے ہیں۔)

سیرالی اللہ و سیرفی اللہ تعلق مع اللہ[1] کے دو درجے ہیں۔ ایک سیرالی اللہ یہ تو محدود ہے۔ ایک سیرفی اللہ، یہ غیر محدود ہے۔ سیرالی اللہ یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا یہانتک کہ امراض سے شفا ہوگئی اور ذکر و شغل سے تعمیر شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ انوارِ ذکر سے معمور ہوگیا۔ یعنی تخلیہ و تحلیہ کے قواعد جان گئے۔ موانع مرتفع کر دیئے۔ معالجۂ امراض سے واقف ہوگئے نفس کی اصلاح ہوگئی۔ اخلاقِ رذیلہ زائل ہوگئے۔

اخلاقِ حمیدہ اور انوارِ ذکر سے قلب آراستہ ہوگیا۔ اعمالِ صالحہ کی رغبت طبیعت ثانیہ بن گئی۔ اعمال و عبادت میں سہولت ہوگئی۔ نسبت و تعلق مع اللہ حاصل ہوگیا۔ تو سیرالی اللہ ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سیرفی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات و ذات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا۔ تعلق سابق میں ترقی ہوئی۔ اسرار و حالات کا ورود ہونے لگے۔ یہ غیر محدود ہے یہ وہ تعلق ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بحر یست بحرِ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
اینجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(عشق کا سمندر ایک ایسا سمندر ہے کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں سوائے جان سونپنے کے کوئی چارہ نہیں۔)

شاھد جو چیز قلب پر غالب ہو وہ شاہد ہے۔ بعض کا قول ہے کہ شاہد صاحبِ جمال کو کہتے ہیں۔ اگر اس کے روبرو آجانے سے صوفی کے قلب میں کچھ تغیر پیدا نہ ہو تو یہ علامت، اس کے فنائے نفس کی ہے اور اگر تغیر پیدا ہو جائے تو علامت حیاتِ نفس کی ہے تو گویا صاحبِ جمال اس کے حال کا شاہد ہو۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص ۳۱۷،

شطح بے اختیاری کی حالت میں جو غلبۂ وارد کی وجہ سے ظاہری قواعد کے خلاف کوئی بات منہ سے نکل جائے وہ شطح ہے اس شخص پر نہ گناہ ہے۔ نہ اس کی تقلید جائز ہے۔

شقاوت عبارت است از دیدار حق تعالیٰ باز ماندن (حق تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہنا۔)

شیدا اہلِ جذب و اہلِ شوق را گویند (اہلِ جذب اور اہلِ شوق کو کہتے ہیں۔)

صبح طلوعِ احوال واوقات و اعمال را گویند (احوال واوقات اور اعمال کے طلوع کو کہتے ہیں۔)

صبوحی محادثہ را گویند۔
(باہم تکلم کو کہتے ہیں)

صوفی خیر القرون میں تو صحابی، تابعی، تبع تابعی۔ امتیاز حق کے لیے کافی القاب تھے۔ پھر خواص کو زہاد و عباد کہنے لگے۔ پھر جب فتن و بدعات کا شیوع ہوا۔ اور اہلِ زیغ بھی اپنے کو عباد و زہاد کہنے لگے۔ اس وقت اہلِ حق نے امتیاز کے لیے صوفی کا لقب اختیار کیا۔ اور دوسری صدی کے اندر ہی اس لقب کی شہرت ہو گئی۔

طامات معارف را گویند۔
(معارف کو کہتے ہیں)۔

طریق باطن مداومتِ ذکر اور اطاعتِ احکام و ملکات باطنہ مثل توکل رضا و شکر وغیرہ کا نام ہے۔ (انفاسِ عیسیٰ ص ۲۹۱)

طریقِ جذب و طریقِ سلوک تربیت کے دو طریق ہیں۔ ایک جذب دوسرا سلوک۔ جذب یہ کہ طالب پر ذکر و فکر کے ذریعہ سے محبت کا غلبہ کیا جائے۔ اور اعمال زائدہ میں کم لگایا جائے۔ اور اس طریق محبت کے

ذریعہ سے اس کو مقصود تک پہنچایا جاتا ہے۔ دوسرا طریق سلوک۔ وہ یہ کہ تلاوت قرآن مجید اور نوافل وغیرہ میں زیادہ مشغول کیا جاتا ہے۔ (دعوات عبدیت ص۱۱۵ ج ۱)

عالمِ خلق و عالمِ امر و عالمِ مثال

اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات ذی مادہ و ذی مقدار پیدا کی ہیں۔ ان کو مادیات کہتے ہیں۔ تمام اجسام علویہ و سفلیہ ایسے ہی ہیں۔ اور بعض مخلوقات مادہ و مقدار سے مجرد (خالی) پیدا کی ہیں۔ انکو مجردات کہتے ہیں۔ اور ارواح انسانیہ اور دیگر لطائف قلب و سر و خفی و اخفی ایسے ہی ہیں۔ اور یہی مراد ہے صوفیہ کے اس قول سے کہ لطائف فوق العرش ہیں مادیات کو عالم خلق اور مجردات کو عالم امر کہتے ہیں۔ اور عالم مثال ان ہی دونوں عالم کے بین بین ہے یعنی غیر مادی ہونے میں عالم امر کے مشابہ ہے۔ اور مقداری ہونے میں عالم خلق کے مشابہ ہے چونکہ عالم امر میں مقدار نہیں اور حدود خواص مقدار سے ہیں۔ اس لیے عالم امر غیر محدود ہوا۔ اور چونکہ اس میں مادہ بھی نہیں۔ اور زیادہ ترعلامات انفعال (تاثر) وضعف کا یہی مادہ ہے۔ اس لیے اس عالم کے موجودات میں قوت بھی زیادہ ہے۔ (التکشف ص۹۶)

عروج و زوال

سالک جب مراتب سلوک طے کرتا ہوا مرتبۂ فنا تک پہنچتا ہے اور ہر مرتبہ میں تجلیات اسمائی و صفاتی کا انکشاف و مشاہدہ، غلبہ کیساتھ ہوتا ہے جو اصطلاح میں عروج کہلاتا ہے تو غایت سکر سے متمنی ترقی احوال فناء کا ہوتا ہے لیکن محبوب حقیقی کا معاملہ اس مرتبہ کے بعد ہر سالک سے جداگانہ ہوتا ہے بعض کو حسب تمنا انکے ان ہی احوال فنا میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور ان کو مستغرق کردیتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے آئندہ سلسلہ افاضہ کا جاری نہیں ہوتا۔ اور بعض کو اس سکر و فنا سے افاقہ بخشتے ہیں۔ اور یہ بقاء و نزول کہلاتا ہے۔ اور ایسے لوگ مسندِ ارشاد پر متمکن ہوکر خلق اللہ کو فیض پہنچاتے ہیں اور وہ تجلیات اسمائی و صفاتی ان سے بھی منقطع و مختفی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کی معرفت ان اہلِ فنا سے اقوی ہوتی ہے لیکن یہ حضرات ان تجلیات میں مغلوب نہیں ہوتے اور چونکہ اشتیاق ان کا تجرد توجہ الی الحق (محض اللہ کی طرف توجہ) کو مقتضی ہوتا ہے۔ اور توجہ الی الخلق (مخلوق کی طرف توجہ) بھی شانِ ارشاد کے لوازم سے ہے۔ گو ان کے لیے یہ توجہ اس توجہ سے مانع نہیں بلکہ معین بلکہ

عین ہے (یعنی توجہ الی الحق میں مددگار بلکہ یہی بعینہٖ توجہ الی الحق ہے)

علمِ اعتبار

باطنی معنی جو بیان کیے جاتے ہیں۔ اس سے مقصود تفسیر و تعیین مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک شے کی حالت کو دوسری شے کی حالت پر محض تمثیل و قیاس ہوتا ہے۔ اسی کو علمِ اعتبار کہتے ہیں (اس کی) حقیقت یہ ہے کہ ایک مشبہ کو دوسرے مشبہ سے واضح کیا جائے۔ ثابت نہ کیا جائے۔ بلکہ مشبہ ثابت بدلیلِ آخر ہو۔
یہ نہ مجاز میں داخل ہے خواہ مجاز مرسل ہو خواہ استعارہ۔ کیونکہ مجاز میں موضوع لہٗ کے مراد نہ ہونے پر قرینہ ہوتا ہے۔ اس لیے غیر موضوع لہٗ مراد ہوتا ہے اور نہ یہ کنایہ میں داخل ہے کیونکہ کنایہ میں معنی موضوع لہٗ متروک نہیں ہوتے۔ بلکہ کلام کا مدلول اصلی وہی موضوع لہٗ ہوتا ہے۔ مگر مقصود اس کا لازم یا ملزوم ہوتا ہے۔ جیسے طویل النجاد، کہ اس میں مدلول وضعی متروک نہیں۔ مدلولِ کلام وہی ہے مگر مقصود طویل القامۃ ہے۔ کیونکہ طویل النجاد کے لیے طویل القامۃ لازم ہے اور اعتبار میں وہ معنی نہ مقصود ہے نہ مدلولِ کلام ہے۔ پس یہ اعتبار گویا قیاسِ تصرفی ہے اور قیاس فقہی کے مشابہ ہے مگر عین قیاس فقہی نہیں کیونکہ قیاس فقہی میں علت جامعہ مؤثر ہے حکم مقیس میں۔ اسی لیے وہ حکم منسوب الی القیاس ہوتا ہے۔
یہاں یہ بھی نہیں صرف مقیس مقیس علیہ میں تشابہ ہے اور اس مشابہت کو حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ وہ حکم خود مستقل دلیل سے ثابت ہے۔ یہ علمِ اعتبار کی حقیقت ہے۔ پس صوفیہ تو اس حدود سے نہیں نکلتے کیونکہ وہ معانی منقولہ کی نہ مدلولیت کے منکر ہیں۔ نہ مقصودیت کے اور جہلاء صوفیہ خود ان کی مدلولیت کے منکر ہیں اور جدید تعلیم یافتہ مدلولیت کے منکر نہیں مگر مقصودیت کے منکر ہیں بلکہ مقصود معانی سیاسیہ ہی کو سمجھتے ہیں۔ ان سب فرقوں کے فرق کو خوب سمجھ لو۔ (انفاسِ عیسیٰ ص ۳۱۷)

عینیت و غیریت

یہ دو لفظ متقابل ہیں اور مختلف اوضاع سے تین معنی پر ان کا اطلاق آتا ہے۔ معنی اوّل عینیت کے یہ کہ دو مفہوموں کا مصداق من کل الوجوہ ایک ہونا یعنی دو چیزوں کا ہر طرح سے ایک ہونا کہ ان میں کسی قسم کا فرق نہ ہو۔ جیسے انسان اور حیوان ناطق یا زید اور ذات زید۔ کہ ان میں

اصلاً تغائر نہیں۔ اور غیریت یہ کہ ان دونوں میں کسی قسم کا تغائر اور امتیاز ہو۔ یعنی فرق ہو۔ اس تفسیر پر عینیت اور غیریت میں باہم تناقض ہے جس سے ان دونوں کا ایک محل میں جمع ہونا بھی محال ہے اور دونوں کا کسی محل سے مرتفع ہونا بھی محال ہے اور متبادر معنی عینیت وغیریت کے یہی ہیں۔ اور یہی معنی لغوی ہیں۔ اور اسی میں اکثر عرفاً استعمال ہوتا ہے اور اکثر اہلِ معقول بھی یہی مراد لیتے ہیں۔ اس تفسیر کے اعتبار سے کوئی شے موجود خواہ وہ حادث و مخلوق ہو۔ جیسے تمام زمین و آسمان کی چیزیں یا قدیم و غیر مخلوق ہو۔ جیسے صفات باری تعالیٰ کہ عین ذات باری تعالیٰ کی نہیں۔ (مثلاً علیم و حکیم یعنی ذی علم و ذی حکمت وغیرہ۔)

معنیٔ ثانی۔ عینیت کی تو وہی تفسیر لی جاوے۔ اور غیریت کے یہ معنی ہوں کہ دو چیزوں میں سے کسی ایک کا بدل دوسرے کے موجود ہو سکنا۔ اس تفسیر پر عینیت وغیریت میں باہم تناقض تو نہیں مگر تضاد ہے۔ یعنی دونوں ایک محل پر صادق نہیں آسکتے مگر دونوں مرتفع ہو سکتے ہیں۔ یہ اصطلاح متکلمین کی ہے۔ اس تفسیر کے اعتبار سے بھی ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں عینیت نہیں۔ بلکہ غیریت ہے۔

معنیٔ ثالث۔ عینیت کے معنی ہیں۔ ایک شے کا دوسری شے کی طرف محتاج فی الوجود ہونا۔ گو وہ دوسری شی اس پہلی کی محتاج نہ ہو اور غیریت کے وہ معنی ہیں۔ جو معنیٔ اول میں مذکور ہوتے ہیں۔ یعنی ان دونوں شے میں سے کسی قسم کا تغائر و امتیاز و فرق ہونا اور اس تفسیر پر عینیت وغیریت میں نہ باہم تناقض ہے اور نہ تضاد۔ بلکہ دونوں کا جمع ہونا ایک محل میں ممکن ہے۔ مثلاً زید اور اس کی صفات، کہ صفات بدون زید کے نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے عینیت صادق آئی۔ اور دونوں باہم ممتاز بھی ہیں۔ اس لیے غیریت صادق آئی۔ اور یہ اصطلاح حضرات صوفیہ کرام کی ہے۔ اس تفسیر کے اعتبار سے ذاتِ باری تعالیٰ اور مخلوقات میں عینیت بھی ہے۔ کیونکہ مخلوقات ذاتِ باری تعالیٰ کی محتاج ہیں۔ گو ذاتِ باری تعالیٰ احتیاج سے مبرا ہے اور غیریت بھی ہے۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ اور مخلوقات میں لاکھوں طرح کے فرق ہیں۔

(التکشف صـ٦٦)

غمگساری صفت رحمانی را گویند
(رحمانی صفت کو کہتے ہیں)

غیبت و حضور و شہود کوئی وارد قوی قلب پر آیا۔ خواہ صفات خداوندی کا غلبہ ہوا۔ یا کچھ ثواب و عذاب یاد آیا۔ اس کے غلبہ سے حواس معطل ہو گئے۔ اور ادھر کی خبر نہ رہی۔ یہ غیبت ہے۔ یعنی خلق سے۔ اور جب ہوش آگیا۔ حضور ہو گیا اور کبھی اس غیبت کو حضور کہتے ہیں۔ یعنی حضور بحق۔ کبھی حضور کی جگہ شہود بولتے ہیں اس کے معنی بھی حضور ہی کے ہیں۔ سو جو چیز قلب میں حاضر ہوگی وہ شاہد مشہود ہے۔ لیکن اکثر صوفیہ جب لفظ شہود بولتے ہیں۔ تو شہود حق مراد لیتے ہیں اور لفظ شواہد سے مخلوق مراد لیتے ہیں پس غیبت کی دو قسمیں نکلیں۔ ایک محمود۔ اگر خلق کی طرف سے ہے ایک مذموم اگر حق کی طرف سے ہے اسی طرح حضور کو سمجھ لو۔

غیرت اہل کمال کے نزدیک طاعتِ حق ہر امر میں مقدم ہوتی ہے اگر احیاناً کسی چیز کی مشغولی نے طاعتِ حق میں خلل ڈالا تو اہل کمال کو اس چیز کے رفع کرنے کا ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے (یعنی) حق تعالیٰ سے غافل کرنے والی چیز سے نفرت ہو جانا اس کو غیرت کہتے ہیں۔ (التکشف ص ۴۲۲)

قلاشی مباشرت و مباشرت اعمال را گویند۔ (مصاحبت اور اعمال کے اپنانے کو کہتے ہیں۔)

قلندر و قلاش اہل صفا و اہلِ ترک و اہل فنا را گویند (اہلِ صفا اور اہلِ ترک اور اہلِ فنا کو کہتے ہیں)

کباب پرورشِ دل در تجلیات حق (حق تعالیٰ کی تجلیات میں دل کی پرورش ہونا)

کشف و شہود مرتبہ عین اللہ را گویند (عین اللہ کے مرتبہ کو کہتے ہیں۔)

کفر — تاریکی را گویند
(اندھیری کو کہتے ہیں)

کلیسا — عالم حیوانی را گویند
(عالم حیوانی کو کہتے ہیں)

گبر و کافر — کسے کہ یک رنگ در وحدت شدہ دروئے از ماسوی اللہ تعالیٰ بر تافتہ (جو شخص وحدت میں یک رنگ ہو جائے اور غیر اللہ سے رو گرداں ہو جائے۔)

مے — ذوق را گویند کہ از دل سالک سر زند و او را خوش وقت گرداند (اس ذوق کو کہتے ہیں جو سالک کے دل سے اٹھتا ہے اور اس کو خوش وقت بناتا ہے۔)

گیسو — ظاہر طالب را گویند
(طالب کے ظاہر کو کہتے ہیں۔)

لب و دہان — صفت حیات را گویند
(حیات کی صفت کو کہتے ہیں)

لطائف ستہ — حسبِ ذیل ہیں (بجز نفس کے، کہ وہ عالمِ خلق سے ہے۔ باقی سب عالمِ امر سے ہیں۔)

لطائف کا نام	نفس ۱	قلب ۲	روح ۳	سر ۴	خفی ۵	اخفی ۶
غذا یا فعل	غفلت	ذکر	حضور	مکاشفہ ملکوت	مشاہدۂ فنا	معائنہ فنار الفناء
مقام	زیر ناف	زیر پستان چپ	زیر پستان راست	مابین قلب و روح	مابین دوا برو	ام الدماغ
رنگ	زرد	سرخ	سفید	سبز	نیلا	سیاہ

لطائف ستہ کشف سے دریافت ہوئے ہیں۔ اور ان کے توحد و تعدد میں اختلاف ہوا ہے لیکن ان کے افعال خاصہ سے ظاہر اُن کے تعدد پر استدلال ممکن ہے۔
نفس بقیہ لطائف کے مضاد ہے اور باقی لطائف آپس میں متناسب ہیں اور ہر

تحتانی رتبہ فوقانی کے لیے ممد ہے ۔ اور فوقانی تحتانی پر مشتمل ۔ اسی لیے فوقانی ذاکر ہو جانے سے تحتانی بھی ذاکر و جاری ہو جاتا ہے ۔

بعض نے (تعیین مقامات میں) کچھ اختلاف بھی کیا ہے اور وجہ اختلاف کی اختلاف کشف ہے کیونکہ جملہ لطائف مثل مرایا متعاکسہ (آئینے جن میں عکس نظر آتا ہے) کے ہیں ۔ جس شخص کو جہاں کسی لطیفہ کا نور نظر آیا ۔ اس نے وہیں اس کا مقام سمجھ لیا ۔ اور کسی کو مقامِ اصلی مکشوف ہوا ۔
لطائف کی تحقیق مبسوط کا اگر شوق ہو تو رسالہ "الفطائف من اللطائف" کا مطالعہ کیا جائے

(مبادی التصوف ص۱۱)

مادہ و مجرد

(عالمِ خلق و عالمِ امر کی اصطلاح ص۳۶۴ پر ملاحظہ ہو ۔)

محاضرہ و مکاشفہ و مشاہدہ

محاضرہ تجلی افعال کو کہتے ہیں ۔ مکاشفہ تجلی صفات کو اور مشاہدہ تجلی ذات کو ۔ محاضرہ قلب سے ہوتا ہے ۔ مکاشفہ سر سے اور مشاہدہ روح سے ۔

محو و اثبات

اس کے معنی قریب قریب فنا و بقا کے ہیں اور وہی قسمیں یہاں بھی ہیں ۔ اور محو کے معنی میں اور بھی چند الفاظ مستعمل ہیں ۔ محق ، سحق ، طمس ۔ اور اگر ان الفاظ میں کچھ فرق کیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں ۔ مثلاً صفات کو محق کہیں ۔ اور فنائے ذات کو سحق اور صفات و ذات کے آثار محو ہو جانے کو طمس کہیں ۔

مدارات و مداہنت

مدارات کا حاصل اہل جہل کے ساتھ نرمی کرنا ہے کہ وہ دین کی طرف آجائیں اور اہلِ شر کے ساتھ نرمی کرنا تاکہ ان کے شر سے حفاظت رہے اور یہ دونوں امر مطلوب ہیں ۔ اول تو خود دین میں مقصود ہے ۔ اور ثانی مقصود میں معین ہے ۔ کیونکہ کسی شریر کی ایذا میں مبتلا ہو جانے سے احیاناً طاعت میں بھی اور اکثر تبلیغ میں بھی خلل پڑ جاتا ہے اور مداہنت بد دینوں کے ساتھ نرمی کرنا ہے تاکہ ان سے مال و جاہ کا نفع حاصل کرے (اور یہ ناجائز اور حرام ہے)

اور مدارات حضرات صوفیہ کے خاص اخلاق سے ہے ۔ (کمالات اشرفیہ ص۹۵)

مست و خراب استغراق را گویند۔
(استغراق کو کہتے ہیں)

مست و شیدا اہل حزن و ذوق را گویند (اہلِ حزن وذوق کو کہتے ہیں)۔

مستی فرد گرفتن عشق بجمیعِ صفات (عشق کو مع اس کی جمیع صفات کے اختیار کرنا۔)

مکہ و مدینہ مکہ کی حقیقت تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت تجلی عبدیت ہے اور عارف ہر وقت اپنے اندر تجلی الوہیت اور تجلی عبدیت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ جہاں بیٹھے گا مکہ و مدینہ اس کے ساتھ ہے مگر جو محقق ہے وہ صورت کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتا بلکہ حتی الامکان صورت و معنی دونوں کے جمع کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص۲۸۸)

میخانہ لاہوت را گویند۔ (لاہوت یعنی مرتبۂ اجمالِ صفات کو کہتے ہیں)

مے لعل خون عاشقاں کہ از راہِ دیدہ در جام کنارش ریزند۔ (یعنی عاشقوں کا خون جو آنسو بن کر ان کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔)

نسبت نسبت کے لغوی معنی ہیں لگاؤ اور تعلق۔ اور اصطلاحی معنی ہیں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص قسم کا تعلق یعنی قبول و رضا۔ جیسا عاشقِ مطیع اور وفادار معشوق میں ہوتا ہے۔

جب ذکر اللہ کی مواظبت اور ریاضات و مجاہدات کی کثرت سے ظلمات نفسانیہ و کدورات طبعیہ کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ تو قلب و روح کو حق تعالیٰ کے ساتھ ایک مخصوص تعلق پیدا ہو جاتا ہے اس کو نسبت سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی نسبت کے پیدا ہو جانے کا نام وصول ہے۔

نسبت، تعلق طرفین کا نام ہے۔ یک طرفہ تعلق کو نسبت نہیں کہا کرتے۔ پس بہت لوگ ایسے ہیں کہ ان کو خدا تعالیٰ کے ساتھ محض یاد کا تعلق ہے اور یہ تعلق یکطرفہ ہے تعلق دوطرفہ عمل و اطاعت سے ہوتا ہے جب انسان عمل و اطاعت کا اہتمام کرتا ہے اس وقت حق تعالیٰ

کو بھی اس سے تعلق ہو جاتا ہے (اور اس کا) القا ایک دم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ رفتہ رفتہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ البتہ اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام افعال، اقوال و حرکات میں زیادہ تشبہ ہو۔ ہر ہر بات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی کوشش کی جائے۔ اور یہ اتباع عادت ہو جائے کہ بے تکلف سنت کے موافق افعال صادر ہونے لگیں۔ (انفاس عیسیٰ صـ۱۱ اشرف المسائل صـ۱۵۵ تا ۱۵۷ ملخصاً)

نظر بر قدم آنست کہ در آمد و رفت راہ ہر جا کہ باشد نظر بر پشت پا دارد۔ تا نظر پراگندہ نہ شود و شاید نظر بر قدم اشارت بسرعت سیر سالک بود در قطع مسافت ہستی۔ یعنی نظر او ہر جا کہ منتہی شود فی الحال قدم برآں نہد (یعنی نظر بر قدم یہ ہے کہ آمد و رفت میں جہاں کہیں بھی ہو۔ نظر اپنے پاؤں پر رکھے تاکہ نظر منتشر نہ ہو۔ اور شاید نظر بر قدم کا اشارہ سالک کی مسافت ہستی کے طے کرنے میں تیز رفتاری کی طرف ہو۔ یعنی سالک کی نظر جس مقام پر ختم ہو سالک اپنا قدم اس مقام پر رکھے۔

نفس نفس انسان کے اندر ایک قوت ہے جس سے کسی چیز کی خواہش کرتا ہے خواہ وہ خواہش خیر ہو یا شر۔ اگر اکثر شر کی خواہش کرے اور نادم بھی نہ ہو اس وقت امارہ کہلاتا ہے یعنی کثیر الامر بالسوء (برائی کا بہت زیادہ حکم کرنے والا) اور اسی مرتبہ کی خواہش کا نام ہویٰ ہے اور کبھی کبھی اس میں خیر کی بھی خواہش پیدا ہو جانا اس مفہوم کے منافی نہیں کیونکہ کثیر الامر کو دائم الامر ہونا لازم نہیں اور اگر نادم بھی ہونے لگے تو لوامہ کہلاتا ہے اور اگر اکثر خواہش خیر کی کرے اس وقت مطمئنہ کہلاتا ہے۔ بمعنی ساکن الی الخیر (نیکی پر ٹھہرنے والا) گو کبھی اس میں شر کی بھی خواہش بلا عمل احیاناً پیدا ہو جائے۔ کیونکہ محض انجذاب بمعنی میلان منافی سکون نہیں۔ چنانچہ اجسام ثقیلہ باوجود میلان الی المرکز کے ساکن بھی دیکھے جاتے ہیں۔ البتہ اس خواہش کے مقتضا پر عمل کرنا کہ حرکت من المقر ہے۔ یہ البتہ منافی سکون ہے تو اس صورت میں مطمئنہ نہ رہیگا غرض دونوں خواہشیں خیر کی بھی اور شر کی بھی نفس ہی کے متعلق ہیں۔ البتہ اسباب ہر خواہش کے جُدا جُدا ہیں۔ بعض تو مشاہد ہیں۔ جیسے نصیحت و صحبت نیک۔ خواہش خیر کے لیے اور اغوا و صحبت بد، خواہش شر کے لیے اور بعض اسے غیر مشاہد ہیں جیسے القاء ملک، خواہش خیر

کے لیے۔ اور القاء شیطان خواہش شر کے لیے۔ اسی کو حدیث میں لمۃ الملک اور لمۃ الشیطان اور ایعاد بالخیر اور ایعاد بالشر سے تعبیر فرمایا ہے۔

نفس مکار شیطان سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس کو بھی نفس ہی نے خرابی میں ڈالا تھا تو یہ نفس شیطان کا بھی باپ ہوا۔ پس نفس کا مغلوب کرنا کفار کے مغلوب کرنے سے بھی اہم ہے اسی واسطے مجاہدہ نفس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے (التکشف صہ ۱۱۴، کمالات اشرفیہ صہ ۳۰۱)

نگاہداشت مراد از مراقبۂ خاطر است از خطرۂ ماسوی اللہ تعالیٰ چنانچہ اگر در یکدم صد بار کلمۂ طیب را گوید خاطر بغیر نہ رود۔

(مراد اس سے یہ ہے کہ اپنے دل کی غیر اللہ کے خیالات کے آنے سے نگہبانی کرنا (بایں معنی) کہ اگر بیک دم سو مرتبہ کلمہ طیبہ کہے تو دل غیر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔)

وارد خاطر تو کلامِ نفسی ہے اور وارد عام ہے۔ جمیع کیفیات کو جیسے حزن و سرور، و قبض و بسط وغیرہ۔

وصل عبارت است از نسیانِ خود بشہودِ نورِ وجودِ حق تعالیٰ۔

(اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ذوقی حضور و تعلق ہو جاوے اور غیر سے غفلت و ذہول۔ جب یہ نسبت متصل ہو جاوے۔ اس کو وصل کہتے ہیں۔)

وفا عنایتِ ازلی را گویند۔

(عنایتِ ازلی کو کہتے ہیں)

وقت و نفس بندہ پر جو حال غالب ہو۔ جیسے حزن و سرور مثلاً اس کو وقت کہتے ہیں اور یہ سالک و غیر سالک دونوں کو پیش آتا ہے۔ دوسرے معنی وقت کے سالک کے ساتھ مخصوص ہیں وہ یہ کہ غیب سے کوئی ایسا حال غالب ہو کہ سالک اپنی حالت سے باہر ہو جائے الصوفی ـــــ ابن الوقت کے یہی معنی ہیں اگر یہ حالت دائم ہے تو نفس کہتے ہیں۔

وقوف زمانی آنست کہ بندہ بہر حال واقف احوال خود باشد اگر بہ طاعت است شاکر باشد و اگر معصیت است عذر خواہد

(وہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں اپنے احوال کا واقف ہو۔ اگر طاعت ہے تو شکر کرے اور اگر نافرمانی ہے تو عذر چاہے۔)

وقوف عددی | وآں عبارتست از رعایت عدد طاق در نفی و اثبات (اس کا مطلب یہ ہے کہ نفی و اثبات میں طاق عدد کا لحاظ رکھے۔)

وقوفِ قلبی | آنست کہ ذاکر آگاہ و واقف باشد با حق تعالیٰ بوجہے کہ دل را ہیچ علاقہ بغیر حق نہ باشد (یعنی وقوفِ قلبی یہ ہے کہ ذاکر حق تعالیٰ کا واقف ہو۔ اس طرح کہ دل متواتر غیر اللہ سے متعلق نہ ہو۔)

ہمّت | قلب کو کسی طرف اس طرح مجتمع اور یکسو کرنا کہ دوسری چیز کا خطرہ نہ آوے ہمّت ہے۔ اس ہمت سے بڑے بڑے کام بنتے ہیں۔ آج کل تو اس کو توجہ کہتے ہیں۔

ہوش دردم | عبارت ازاں ست کہ ہمیشہ ہوشیار و آگاہ بر نفس خود باشد۔ تاکہ دم بہ غفلت نہ برآید و ایں شغل دافع تفرقۂ نفسے است (یعنی اپنے نفس پر ہمیشہ ہوشیار رہے اور اس پر آگاہ رہے تاکہ کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے اور یہ شغل، نفس کے انتشار کو دفع کرنے والا ہے۔)

ہیبت | قبض میں جب اور ترقی ہوتی ہے اس کو ہیبت کہتے ہیں۔

یادداشت | عبارت از متوجہ بودن بحق تعالیٰ است۔ بہر حال بر سبیلِ ذوق۔ (یعنی ہر حال میں بطریقِ ذوق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔)

یقین کے مراتب | اعتقادِ جازم مطابق للواقع کو۔ (یعنی وہ پختہ اعتقاد جو واقعہ کے مطابق ہو) یقین کہتے ہیں (اس کے تین مرتبے ہیں علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین)

علم الیقین کا مرتبہ یہ ہے کہ کوئی کسی شے کو اعتقادِ جازم (یعنی پختہ اعتقاد) کے ساتھ جان لے۔ جیسے کسی کو یہ علم ہو جائے کہ آگ جلاتی ہے۔

عین الیقین یہ کہ اس کے ساتھ مشاہدہ بھی ہو جائے۔ مثلاً آنکھ سے دیکھ لے کہ آگ کسی شے کو جلا رہی ہے۔

حق الیقین یہ کہ اس کے ساتھ اتصاف بھی حاصل ہو جائے۔ مثلاً کوئی شخص اپنا ہاتھ آگ میں ڈال کر دیکھ لے اور ہاتھ جل جائے (التکشف ص۱۱۱، مبادی التصوف ص۱۱)

۱۰۔ موانع

یوں[1] تو جتنے معاصی اور تعلقات ماسوی اللہ ہیں۔ سب اس راہ کے راہزن ہیں۔ مگر چند ضروری چیزوں کو چند فصلوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

پہلی فصل۔ تصنع[3]

عن[2] اسماء قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم المتشبع بما لم یعط کلابس ثوبی زور۔ اخرجہ الخمسۃ۔

حضرت اسماء رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایسے امر کا اظہار کرے جو اس کو نہیں ملی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے دونوں کپڑے جھوٹ کے پہن لیے۔ (یعنی ازار اور ردا مطلب یہ کہ گویا سر سے پاؤں تک جھوٹ ہی جھوٹ لپیٹ لیا۔)

---

[1] تعلیم الدین ص۱۲۶ [2] التکشف ص۴۱۵ [3] اس مقام پر ریا کا مضمون بھی ملاحظہ کیا جائے۔

چونکہ عالم بسیط عام ہے۔ کمالات باطنیہ کو بھی۔ اس لیے حدیث میں ایسے شخصوں کی بھی مذمت ہے جو باوجود عاری یا ناقص ہونے کے قول یا فعل یا طرز و انداز سے اپنے کو بزرگ ظاہر کرتے ہیں خاصکر جبکہ مرید کرنا بھی شروع کردیں۔ یہ تو بالکل دھوکہ کی صورت ہوگئی۔ ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

(یعنی اس قوم میں سے نہ ہوجانا جو خدا کو سجدہ اور پیغمبر کو درود سے دھوکہ دیتی رہے) اس پر تقدس کا دعویٰ ہے۔ اور بزرگی کے مدعی ہیں۔ (سو) یہ دینداری کی صورت تو ہے۔ مگر دینداری کی حقیقت نہیں ہے۔ بادام اور شے ہے اور بادام کا چھلکہ اور شے ہے۔ پستہ اور شے ہے اور پوست اور شے ہے۔ اخروٹ اور شے ہے اور چھلکا اس کا اور شے ہے اسی طرح آدمی کی صورت اور شے ہے اور حقیقت اور شے ہے۔ ؎

گر بصورت آدمی انساں بدے — احمد و بوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ می بینی خلاف آدم اند — نیستند آدم غلاف آدم اند

(ترجمہ: اگر آدمی شکل و صورت سے انسان ہوتا تو محمدؐ اور ابوجہل برابر ہوتے۔ جن لوگوں میں تو دیکھتا ہے کہ آدمیت نہیں۔ وہ بظاہر تو آدمی ہیں لیکن حقیقت میں آدمی نہیں۔) ایسے ہی ہمارے اعمال کی حالت ہے کہ اعمال کی صورت ہے حقیقت نہیں ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
حاصلِ خواجہ بجز پندار نیست

(ترجمہ:۔ خواجہ سمجھتا ہے کہ بہت کچھ حاصل ہے۔ حالانکہ اسے پندار کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں۔) ان ہی صورِ اعمال پر نظر مقتصر کرکے ہر شخص بجائے خود سمجھ رہا ہے کہ مجھ میں کچھ ہے میں متقی ہوں۔ ذاکر ہوں کوئی سمجھتا ہے کہ عالم ہوں، حافظ ہوں اور اگر باطن کو دیکھا جائے تو یہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عزّ و جلّ

۱؎ دعوات عبدیت ص ۶۴ ۱۱۰۰ ۱۳۸

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　وز درونت ننگ میدارد یزید

(یعنی باہر سے مثل کافر کی قبر کے آراستہ اور اندر خدا کا عذاب (بھرا) ہے باہر سے طعنہ زن ہیں بایزیدؒ پر اور اندرونی طور پر (اعمال سے) یزید بھی شرم کرتا ہے۔)

اصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو حس نہیں رہی۔ اگر بصیرت ہو تو معلوم ہو کہ سب اعمال میں نفس کی بچر لگی ہوتی ہے۔ واللہ العظیم ہم لوگوں کے اعمال وہ ہیں کہ قیامت کے روز اگر ہمارے جوتیاں نہ لگیں تو غنیمت ہے۔ پہلے بزرگوں کی حالت اس کے برعکس تھی۔ حضرت ذوالنون مصریؒ سے لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت بارش نہیں ہوتی۔ فرمایا۔ میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں۔ شاید بارش میری وجہ سے نہیں ہوتی میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اس کے بعد چلے گئے اور بارش بھی ہوتی۔ پس ہم لوگوں کو اپنے گناہوں پر نظر کرنی چاہیئے۔ خالقِ تعالیٰ شانہٗ تو ظاہر اور باطن کا جاننے والا ہے اس سے کیسے بچیں گے۔ ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام　　در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آرے جملہ راست　　با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کارہا در راست باید داشتن　　رایت اخلاص و صدق افراشتن

(ترجمہ:۔ مخلوق کو فریب میں مبتلا کیا جا سکتا ہے اور ہر خاص و عام کو غلطی میں ڈالا جا سکتا ہے مخلوق کے ساتھ اگر تمام کاروبار درست کیے جائیں تو خدا کے ساتھ مکر و فریب کیسے روا ہے۔ فی الحقیقت خدا کے ساتھ معاملات درست رکھنے چاہئیں اور صدق و خلوص کا علمبردار ہونا چاہیئے (یعنی) خدائے تعالیٰ کے ساتھ تو فریب کرنا نہ چاہیئے اور نیک نامی اور بدنامی کو بالائے طاق رکھ کر سچا اتباع کرنا چاہیئے۔

دوسری فصل ـ تعجیل

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسْتَجَابُ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے

۱؎ تعلیم الدین ص ۱۲۹، ۱۳۰

لاحدکم مالم یعجل۔ ترمذی   جب تک جلدی نہ کرے۔

حصولِ ثمراتِ مجاہدہ میں تقاضا وعجلت کرنا کہ اتنے دن ہوگئے اب تک کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ یہ (بھی) ایک مانع (طریق) ہے اسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ یا تو شیخ سے بداعتقاد ہو جاتا ہے یا مجاہدہ ترک کر دیتا ہے۔ طالب کو سمجھنا چاہیئے کہ کوئی چیز بھی دفعتہً حاصل نہیں ہوتی۔ دیکھو یہی شخص کسی وقت بچہ تھا۔ کتنے سن میں جوان ہوا۔ پہلے جاہل تھا۔ کتنے دنوں میں عالم ہوا۔ غرض عجلت و تقاضا گویا اپنے ہادی پر فرمائش ہے (حافظ ؒ فرماتے ہیں)؎

ہمہ کام زخود کامی بہ بدنامی کشید آخر[1]

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

(خود کامی، استعجال وصل) یعنی جلدی کامیاب ہوجانے کے تقاضے کی بدولت میرے کام کا انجام یہ ہوا کہ تمام میں رسوا ہوگیا (کیونکہ اس جلدی میں ہر کسی سے تدبیریں پوچھنے لگا جس میں اظہار راز محبت کرنا پڑا۔ سب کو میرا حال معلوم ہوگیا۔) اور بھلا ایسا راز کب پوشیدہ رہ سکتا ہے جس کے لیے مجمع کیا جاوے۔

ف۔ اس میں یہ بتلا دیا کہ سالک کو استعجال اور جلدی ثمرہ حاصل ہوجانے کا تقاضا مضر ہے۔ کیونکہ ایسا شخص اپنے رہبر پر قناعت و طمانیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اہل کی تخصیص بھی نہیں رکھتا۔ ہر کس و ناکس سے چارہ جوئی کرتا ہے اور سب کو اس کا مخفی حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اور مخفی حال کا اظہار بجز مرشد کے کسی سے مذموم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہرجائی ہونے کی وجہ سے پوری توجہ و شفقت اس شخص پر کسی کو بھی نہیں ہوتی۔ اور شیخ کی عنایت و لطف بھی جاتا رہتا ہے اور مزید برآں یہ کہ جس چیز کو جلدی چاہتا ہے اس کا حصول خارج از اختیار ہوتا ہے۔ اس سے پریشانی اور بڑھتی ہے۔ غرض ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے برائی ہاتھ آتی ہے پس اس میں اشارہ ہے کہ سالک ہرگز تقاضا اور جلدی نہ مچاوے۔ اور غیر مرشد سے اپنا حال نہ کہے۔

---

[1] التکشف ص۱۲۰

تیسری فصل۔ حسن پرستی

جواہر[1] غیبی میں لکھا ہے کہ ایک شخص طواف کرتا جاتا تھا اور کہتا تھا اللّٰھم انی اعوذ بك منك۔ (ترجمہ:۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں) کسی نے اس کا حال دریافت کیا۔ کہنے لگا کہ ایک بار کسی حسین امرد کو نظر شہوت سے دیکھا۔ اسی وقت غیب سے ایک طمانچہ لگا۔ جس سے آنکھ جاتی رہی۔ یوسف بن حسین فرماتے ہیں۔

رأیت آفات الصوفیة فی صحبة الاحداث و معاشرة الاضداد ورفق النسوان۔	دیکھا میں نے آفاتِ صوفیہ کا امردوں کے میل جول کرنے اور ناجنسوں سے ملنے میں اور عورتوں سے نرمی برتنے میں۔

شیخ واسطی رح فرماتے ہیں۔

اذا اراد الله هوان عبد القاه الی هؤلاء الانتان و الجیف۔ یرید به صحبة الاحداث۔	جب اللہ کسی بندے کی ذلت وخواری چاہتا ہے۔ ان گندوں اور سڑوں کی طرف اس کو ڈالتا ہے۔ اور مائل کرتا ہے۔ اس سے ان کی مراد امردوں سے میل جول کرنا ہے۔

مظفر قرمیسینیؒ فرماتے ہیں۔

احنلق الارفاق النسوان علی ای وجه کان۔	نرمی اور مہربانی کرنے میں سب سے بُرا عورتوں سے نرمی اور مہربانی کرنا ہے جس طرح ہو

کسی نے شیخ نصیر آبادیؒ سے کہا کہ لوگ عورتوں کے پاس بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے دیکھنے میں ہماری نیت پاک ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

---

[1] تعلیم الدین صـ۱۱۹

ما دامت الاشباح باقية فان الامر والنهي باق و التحليل والتحريم مخاطب به	جب تک جسم انسانی باقی ہے۔ امر و نہی بھی باقی ہے اور تحلیل و تحریم کے ساتھ مخاطب ہے۔

میلان[1] کے دو درجے ہیں۔ ایک تو کسی شے کی طرف توجہ۔ اور ایک محبت یعنی توجہ تقاضا کے درجے میں۔ اول درجہ میں تو امر طبعی ہے۔ حق تعالیٰ نے مرد کی طبیعت میں میلان رکھا ہے نہ یہ کسی تدبیر سے جا سکتا ہے اور نہ اس کے کھونے کا انسان مکلف ہے اور دوسرا درجہ اختیاری ہے یعنی اختیار کو وجود و عدم میں دخل ہے۔ انسان کسی چیز میں انہماک اتنا کر سکتا ہے کہ اسی کا ہو رہے۔ اور کسی چیز سے اتنا بچ سکتا ہے کہ محبت کا درجہ نہ رہے۔ جب یہ اختیاری ہے تو انسان اس کا مکلف بھی ہے۔

شہوات[2] دنیا موجب نقص نہیں۔ بلکہ یہی موجب کمال ہیں۔ ٹاٹ کا پردہ زانی نہ ہو تو کیا کمال ہے اندھا نظر بد نہ کرے تو کیا کمال ہے۔ بلکہ کمال تو یہ ہے کہ حسن کا ادراک ہو۔ اور اس کی طرف طبیعت میں میلان بھی ہو۔ پھر بھی نامحرم کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ کشش و میلان کا بالکل زائل ہو جانا تو عادۃً ممتنع ہے۔ البتہ تدبیر سے اس میں ایسا ضعف و اضمحلال ہو جاتا ہے کہ مقاومت میں صعب[ء] نہیں رہتی۔ اور وہ تدبیر صرف اس میں منحصر ہے کہ عملاً اس کشش کے مقتضا کی مخالفت کی جائے۔ گو کلفت ہو اس کو برداشت کیا جاوے۔ اسی سے کسی کو جلدی کسی کو دیر میں علی اختلاف الطبائع اس کشش میں ضعف و اضمحلال ہو جاتا ہے اور رکنے کیلئے ہمیشہ قصد و ہمت کی ضرورت رہتی ہے۔ مگر اس ضعف کے سبب اس قصد میں بہ سہولت کامیابی ہو جاتی ہے اور اس سے زیادہ توقع رکھنا اُمنیہ (آرزو) محضہ ہے اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْخَوَارِقِ مگر یہ کہ خرق عادت ہو) اس اصل سے تمام فطریات میں کام لینے سے پریشانی هَبَاءً مَّنْثُوْرًا (کافور) ہو جاتی ہے۔

شہوت[3] رانی میں بوقت قضاء شہوت بھی لذت آتی ہے اور بعد میں بھی لذت رہتی ہے

---

[1] ک ۱۲ [2] کمالات اشرفیہ ص۱۸۰، ۱۲۰، ۲۲۷ [3] الکمال فی الدین ص۶۱، ۶۳، ۶۴

ء مقابلہ میں دشوار

قضائے شہوت کے بعد کچھ کوفت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو روحانی کوفت ہوتی ہو تو ممکن ہے۔ لیکن ایسے بہت کم ہیں۔ عام حالت یہی ہے کہ شہوت رانی کے بعد مزہ پڑ جاتا ہے۔ پہلے سے زیادہ آگ بھڑک جاتی ہے گو تھوڑی دیر کے لیے سکون پڑ جاتا ہے اور شہوت بالنساء سے بھی زیادہ اشد شہوت بالامارد (امردوں سے) ہے۔ آج کل امردوں کے ساتھ ابتلاء علم ہو رہا ہے۔ یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ لبعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہ شہوت سے پاک وصاف ہیں۔ مگر ان میں بھی اکثر نظر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ زنا آنکھ سے بھی ہوتا ہے۔ اس میں بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں۔ حالانکہ نظر فعل کا مقدمہ ہے اور مقدمۃ الحرام حرام قاعدہ فقہیہ ہے۔ یعنی حرام کے مقدمات بھی حرام ہوتے ہیں۔ اس لیے نگاہ کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔

معالجہ

یہ شر (بدنظری) ایسا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے نور کو تاریک کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہئیے اور ظاہر ہے کہ یہ مادہ خلقی ہے۔ پس وہ شر نہیں بلکہ اس میں بہت سے مصالح ہیں۔ البتہ اس مادہ کے اقتضاء پر عمل کرنا شر ہے اور وہ اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے۔ پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھہرا۔ اس میں کوئی معذوری نہیں۔ یہ خیال کرو کہ اگر اس عورت کے شوہر (یا امرد کے وارث) کو اس خیال کی اطلاع کر دوں تو کتنی رسوائی ہو۔ تو حق تعالیٰ تو بے کہے مطلع ہیں کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ اس ارادے کو دیکھ رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں عقوبت جہنم کو بھی مستحضر کر کے اس میں لگ جاوے۔ (یا) نفس سے یہ کہے کہ جس طرح تو مجھے دوسری عورتوں سے حظ حاصل کرنے کو کہتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص میری بیوی سے حظ حاصل کرے اور مجھ کو اس کا علم ہو جاوے تو میں کیا کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاؤں گا۔ اسی طرح کیا دوسروں کو غیرت نہ آئے گی کہ اگر ان کو خبر ہو جائے تو وہ بھی مجھے مار ڈالیں۔ ہر طرح کے ضرر پہنچانے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر جہنم کا نقشہ پیش نظر کرے۔ بدوں ہمت کے کوئی کام نہیں ہوتا اصل علاج نظر بد کا یہی ہے کہ جس وقت ایسا موقع ہوا کرے۔ یہ خیال کر لیا کیجیے کہ حق تعالےٰ اس وقت بھی دیکھ رہے ہیں اور قیامت میں بھی باز پرس کریں گے۔ اگر سزا کا حکم کر دیا تو کیسی

لـہ انفاسِ عیسیٰ صـ ۱۳۹، ۱۴۰، ۳۰

بنے گی۔ بار بار اس خیال کے حاضر کرنے سے انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ پس ہمت کیجئے یہی اس کا علاج ہے۔ چندے تکلف ہوگا پھر عادت ہو جاوے گی۔ پھر لذت اور فرحت ہوگی۔

چوتھی فصل۔ مخالفت سنّت

۱ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ	جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں
وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا	(یعنی کسی شے کا امر فرمائیں) اس کو لو۔
الآیہ	اور جس شے سے منع کریں اس سے باز رہو
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ	یا رسول اللہ! کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے
اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ	محبت ہے تو میرا اتباع کرو خدا کو تم سے
اللّٰهُ الآیت	محبت ہو جائے گی۔

۲ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں خاص برکت کا راز یہ ہے کہ جو شخص آپ کی سی ہیئت بناتا ہے۔ اس پر خدا تعالیٰ کو محبت و پیار آتا ہے کہ یہ میرے محبوب کا ہم شکل ہے اور یہ وصول کا ایسا طریق ہے جو سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ جو بھی اختیار کرے گا وہ بہت جلد کامیاب ہوگا ورنہ ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ۔۔۔ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
مپندار سعدی کہ راہ صفا ۔۔۔ تواں رفت جز در پئے مصطفےٰ

(ترجمہ:۔ جو شخص پیغمبر کے سوا راہ اختیار کرے گا وہ ہرگز منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گا اور پیغمبر کے نقش قدم کے سوا صحیح راستہ نہیں مل سکتا۔)

منقول از خیر المجالس ۳ :۔

مجلس ۵ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ نے ذکر میں اولیاء اللہ کے

---

۱ الاخلاص ص ۲ ۔۔۔ ۲ طریق القلندر ص ۱۲

۳ سنۃ الجلیہ ص ۲۶، ۳۸، ۱۲، ۱۸۰، ۲۲، ۹، ۲، ۵، ۹۱

فرمایا کہ متابعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرور ہے قولاً و فعلاً و ارادۃً۔ اس لیے کہ محبت خدا بے متابعت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاصل نہیں ہوتی۔

مجلس ۲۸ جو کچھ خداوند کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا وہ کرنا چاہیئے اور جس سے خداتعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا۔ اس سے بچنا چاہیئے ۳۹ پھر کہا۔ لوگوں نے قرآن وحدیث کو چھوڑ دیا۔ لہٰذا خراب و پریشان ہیں۔

منقول از دلیل العارفین۔

مجلس دوم: حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ کہ جو آدمی شریعت پر ثابت قدم ہوا اور جو کچھ احکام شرع کے ہیں۔ ان کو بجالایا اور سرمو ان سے تجاوز نہ کیا۔ تو اس کا مرتبہ آگے کو بڑھتا ہے۔ یعنی تمام ترقیاں اس پر موقوف ہیں کہ شریعت پر ثابت قدم رہے۔

مجلس ۵۔ علماء کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔

منقول از اسرار الاولیاء

اٹھارویں فصل حضرت شیخ فریدالدینؒ نے فرمایا کہ اے درویش حدیث شریف میں آیا ہے کہ فقیہہ عالم ہزار ایسے لیسے عابدوں سے بہتر ہے جو شب کو قیام کریں اور دن کو روزہ رکھیں۔ اور عالم کی ایک دن کی عبادت عابد بے علم کی چالیس دن کی عبادت کے برابر ہے۔

منتخب از مکتوبات قدوسیہ

مکتوب ۳۶۔ شریعت پر قائم رہو۔ کیونکہ باطن کی صفائی اور اس جہان کی نجات کیلئے اسوقت بجز شریعت کے کوئی شے حجت اور سبب نہیں۔

مکتوب ۴۲۔ وہ لوگ شریعت کے احکام سے ہٹ گئے۔ حلال و حرام چھوڑ دیا۔ گمراہی میں پڑ گئے۔ کل کے دن کفار کے ساتھ دوزخ میں ہوں گے۔

از راحت القلوب۔

مجلس ۱۷ حضرت خواجہ بابا فرید گنج شکرؒ (نے فرمایا) جس مذہب میں کہ ہم ہیں۔ وہ امام اعظم ابوحنیفہ رح کا مذہب ہے۔ یہ مذہب صواب پر ہے اور خطا کا احتمال نہیں ہے وہ کیسے خدا کے بندے تھے کہ جنہوں نے سوائے متابعت خدا تعالیٰ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی کام نہیں کیا۔

حضرت[1] شاہ خوب اللہ صاحبؒ الہ آبادی جو بڑے بزرگ تھے حضرت خضرؑ سے ملا کرتے تھے۔ آپ نے لکھا۔ جب قاضی (ضیاء الدین سنامیؒ) صاحب کی وفات کا وقت قریب آیا اور حضرت سلطان جی (نظام الدین اولیاءؒ) عیادت کے لیے تشریف لے گئے (قاضی صاحب نے) اپنا عمامہ خدام کو دے کر فرمایا کہ اس کو بچھا دو اور سلطان جی سے عرض کرو کہ اس پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں۔ حضرت سلطان جیؒ نے وہ عمامہ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا۔ یہ دستار شریعت ہے اس کو تو میں سر پر رکھوں گا (جب) قاضی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا (تو) فرمانے لگے کہ افسوس شریعت کا ستون منہدم ہو گیا۔

فتوحات[2] میں ہے

کل حقیقۃ علیٰ خلاف الشریعۃ زندقۃ باطلۃ	جو حقیقت شریعت کے خلاف ہو۔ وہ بددینی اور مردود ہے۔
ما لنا طریق الی اللہ الاّ علی الوجہ المشروع لا طریق لنا الی اللہ الا ما شرعہ فمن قالَ ان ثَم طریقا الی اللہ خلاف ما شرع فقولہ زور فلا یقتدیٰ	ہمارے لیے اللہ کی طرف کو کوئی راستہ نہیں ہے مگر شرعی طور سے اور کوئی راہ نہیں ہمارے لیے اللہ کی طرف کو مگر وہی جو اس نے شریعت میں بتلا دی ہے جو شخص کہے کہ ادھر کوئی اور راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف برخلاف اس کے جو شریعت نے بتلا دیا اس کا قول جھوٹا

---

[1] بزم جمشید صفحہ ۱۴۳ [2] تعلیم الدین صفحہ ۱۱۶

بشیخ لا ادب لہ‘۔ | ہے پس ایسے شیخ کو مقتدا نہ بنایا جائے جس کو ادب نہ ہو۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔

لو نظرتم الی رجل اعطی من الکرامات حتی یرتقی فی الھواء فلا تغتروا لہ حتی تنظروا کیف تجدونہ عند الامر والنھی وحفظ الحدود الشریعۃ۔

اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ کرامتیں دیا گیا ہے یہاں تک کہ ہوا میں اڑتا ہے تو دھوکے میں نہ آؤ۔ جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور حفظ حدود اور پابندیٔ شریعت میں کیسا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:۔

الطرق کلھا مسدودۃ علی الخلق الا علی من اقتفی اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کل مخلوق پر سب راہیں بند ہیں۔ سوائے اس کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلے۔

اور فتوحات میں ہے۔

فما عند اللہ من لم یعلم بحکمۃ بمکان فان اللہ ما اتخذ ولیا جاھلا وفیہ ان البطالۃ مع العلم خیر من العمل مع الجھل

اللہ کے نزدیک نہیں ہے وہ شخص کسی مرتبہ میں جو اس کے حکم کو نہ جانتا ہو۔ کیونکہ اللہ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا اور اسی فتوحات میں ہے کہ باوجود علم کے بیہودگی کرنا اس عمل سے بہتر ہے جو جہل سے ہو۔ فقط۔

(الغرض) یہ حضراتؒ نہایت متبع سنت اور پابندِ شریعت تھے۔ اور کوئی بزرگ بھی ایسے نہیں ہوئے جنہوں نے اتباعِ سنت نہ کیا ہو۔ حتیٰ کہ اگر غلبۂ حال سے کبھی اتباع میں کچھ

لہ طریق القلندر صد ۱۶۔

کمی بھی ہوگئی ہے تو اپنی ساری حالت کو ناقص سمجھتے ہے اور کبھی اصرار نہیں کیا۔ سب بزرگوں کا ایک ہی طریق رہا ہے اور وہ طریق شریعت ہے۔ حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ فرماتے ہیں۔ بر ہوا پری مگسے باشی، بر آب روی خسے باشی، دل بدست آر کہ کسے باشی، اگر بزرگ کرامت ہوا پر بھی اڑو گے تو کیا ہے گویا مکھی ہو جاؤ گے کہ وہ بھی تو ہوا میں بلا تکلف اڑتی ہے پانی پر چلو گے تو یوں سمجھو کہ ایک تنکا ہو گئے کیونکہ وہ بھی تو پانی کی سطح پر بہتا ہوا جاتا ہے۔ ہاں اپنے دل کو قابو میں کرو تب انسان بنو گے۔ حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو یہ کہتی ہے۔ نحن وصلنا فلا حاجة لنا الی الصلٰوة والصیام ہم واصل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں نماز اور روزہ کی حاجت نہیں رہی۔ حضرت جنیدؒ نے جواب میں فرمایا۔ صدقوا فی الوصول ولکن الی سقر یہ تو سچ کہتے ہیں کہ واصل ہو گئے ہیں لیکن واصل جہنم ہوئے ہیں۔ نہ واصلِ خدا۔

فوائد الفواد مجلس ۲۹، جمادی الآخر ۷۱۸ھ (میں ہے)

آپ[۱] (حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ) نے فرمایا کہ ایک دفعہ انھوں (حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ) نے سبحانی ما اعظم شانی (پاک ہوں میں کس قدر بلند ہے میری شان) کہا تھا۔ پھر آخر عمر میں آپ مستغفر ہوئے اور کہا میں نے یہ بات ٹھیک نہ کہی تھی۔ میں اس وقت یہودی تھا۔ اب زنار توڑتا ہوں اور از سر نو مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ فے شریعت اور ادب کو کیسا جمع فرمایا ہے۔ اور نسبت کے اثبات و نفی میں کیسی احتیاط فرمائی ہے۔

اس[۲] باب میں ہزاروں ارشادات بزرگوں کے مذکور ہیں۔ کہاں تک لکھا جاوے قشیریہ میں حضرت ذوالنون مصریؒ و سری سقطیؒ و ابو سلیمانؒ احمد بن ابی الحواری و ابو حفص حداد و ابو عثمان و نوری و ابو سعید خراز سے اور دوسری کتابوں میں بھی مثل دلیل العارفین ملفوظات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ و مکتوبات قدوسیہ حضرت قطب

---

۱ [illegible] ۶۶ ۲ تعلیم الدین ۱۱۷ تا ۱۱۹، ۱۲۷

العالم عبد القدوس گنگوہی اور قوت القلوب ابو طالب مکی وغیرہا میں یہ مضمون نہایت استحکام کے ساتھ مذکور و منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر میں اول علم شریعت پھر عمل شریعت کی سخت ضرورت ہے اور بدوں اس کے آگے راہ نہیں کھلتی اور کبھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر کے اور طریق بدعت کو اختیار کر کے ولی نہیں ہو سکتا۔ جب بدعت قاطع طریق ہے تو کفر و شرک کا تو کیا پوچھنا ہے۔ آج کل لوگوں نے علم و عمل کے اڑانے کو دو لفظ یاد کئے ہیں۔ علم کی نسبت حجاب اکبر اور عمل کی نسبت دعوائے آزادی صاحبو! حجاب اکبر کے اگر یہ معنی ہوں تو جتنے بزرگوں کے نام لکھے گئے ہیں یہ جھوٹے بلکہ محجوب ٹھہرتے ہیں یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ حقائق کے قاعدے سے اس کے بہت باریک معنی ہیں۔ مگر موٹے سے معنی یہ سمجھو کہ حجاب اکبر اس پردے کو کہتے ہیں جو بادشاہ کے قریب پڑا رہتا ہے کہ وہاں پہنچ کر بادشاہ کا بہت ہی قرب ہو جاتا ہے تو اس میں علم کی مدح ہے۔ یعنی جب علم حاصل کر لیا تو جتنے حجاب تھے سب اٹھ گئے۔ یہاں تک کہ حجاب اکبر تک پہنچ گیا۔ اب ایک تجلی سے حیرت کا غلبہ ہو یہ حجاب بھی اٹھ جاوے۔ واصل ہو جاوے اور جس نے سرے ہی سے علم حاصل نہیں کیا خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے وہ تو ابھی بہت پردوں کے پیچھے ہے اور بہت دور رہا۔

دعوائے آزادی کے معنی باب اصطلاحات میں (درج ہیں) کہ قید شہوت و غفلت سے آزاد ہونا ہے نہ کہ احکام محبوب حقیقی ہے ؎

گر تو خواہی حری و دل زندگی　　بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی ست　　زندگی بے بندگی شرمندگی ست
جز خضوع و بندگی و اضطرار　　اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی　　کفر باشد پیش او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر　　مغز باید تا دہد دانہ شجر

(ترجمہ:۔ اگر تو آزادی اور زندہ دلی کا خواہاں ہے تو بندگی کر۔ زندگی بندگی کے لیے مقصود ہے زندگی بغیر بندگی کے شرمندگی ہے۔ عجز و انکساری اور غلامی و بندگی کے سوا اس بارگاہ میں کوئی

چیز معتبر نہیں۔ جو شخص عشق میں زندگی پاتا ہے اس کے آگے بندگی کے سوا سب کفر ہے۔ ذوق ہونا چاہیئے تاکہ عبادات مثمر ہوں مغز ہونا چاہیئے تاکہ دانہ سے درخت پیدا ہو۔

اور اگر یہ شبہ ہے کہ علم حقیقت اگر علم شریعت کے خلاف نہیں ہے تو بزرگوں نے اسرار کو کیوں پوشیدہ کیا ہے۔ شریعت تو اظہار کے قابل ہے تو اس کا حال اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ علم شریعت ہی کو علم حقیقت کہتے ہیں بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ علم حقیقت علم شریعت کے خلاف نہیں ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ شریعت نے ایک چیز کو حرام یا کفر کہا ہے۔ حقیقت میں وہ حلال اور ایمان ہو جاوے۔ مثلاً دیوانی کا قانون اور ہے، فوجداری کا اور، مگر یہ نہیں کہ جو چیز قانون اول میں جائز ہو وہ قانونِ دوم میں ناجائز یا بالعکس۔ ہاں البتہ ہر ایک کے مضامین میں جداگانہ ضرور ہیں سو یوں تو شریعت میں بھی مضامین مختلفہ ہیں۔ اور خود حقیقت میں بھی۔ مگر وہ مضامین شریعت کے مضامین کی نفی نہیں کرتے۔ پوشیدہ کرنے سے جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ تو رفع ہو گیا۔ اب یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ پوشیدہ رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ تو سمجھنا چاہیئے کہ قابلِ اخفاء کے تین امر ہوتے ہیں۔ ایک اسرار، سو امام غزالیؒ نے (قواعد العقائد میں) اس کی کئی وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مضامین خلاف شرع تو نہیں ہوتے مگر دقیق زیادہ ہوتے ہیں جو عوام کے فہم میں نہیں آسکتے اور ان کو مضر ہوتے ہیں۔ دوسرے تعلیم سلوک کے طریقے۔ اس میں اخفاء کی وجہ یہ ہے کہ اعلان میں اس کی بے قدری اور دوسرے طالب کی ہوسناکی کا احتمال ہے۔ تیسرے ثمرات مجاہدہ و مکاشفات وغیرہ اس کا اخفاء بوجہ احتمال ریاء و دعویٰ کے ہے۔ غرض کسی امر کا اخفاء اس وجہ سے نہیں ہے کہ مخالفِ شرع ہے اور اگر فرضاً ایسا ہو تو وہ قابل رد و انکار کے ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس کو دولتِ وصول میسر ہوئی ہے۔ علمِ شریعت اور اتباعِ سنت سے ہوئی ہے اور اگر کسی بزرگ کا کوئی قول و فعل خلافِ سنت منقول ہے۔ تو وہ یا تو سکر اور غلبۂ حال میں صادر ہوا۔ یا وہ حکایت غلط منقول ہے۔ یا ان سے کسی باریک مسئلے میں جہاں دلیلِ شرعی خفی و دقیق تھی۔ خطائے اجتہادی ہو گئی جس میں شرعاً معذور ہیں اور خدا تعالیٰ سے ان کو بعد نہیں ہوا۔ یہاں تو

کھلم کھلا مخالفت بلکہ اس کی نفی اور اس کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا جاتا ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ خلافِ شرع کوئی کام کرنا درست نہیں مثل طواف قبر و سجدۂ مشائخ وغیرہ۔ ان کا ذکر باب مسائل میں آئے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کی اطاعت بھی جبھی تک ہے کہ وہ اللہ و رسول کے خلاف نہ کہے ورنہ اس شیخ ہی کو سلامِ رخصت کرنا چاہیئے۔ حضرت نوری رح فرماتے ہیں۔

من رأیته یدعی مع اللہ	جس کو دیکھو کہ اللہ کی معیت اور قربت میں
تعالیٰ حالۃً تخرجه عن حد	ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے کہ جو حد شرعی سے
العلم الشرعی فلا تقربن منه	خارج ہے اس کے قریب مت بھٹکو۔

افسوس اس زمانے میں رسوم و بدعات کی بڑی کثرت ہے اور تصوف ان ہی رسوم کا نام رہ گیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
وسلم یوشك ان یأتی علی الناس	عنقریب لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ
زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمه	نہ باقی رہے گا اسلام سے مگر نام ہی نام
ولا یبقی من القرآن الا رسمه	اور قرآن سے نہ باقی رہے گا مگر خطوط
الحدیث رواه البیهقی فی	اور نقوش۔
شعب الایمان۔	

جو حقیقت تصوف کی تھی کہ فناء و بقاء کی نسبت حاصل کریں۔ اس کے معنی بھی نہیں جانتے ان رسوم کے مقید ہو گئے۔ ابو العباس دینوری رح نے اپنے زمانے کا حال بیان فرمایا ہے تو ہمارے زمانے کا کیا ٹھکانا ہے ان کا ارشاد ہے۔

نقضوا ارکان التصوف و	لوگوں نے ارکانِ تصوف کو توڑ دیا اور اس
هدموا سبلها و غیروا معانیها	کے طریقوں کو تباہ کر دیا اور اس کے معنوں
باسامی احدثوها سموا الطمع	کو بدل دیا ایسے ناموں سے جو خود گھڑے
زیادۃ و سوء الادب اخلاصاً	طمع کا نام زیادت رکھا اور بے ادبی کا اخلاص

و الخروج عن الحق شطحا و	اور دینِ حق سے نکل جانے کا شطح اور بری
التلذذ بالمذموم طیبة و	چیزوں سے لذت لینے کا خوش طبعی، اور
اتباع الھوی ابتلاء والرجوع	خواہش کی پیروی کا امتحان، اور دنیا کیطرف
الی الدنیا وصلا وسوء الخلق	لوٹ آنے کا وصل۔ اور بد خلقی کا رعب اور
صولة والبخل جلادة والسؤال	بخل کا جوانمردی اور سوال کا عمل، اور بد
عملا و بذاءة اللسان ملامة	زبانی اور بیہودہ گوئی کا ملامت اور قوم کا
وما کان ھذا طریق القوم۔	یہ طریقہ نہیں تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان رسوم کی نسبت فرماتے ہیں۔

نسبت صوفیہ غنیمتیست کبریٰ و	صوفیہ کی نسبت تو بڑی بھاری غنیمت
رسوم ایشاں ہیچ نمیدارد ۔	ہے۔ لیکن ان کی رسوم کچھ وزن نہیں رکھتیں۔

پانچویں فصل۔ مخالفتِ شیخ

رسول اللہ[1] صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں فرمایا :۔

من عادیٰ لی ولیًا فقد اٰذنتہ	جو میرے ولی سے عداوت کرے میں
بالحرب۔ الحدیث۔	اس سے لڑائی کا اعلان کرتا ہوں۔

شیخ سے محبت وعقیدت میں فتور ڈالنا، یا اس سے بڑھ کر یہ کہ شیخ کا آزردہ کرنا مخالفت شیخ ہے۔

(۱) حضرت[2] ابن منصورؒ حضرت جنیدرح سے بیعت تھے۔ مگر حضرت جنیدؒ ان سے خوش نہ تھے۔ بلکہ ناراض تھے۔ کیونکہ ابن منصورؒ اسرار کو ظاہر کر دیتے تھے۔ ضبط نہ کرتے تھے۔ وہ اپنے کو عاجز سمجھتے تھے۔ مگر حضرت جنیدؒ جانتے تھے کہ یہ ضبط سے عاجز نہیں۔ اگر ہمت کریں

---

[1] تعلیم الدین صہ۱۲۹ ، [2] ... صہ۱۰ تا ۱۲ ملخصاً۔

تو ضبط کر سکتے ہیں (اس میں بہت سے لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے بعض دفعہ وہ اپنے کو عاجز سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ فی نفسہٖ عاجز نہیں ہوتے ۔ اس کا فیصلہ خود نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ شیخ سے رجوع کرنا چاہیئے۔ اس طریق میں اتباعِ شیخ کی سخت ضرورت ہے) اسی لیے وہ ان سے مکدر اور ناراض تھے۔ اور شیخ کی ناراضی و تکدر سے گو آخرت میں مؤاخذہ نہ ہو کیونکہ وہ نبی نہیں ہے جس کی ناراضگی سے گناہ ہو مگر تجربہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو دنیا میں کبھی چین نصیب نہیں ہوتا چنانچہ ابنِ منصور کو بھی کبھی چین نصیب نہیں ہوا عمر بھر پریشان ہی رہے۔ یہاں تک کہ انا الحق کہنے پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ تو ابنِ منصور پر حضرت جنیدؒ کے تکدر سے وبال آیا۔ گو آخرت میں وہ معتوب نہ ہوں گے۔ کیونکہ اپنے خیال میں وہ معذور تھے۔

(۲) ایک[1] مانع شیخ کی تعلیم سے زائد ٹوٹ کر مجاہدہ کرنا۔ چند روز میں گھبرا کر وہ تھوڑا تعلیم کیا ہوا بھی چھوٹ جاوے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو ایسا اتفاق ہوا۔

قال رسول الله صلى الله عليه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
وسلم خذوا من الاعمالِ	اعمال میں سے اتنا اختیار کرو کہ اکتاؤ نہیں
ما تطيقون فان الله لا يمل	کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا جب تک تم
حتى تملوا۔ رواہ الشیخان۔	نہ اکتاؤ۔

(۳) ایک[2] مانع یہ ہے کہ غلطی سے کسی بے شرع پیر سے بیعت کر لی۔ اب ساری عمر اسی کو بناہتا رہا۔ جب وہ خود واصل نہیں تو اس کو کیسے واصل کرے گا۔ حضرت بندار کا قول ہے۔

صحبة اهل البدعة تورث	بدعتیوں کی صحبت اللہ سے منہ موڑ لینے
الاعراض عن الحق۔	کا باعث ہے۔

شیخ قوام الدین فرماتے ہیں:۔

اے درویش محک و معیار این کار	اے درویش! اس کام کی اصل کسوٹی
کتاب و سنت است و سیر سلف	کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور سیر

---

[1] تعلیم الدین ص۱۲۰، [2] تعلیم الدین ص۱۲۰۔

که اہل اقتداء بودند۔ نہ اجازت مجرد
و مقام متبرک کہ فلاں فرزند درویش
است در جائے آباد اجداد خود نشستہ
و چیزیکہ از شان شیخی مخالف معیار
است آں فاسد و باطل۔ یعنی اگر
قول و فعل شیخ مخالف کتاب و
سنت و اجماع بود۔ ہیچ نہ باشد۔ آں
شیخ لائق شیخی و مقتدائے نبود۔
ہرکہ بدو اقتدا کند بمقصود نہ رسد۔

سلف ہیں جو پیشوائے دین ہیں نہ کہ محض
اجازت اور متبرک مقام کہ فلاں درویش کا
صاحبزادہ ہے۔ اپنے آباد اجداد کی جگہ پر بیٹھا
ہوا ہے اور جو چیز شیخ سے معیار کی مخالف
ہو وہ فاسد ہے یعنی اگر شیخ کا کوئی قول فعل
کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف ہو تو وہ
قول و فعل مردود اور وہ شیخ و مقتدا
ہونے کے لائق نہیں جو شخص اس کی اقتدا
کرے گا مقصود حاصل نہ کر سکے گا۔

بلکہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کامل سے بیعت کرے۔ شیخ سعدالدینؒ فرماتے ہیں۔

اگر از نادانی خود بجاہل یا باہل بدعت
ارادت آورد تجدید ارادت کند و
از دست او خرقہ پوشد تا گمراہ نشود

اگر بے وقوفی سے کسی جاہل یا مبتدع
سے مرید ہو جائے تو تجدید بیعت
کرے اور اس سے الگ ہو جائے تاکہ
گمراہ نہ ہو جائے۔

اور یہ جو مشہور ہے کہ "شیخ من خس است، اعتقادِ من بس است"۔ سو اول تو ایسے جاہل فاسق آدمی سے اعتقاد باقی رہنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ شاذ و نادر ایسا بھی ہو گیا ہے جو شخص اس فن سے ذرا بھی واقف ہے جانتا ہے کہ وصول مطلب کا طریقہ شیخِ کامل کی صحبت و تعلیم ہے۔ درویش اور شیخ کامل وہی ہے جو جامع ہو ظاہر و باطن کا تیسرے یہ کہ اس سے بے شرع پیر مراد نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر بہت بڑے درجے کا کامل نہ ہو اور شرع کے خلاف بھی نہ ہو تو یوں سمجھے کہ اگرچہ ان سے بڑھ کر اور کامل ہوں مگر میرے لیے یہی کافی ہیں اور میرا اعتقاد مجھے مقصود تک پہنچا دے گا۔

۱۰۔ علوم و مسائل

ضرورتِ علم اللہ تعالیٰ[1] نے ارشاد فرمایا :۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ

اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے ان لوگوں کے (رتبے) جو تم میں سے ایمان لائے اور ان کے جو علم دیئے گئے ہیں درجے (ان پر جو ایمان لائے اور عالم نہیں ہیں)

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے۔کیا برابر ہیں جو علم نہیں رکھتے اور وہ جو علم رکھتے ہیں۔

(ان ہر دو آیات کا مطلب یہ ہے کہ) اہلِ علم کا رتبہ غیر اہلِ علم سے بڑا ہے اور صحیح حدیث میں ہے جس کو جامع صغیر نے روایت کیا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ۔

علم کا طلب کرنا فرض ہے ہر مسلمان پر (خواہ وہ مرد ہو یا عورت)

جاننا چاہیئے کہ فرض کا چھوڑنا گناہ کبیرہ ہے اور جس کام کا کرنا بندہ پر فرض ہے اس کام کے کرنے کا طریقہ سیکھنا بھی اس کے ذمہ فرض ہے اور جس کام کا کرنا مستحب ہے اس کا طریقہ سیکھنا بھی مستحب ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو دینی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں (علم کا) بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے (بخاری و مسلم) (نیز بخاری شریف ہی کی) حدیث میں ہے۔

---

[1] بہشتی جوہر ص ۲، ۳، ۷ ج ۱

ان لم یکن الفقہاء أولیاء اللہ فی الآخرۃ فما اللہ ولی (مجنادی[1]) — اگر فقہاء (علماء دین) اولیاء اللہ نہیں ہیں آخرت میں تو کوئی خدا کا ولی نہیں۔ یعنی عالم (باعمل) ضرور ولی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم — عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی کہ میری فضیلت تمہارے میں سے ادنے آدمی پر۔

حقیقتِ علم (مندرجہ بالا آیات اور احادیث سے علم کی فضیلت اور اس کا ضروری ہونا ثابت ہوا۔ لیکن) فضیلتِ علم کا منشا یہ ہے کہ وہ شرطِ عمل ہے۔ کیونکہ عبادت بدوں علم کے نہیں ہو سکتی اور جو ہوتی ہے وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے۔ حقیقت نہیں ہوتی۔ علم[2] سے مراد یہ نہیں کہ محض الفاظ کی صحت کرلی ہو اور ان کا ترجمہ جانتا ہو۔ بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ الآیہ — اور ہم نے کر دیا اس کے لیے ایک نور جس کو وہ لوگوں کے درمیان لئے پھرتا ہے۔

(سو نور یعنی) حقیقی علم[3] وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ بدوں عمل کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس علم بدوں عمل کے جہالت ہے ۔

علمے کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است

(یعنی جو علم خدا کا راستہ نہ دکھلائے وہ جہالت ہے۔)

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت ۔ زنگ گمراہی زدل بزدایدت

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند ۔ خوف وخشیت در دلت افزوں کند

---

[1] انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۷ ، [2] نفس کو پہچاننا صفحہ ۶ [3] انفاسِ عیسیٰ صفحہ ۳۷۳

علم بنود غیر علم عاشقی ما بقی تلبیس ابلیس شقی

علم چوں بر دل زنی یارے بود علم چوں برتن زنی مارے بود

(یعنی علم وہ ہے جو تیری رہنمائی کر سکے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کر سکے۔ خواہشات نفسانی دماغ سے نکال باہر کرے۔ دل میں خوف و خشیت کا اضافہ کرے۔ علم فی الحقیقت علم عشق ہے اور اس کے ماسوا بدبخت شیطان کے مکر و فریب ہیں۔ علم جب دل میں پیوست ہوگا دوست ہوگا اور مفید ہوگا اور جب صرف بدن اور ظاہری جوارح و اعضاء تک محدود رہیگا تو وہ مانند سانپ کے ہوگا۔ یعنی سراسر مضر اور نقصان دہ ہوگا)

(جاننا چاہیئے کہ) علوم (کی دو قسمیں ہیں) عقلیہ و وہبیہ (عقلیہ وہ ہیں جو عقل سلیم سے سمجھ میں آئیں۔ اور وہبیہ وہ ہیں جو محض اللہ کی عنایت سے حاصل ہوں) جو علم یقیناً کسی قاعدۂ شرعیہ کے مخالف ہوں۔ وہ تو یقیناً باطل ہے اور جو علوم حقہ ہیں۔ ان میں دونوں قسموں میں دو دو قسمیں ہیں علم عقلی کی دو قسمیں ہیں۔ قطعی و ظنی۔ اور علم وہبی کی بھی دو قسمیں ہیں قطعی یعنی وحی اور ظنی یعنی الہام۔ پس وہبی قطعی (یعنی وحی) عقلی قطعی سے افضل ہے اور وہبی ظنی عقلی ظنی سے افضل ہے۔ خود صاحبِ علم کے لیے بھی اور اس کے متبعین کے لیے بھی۔ پس علوم منقولہ شرعیہ، دیگر علوم سے افضل ٹھہرے اور عقلی قطعی، وہبی ظنی سے افضل ہے۔ کیونکہ عقلی قطعی جس قدر اثبات حق میں قوی ہے وہبی ظنی نہیں ہے۔

ہر علم و عمل جبکہ اس کو شریعت کے ساتھ موازنہ کیا جائے تین قسم سے خالی نہیں۔ ایک قسم یہ کہ شریعت اس کا اثبات کرے۔ دوسری قسم یہ کہ شریعت اس کی نفی کرے۔ تیسرے یہ کہ شریعت اس کے اثبات و نفی سے ساکت ہو اول کو مدلولِ شرعی کہیں گے۔ دوسرے کو مردود شرعی، تیسرے کو نہ مدلول شرعی نہ مردودِ شرعی بلکہ نظر بقاعدہ کلیہ، مرویہ عن ابن عباس قال الحلال ما احل اللّٰہ فی کتابہ (ای شرعہ) والحرام ما حرم اللّٰہ فی کتابہ وما سکت عنہ فہو عفو۔ رواہ ابن ماجہ والترمذی (یعنی جس کو اللہ نے اپنی کتاب (یعنی اپنی شریعت) میں حلال

۱؎ التکشف ص ۹۳، ۴۶۷

کیا وہ حلال اور جس کو حرام کیا وہ حرام۔ اور جس سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا وہ معاف ہے ایسے علوم کو) ماذونِ شرعی کہیں گے۔ صوفیہ کے علوم و اعمال بھی انہی اقسام پر منقسم ہیں اور چونکہ قسم ثالث استدلال جزئی کا نہ محل ہے نہ محتاج۔ اس لیے قواعد شرعیہ کلیہ اس کی اباحت پر دال ہیں۔ دلائل جزئیہ کا اس پر دال نہ ہونا کچھ مضر نہیں۔ مثلاً لطائف جو عالم امر سے ہیں۔ ان کا تعلق جسد کے خاص خاص مقامات سے بتلایا جاتا ہے اور مثلاً ایک شغل میں نظر بر وہ بینی (ناک کے سرے پر جمائی جاتی ہے۔ سو اس علم کے لیے کشف اور اس عمل کے لیے تجربہ کافی ہے کیونکہ یہ کشف و تجربہ۔ بوجہ مصادم دلیلِ شرعی نہ ہونے کے ایسا ہے۔ جیسے زید کے آنے کا علم اور حبّ ایارج کا استعمال۔ جس کے لیے نص شرعی کی حاجت نہیں بلکہ ایسے امور تو اگر کسی مصلحت و ضرورت معتد بہا کی بنا پر دوسری قوموں سے بھی ماخوذ ہوں۔ بشرطیکہ ان کا شعار نہ ہوں۔ تب بھی مضائقہ نہیں۔ (جیسا کہ جنگِ احزاب میں خندق کا کھودنا وغیرہ) لیکن اگر ایسے امور کو کسی نص کے مدلول سے کسی درجہ میں، گو وہ بعید ہی ہو۔ اتفاقی توافق ہو جائے ایک گونہ تائید سے خالی نہیں۔ گو اس توافق کو استدلال نہ کہیں گے جسطرح قسمیں اولین کو کہا جاتا ہے مگر استیناس کہنا بے جا نہ ہو گا اور اہلِ ظاہر میں بھی یہ طرز بلا نکیر جاری رہا ہے۔

باب اوّل ـــــــ مسائلِ جزئیہ

۱: شرع کی جو میزان دنیا میں موجود ہے وہ وہی ہے جو علماء کے ہاتھ میں ہے پس جب کوئی ولی، عقلی تکلیف کے ہوتے ہوئے اس میزان سے خارج ہو گا اس پر اطاعت امر واجب ہو گا۔ البتہ اگر کوئی حال غالب ہو گا تو اس کے لیے اس حال کو مسلم رکھیں گے اور اعتراض نہ کریں گے کیونکہ کوئی عقلمند آدمی ایسے شخص کا اتباع نہ کرے گا لیکن اگر اس سے

ـلـه تجدید تصوف و سلوک صـ۲۱۲ ، عـه ایک دوائی کا نام ہے۔ ۱۲

ـسه انسیت و تعلق۔

کوئی ایسا امر ظاہر ہو جو ظاہر شریعت کی رو سے موجب حد ہو اور وہ امر حاکم کے نزدیک بھی ثابت ہو جائے تو اس پر حد کی جائے گی۔

۲:۔ آدمی خدا[1] کا کیسا ہی پیارا ہو جاوے مگر جب تک ہوش و حواس درست ہیں شرع کا پابند رہنا فرض ہے۔ نماز، روزہ اور کوئی عبادت معاف نہیں ہوتی اور جو گناہ کی باتیں ہیں وہ اس کے لئے درست نہیں ہو جاتیں۔

۳:۔ اللہ اور رسول نے دین کی باتیں قرآن و حدیث میں بندوں کو بتلا دیں اب کوئی نئی بات نکالنا دین میں درست نہیں۔ ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں۔ بدعت بہت بڑا گناہ ہے۔ البتہ بعض باریک باتیں دین کی جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگلے عالموں نے اپنے علم کے زور سے قرآن و حدیث سے سمجھ کر دوسروں کو بھی بتلا دیں۔ ایسے لوگ مجتہد کہلاتے ہیں۔ مجتہد تو بہت ہوئے مگر چار ان میں بہت مشہور ہیں۔ امام اعظم[1] ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ[2]، امام مالکؒ[3]، امام احمد بن حنبلؒ[4] جس کو جس مجتہد سے زیادہ اعتقاد ہوا۔ اس کی پیروی اختیار کر لی۔ ہندوستان (و پاکستان) میں امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کرنے والے زیادہ ہیں۔ وہ حنفی کہلاتے ہیں اسی طرح نفس کے سنوارنے کے طریقے قرآن و حدیث کے موافق ولی لوگوں نے اپنے دل کی روشنی سے سمجھ کر بتلائے۔ ایسے لوگ شیخ کہلاتے ہیں۔ شیخ بہت ہوئے مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ، جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کرے۔ دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں۔ اور مجتہد اور شیخ کی پیروی کا اس وقت تک ہے جب تک ان کی بات خدا اور رسولؐ کے خلاف نہ ہو۔

۴:۔ مقصود[2] سلوک، رضائے حق ہے اور اس کے بعد دو چیزیں ہیں۔ طریق کا علم اور اس پر عمل۔ سو طریق صرف ایک ہی ہے یعنی احکام ظاہرہ و باطنہ کی پابندی۔ اور اس طریق کی معین دو چیزیں ہیں۔ ایک ذکر جس پر دوام ہو سکے۔ دوسرے صحبت اہل اللہ کی جس کثرت سے مقدور ہو

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۱۰۰ [2] کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۲۶

اور اگر کثرت کے لیے فراغت نہ ہو تو بزرگوں کے حالات و مقالات کا مطالعہ اس کا بدل ہے اور دو چیزیں طریق یا مقصود کی مانع ہیں۔ معاصی اور فضول میں مشغولی۔ اور ایک امران سب کے نافع ہونے کی شرط ہے۔ یعنی اطلاعِ حالات کا التزام۔ اب اس کے بعد اپنی استعداد ہے۔ حسبِ اختلاف استعداد مقصود میں دیر سویر ہوتی ہے۔ یہ سارے طریق کا خلاصہ ہے۔

۵ :۔ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ جاتے رہیں حمیدہ پیدا ہو جائیں معاصی چھوٹ جائیں۔ طاعت کی توفیق ہو جائے غفلت من اللہ جاتی رہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔

۶ :۔ جن[1] مسائل کا تعلق اصلاحِ نفس سے ہے۔ کسی تصوف کی کتاب میں دیکھ کر اس پر عمل کرنا اس شرط سے درست ہے کہ فہم میں یا حدودِ شرعیہ میں غلطی نہ ہو۔ لیکن ان غلطیوں کا احتمال عادۃً غالب ہے۔ اس لیے بدون کسی شیخ مبصر کے مشورہ کے خود عمل مناسب نہیں۔

۷ :۔ عبادت[2] میں بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔

۸ :۔ محققین[3] نے تصریح کی ہے کہ اخلاص سب اخلاق حمیدہ کے بعد میسر ہوتا ہے اور ریا سب اخلاقِ ذمیمہ کے بعد جاتا ہے۔

ریا ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتا۔ کیونکہ ریا کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس کی عادت ہو جاتی ہے اس میں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا۔ پھر وہ اخلاص سے قریب ہو جاتا ہے۔

بزرگوں[4] کا دل خوش کرنے کیلئے اگر کوئی طاعت یا خدمت اچھی طرح کی جائے کہ مخلی بالطبع

---

[1] کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۸۲ [2] دعواتِ عبدیت صفحہ ۴۷ ج ۱ [3] اشرف المسائل صفحہ ۹۱،۸۰
[4] التکشف صفحہ ۲۰۷ ؛

ہو کر اس طرح نہ کرتا تو ظاہراً اس میں ریا کا شبہ معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ تطییب قلب اہل اللہ بلکہ مطلق مسلم، خود عبادت ہے تو اس کی حقیقت یہ ہوئی کہ ایک عبادت کو دوسری عبادت کے واسطے اچھی طرح کرتا ہے۔ اس لیے ہرگز یہ ریا نہیں ہے۔ حدیث میں اس کے استحسان پر صاف دلالت ہے (جیساکہ) برقانی کی روایت میں مسلم سے ہے کہ ابو موسیٰؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میرا قرآن سن رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر اس کو خوب ہی بنا تا سنوارتا (یعنی خوب اچھی طرح سے پڑھتا)۔

۹ :۔ کسی پر تشدد یا قطع تعلق کرنے میں مفسدہ کا اندیشہ ہو اور اس کی طرف سے ایذا کا خوف ہو۔ اور اپنے اندر تحمل کی طاقت نہ ہو۔ تو اس کو امر بالمعروف سے سکوت کی اجازت ہے باقی جس کو ہمت ہو اس کو سکوت کی اجازت نہیں۔

۱۰ :۔ حمایتِ الٰہی اس وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راسخ ہوں۔

۱۱ :۔ امید و رجا وہی ہے جو عمل کے ساتھ ہو ورنہ غرور ہے۔

۱۲ :۔ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہیں اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں مثلاً مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کرلینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر پریشان نہ ہو۔ اسی طرح نعمتوں پر بطر و تکبر نہ ہو۔ ان کو اپنا کمال نہ سمجھے۔ مثلاً توحید کے عقیدہ سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور ان سے طمع نہ رہے۔

۱۳ :۔ مشہور ہے کہ بزرگوں کو کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور رہتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا اجر بڑھانا ہوتا ہے۔ اگر بلا نہ ہو تو وہ اعمال کا اجر تو حاصل کر سکتے ہیں مگر بلا و مصیبت پہ جو اجر ملتا ہے اس کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں اور بلا سے مراد اگر بلائے ظاہری ہو۔ جیساکہ متبادر یہی ہے۔ تب تو یہ اکثری ہے کلی نہیں۔ کیونکہ جن بزرگوں میں ضعف طبیعت کے سبب جو کہ فطری ہے تحمل نہیں ہوتا اور بلا ان کیلئے مضر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ رکھتے

لے کمالات اشرفیہ صا۳۱، ۱۰۲، ۱۸، ۹۹، ۱۰۷، ۲۸

ہیں۔ اور اگر بلا سے مراد عام بلا مراد ہو کہ بلائے باطنی کو بھی شامل ہو تو یہ حکمِ کلی ہے۔ باطنی احوال سب اہلِ طریق کو ایسے پیش آتے ہیں کہ دوسرا شخص ان کا تحمل نہیں کر سکتا جیسے خشیت، فکرِ آخرت۔ اللہ کی عظمت،

۱۴:۔ اصل مصیبت وہ ہے جس سے دل میں پریشانی اور بے چینی پیدا ہو۔ پس جو شخص بیمار ہو اور دل کو پریشان پائے اس کے حق میں یہ مرض مصیبت ہے اور اگر دل پریشان نہیں ہوتا۔ بلکہ صابر و شاکر ہے۔ تو یہ ہرگز مصیبت نہیں۔ بلکہ موجب رفع درجات ہے۔

۱۵:۔ غم سے نفس کو تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن روح میں نور پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ مجاہدہ ہے گو اضطراری ہی۔ اور مجاہدۂ اضطراری بھی موجبِ اجر ہے۔ اس بارے میں حدیثیں صریح طور پر موجود ہیں۔ چنانچہ مرض فکر اور بلا پر بشارتیں وارد ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے لئے دعا و تدبیر کا بھی امر ہے پس دعا و تدبیر بھی کرنی چاہیئے۔ اور غم کے فضائل پر نظر کر کے صبر و رضا بھی اختیار کرنا چاہیئے۔

۱۶:۔ مصائب[۱] درحقیقت سب تجارت میں داخل ہیں کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دی جاتی ہے۔ مصیبت حالاً تو مصیبت ہے مگر مآلاً نعمت ہے کیونکہ اس سے منافع و مصالح دینیہ و دنیویہ حاصل ہوتے ہیں۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ برسوں کے مجاہدات سے باطن کو نفع نہیں ہوتا جو ایک ساعت کے حزن سے ہوتا ہے۔ خاص کر ایمان کی پختگی ہوتی ہے جو امور باطنہ میں سب سے افضل ہے۔

۱۷:۔ گناہ[۲] کی حقیقت اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کی نافرمانی ہے اور ظاہر ہے کہ نافرمانی گو کسی قسم کی ہو۔ زیادہ ہی بڑی ہے اور گناہوں کو درجات میں جو چھوٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امر اضافی ہے کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے اور دوسرا اس سے چھوٹا۔ ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ بڑے ہی ہیں۔ کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیئے۔ گناہ کو ہلکا سمجھنا ضعف ایمان کی علامت ہے۔

---

[۱] انفاسِ عیسیٰ ص ۲۱۷ ، [۲] دعواتِ عبدیت ص ۵۸

گناہ[1] میں جو لذت ہے اس کی مثال کھجلی جیسی ہے کہ خود اس میں لذت نہیں محض مرض کی وجہ سے لذت معلوم ہوتی ہے۔ پھر فوراً ہی سوزش پیدا ہوتی ہے سو یہ دراصل مرض ہے جیسا سانپ کے کٹے ہوئے کو کڑوا بھی میٹھا معلوم ہونے لگتا ہے۔

۱۸:۔ بندہ اگر اس وجہ سے توبہ نہ کرے کہ میرے گناہ اس قدر ہیں کہ توبہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ بھی حماقت اور شیطان کا جال ہے۔ کیونکہ گو یہ صورۃً شرمندگی ہے لیکن حقیقت میں یہ کبر ہے کہ اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ گویا اس نے حق تعالیٰ کا کچھ نقصان کر دیا ہے کہ اب اس کو وہ معاف نہیں کر سکتے۔

۱۹:۔ ظاہری اعمال پر بزرگوں کی زیادہ نظر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کی اصلاح تو ایک منٹ میں ہو سکتی ہے یہ تو محض ارادہ کا بدلنا ہے۔ بے نمازی ایک منٹ میں نمازی ہو سکتا ہے فاسق فاجر ایک منٹ میں متقی بن سکتا ہے لیکن بڑی چیز جن پر بزرگوں کی نظر ہوتی ہے اخلاقِ باطنہ ہیں مثلاً تکبر وغیرہ ان کی اصلاح نہایت دشوار ہوتی ہے۔

۲۰:۔ تجربہ[1] ہے کہ چند روز میں رذائل کے خلاف کرنے سے اس عمل کی عادت اور مشق ہو جاتی ہے۔ پھر رذیلہ کے خلاف کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ بلکہ رذیلہ کمزور رہ جاتا ہے۔

۲۱:۔ گناہوں کی وجہ[2] سے بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے۔

۲۲:۔ حسد[3] وہ ہے جس میں محسود سے زوالِ نعمت کی تمنا ہو اور غبطہ (یا رشک) وہ ہے کہ اس کے پاس رہتے ہوئے اپنے لیے حصول کی تمنا ہو۔ (اوّل حرام اور ثانی جائز ہے)۔

۲۳:۔ حدیث[4] میں ہے اکثر من اکلۃ کل یوم سرف یعنی ایک دن میں ایک بار سے زیادہ کھانا اسراف ہے۔ چونکہ اسراف حاجت اور اباحت کے ساتھ جمع نہیں ہوتا۔ اس لیے حدیث اس صورت پر محمول ہوگی۔ کہ جب دوسری بار بدون بھوک کے کھائے جیسے اہلِ تنعم، خادمانِ شکم کی عادت ہے کہ محض ادائے حق کے لیے کھاتے ہیں۔

۱؎ کمالاتِ اشرفیہ ص۴۴، ۲۵۹ ، ۲؎ انفاسِ عیسیٰ ص۱۲۴، ۳۵۵ ۳؎ انفاسِ عیسیٰ ص۱۷۰

۴؎ کمالاتِ اشرفیہ ص۱۳، ۱۲۵

۲۴ :- مبہم بات (جس سے مقصود سمجھ میں نہ آئے) سنت کے خلاف ہے ۔ صاف کلام کرنا سنّت ہے ایسا کلام کہ مقصود پر دلالتِ مطابقی رکھتا ہو۔

۲۵ :- حق[۱] تعالیٰ کا قرب و معیت اصل میں بے کیف ہے نہ اس کو قربِ ذاتی کہہ سکتے ہیں قربِ مکانی۔ بعض متکلمین اس کو قربِ صفاتی کہتے ہیں یعنی قربِ علمی۔ لیکن سلف کا مسلک یہی ہے کہ صفاتِ الٰہیہ میں تعیین نہیں کرتے بلکہ ابہموا ما ابہمہ اللہ تعالیٰ۔ (جس کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اسے مبہم رکھو) پر عمل کرتے ہیں اور بعض اکابر کے کلام میں جو اس قرب کی تعبیر بعنوان موہمہ للتقیید آتی ہے مقصود تقیید نہیں بلکہ مقصود تشبیہ بغرض تفہیم ہے۔

۲۶ :- کیفیات[۲] کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہو جاتی ہے ۔ عاقلوں کو خاص کر صاحب ذکاوتِ مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ان کا دماغ ہر وقت حرکتِ فکریہ میں رہتا ہے۔

۲۷ :- اہلِ حق[۳] کے تصرفات اتنے قوی نہیں ہوتے جتنے اہلِ باطل کے تصرفات قوی ہوتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ تصرفات کے اثر کی قوت کا دارومدار قوتِ خیالیہ پر ہے اور خیال میں قوت، یکسوئی سے ہوتی ہے اور اہلِ حق کو اس خیال میں جو غیر ذاتِ حق کے متعلق ہو۔ زیادہ یکسوئی نہیں ہوتی۔

۲۸ :- دل[۴] کی بات بتا دینا، یہ علمِ غیب نہیں بلکہ کشف ہے۔ علمِ غیب اس علم کو کہتے ہیں جو بلا وسائط ہو اور یہ خاصۂ خداوندی ہے اور جو علم بذریعہ کشف ہو اس میں کشف واسطہ ہے اس لیے وہ علمِ غیب نہیں۔

۲۹ :- فتوحاتِ مکیہ میں ہے کہ ابو یزید بسطامی سے طیِ ارض کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ یہ کچھ نہیں ہے یعنی قبولیت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ ابلیس مشرق سے مغرب تک ایک دم میں قطع کر جاتا ہے اور اللہ کے نزدیک اس کا کچھ بھی مرتبہ نہیں اور ہوا پر اڑنے کو پوچھا گیا

---

[۱] التکشف ص۳۶۱ [۲] اشرف المسائل ص۷۵ [۳] القول الجلیل ص۳ جلد دوم
[۴] التکشف ص۶۰ ،

تو فرمایا کہ چڑیاں ہوا پر اڑا کرتی ہیں۔ اور جب مؤمن ان سے افضل ہے تو ایسی چیز کرامت کیسے شمار کی جا سکتی ہے جس میں چڑیاں شریک ہوں اور فرمایا کہ اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ بہت کرامتیں دیا گیا ہو یہاں تک کہ ہوا میں اڑتا ہے تو تم دھوکے میں نہ آجاؤ۔ اس کے معتقد نہ ہو جب تک اس کو نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور حفظ حدود اور پابندی شریعت میں کیسا ہے۔

۳۰:۔ سکرا اور غلبے میں صوفی کے منہ سے کچھ نکل جائے تو اس پر اعتراض نہ کرو اور نہ ہی اس کی تقلید کرو طریق اسلم سکوت ہے باقی وہ بات ضرور قابلِ اعتراض ہے خصوصًا جبکہ عوام کو مضر ہو اس وقت اس کی غلطی ظاہر کر دینا واجب ہے۔ (تعـ۱۱۱)

۳۱:۔ الاستقامۃ فوق الکرامۃ (استقامت یعنی اعمالِ شرعیہ کی پابندی کرامت سے بڑھ کر ہے۔)

باب دوم ـ اِصلاحات

۱:۔ اس زمانے میں نماز و قرآن کی حد سے زیادہ بے قدری ہو رہی ہے۔ عوام کیا خواص بھی بہت ہی کم ہیں جو ٹھیک طور پر نماز کے خصوصًا جماعت کے پابند ہوں بلکہ بہت سے فقیروں کا تو یہ گمان ہے کہ باطنی نماز کافی ہے۔ ظاہری نماز کی کیا ضرورت ہے تو یہ صاف فرضیتِ نماز کا انکار کرنا ہے جس سے یقینًا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ پھر جو ان میں پڑھے ہوئے ہیں وہ قرآن مجید کی آیتوں کی تحریف کرتے ہیں۔ کہیں الذین ھم فی صلاتھم دائمون (وہ لوگ کہ اپنی نماز پر مداومت کرتے ہیں) سے استدلال ہے کہ دیکھئے صاحب صلوٰۃ ظاہری تو دائم ہو نہیں سکتی۔ پس صلوٰۃ باطنی مراد ہے کہیں لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ سے تمسک ہے کہ گو نماز بھی اچھی چیز ہے مگر ذکر اللہ اس سے بھی اکبر ہے۔ سو اکبر کے ہوتے ہوئے اصغر کی کیا حاجت ہے۔ صاحبو! یہ صریح الحاد ہے۔ ایک موٹی بات تو یہی ہے کہ تمہارے پہلے

---

۱ تعلیم الدین صـ۹۴ پر حاشیہ و صـ۱۱۳ ۲ طریق القلندر صـ۱۵

۳ تعلیم الدین صـ۸۹، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۱۰

پیروں نے اور سب پیروں کے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں نہیں سمجھا کیوں نہیں کیا۔ تمام عمر ایسے فعل کے پابند رہے۔ دوسرے تمام قرآن وحدیث عمومِ فرضیت سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں نہ کسی آدمی کی تخصیص ہے نہ کسی حالت کا استثنار بجز ان لوگوں کے جو قاعدۂ شرعی سے مرفوع القلم ہیں۔ رہا استدلال آیاتِ مذکورہ سے، وہ محض لچر ہے اوّل تو یہ کہنا کہ صلوٰۃ ظاہری دائم نہیں ہو سکتی غیر مسلم ہے۔ ہر چیز کا دوام اس کے مناسب ہوتا ہے مثلاً اگر کہا جاوے کہ فلاں شخص ہمارے پاس ہمیشہ آتا ہے تو کیا ضرور ہے کہ وہ ہر وقت آنے ہی میں مشغول رہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو وقت اس کے آنے کا متعین ہے اس میں بلا ناغہ آتا ہے۔ اسی طرح نمازِ ظاہری کا دوام سمجھ لو کہ اپنے معین اوقات میں ناغہ نہ ہونا ہی دوام ہے دوسرے اگر تسلیم کیا جائے کہ نماز باطنی ہی مراد ہے تو چلو یہ بھی فرض سہی مگر اس سے نماز ظاہری کا فضول ہونا کس طرح معلوم ہوا۔ نماز باطنی اس آیت سے فرض، نماز ظاہری دوسری آیت سے فرض۔ دونوں ادا کیا کرو اور یہ کہنا کہ ذکر اللہ نماز سے بھی بڑھ کر ہے تو اکبر کے سامنے اصغر کی کیا حاجت یہ بھی محض مہمل تقریر ہے اول تو لذکر اللہ اکبر کی یہ تفسیر متعین نہیں بلکہ ممکن ہے کہ نماز کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہو کہ نماز میں فلاں فلاں برکت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر اللہ یعنی اللہ کی یاد ہے اور اللہ کی یاد ہی بڑی چیز ہے اس لیے نماز میں یہ برکت ہوئی۔ سو اس تقریر پر تو اس میں نماز کی ترغیب ہے نہ کہ تنقیص۔ اور اگر وہی تفسیر مان لیجاوے تو یہ کیا ضروری ہے کہ اکبر کے ہوتے اصغر کی حاجت نہ ہو۔ بھلا اگر دونوں فرض ہوں تو کیوں نہیں حاجت ہو گی۔ مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بڑا۔ ایک چھوٹا تو بس اسی قاعدے سے کہ اکبر کے ہوتے اصغر کی کیا حاجت ہے چھوٹے بیٹے کا گلا گھونٹ کر کام تمام کر ڈالنا چاہیئے۔ اللہ تم فہم سلیم عطا فرمائیں۔

قرآن وحدیث[1] کے ظاہری معنی کا انکار کرنا کفر ہے۔ البتہ ظاہر کو تسلیم کرنا اور اس کے باطن کی طرف غور کرنا محققین کا مسلک ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے نہیں جاتے۔ اہلِ ظاہر نے تو کتا پالنے کو بُرا سمجھا۔ مگر دل میں صفات کلبیہ کو ہمیشہ جمع رکھا۔ ان

---

[1] تعلیم الدین ص ۱۱۴، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۱، ۱۲۲،

ہیں تو یہ کسر وہی گمراہیاں موجود ہے جس سے مرپٹ کر جنت تو مل جائے گی۔ منکرین ظاہر نے کتا پالنے کی اجازت دے دی اور کہا کہ مولوی لوگ حدیث کا مطلب نہیں سمجھے۔ بیت (گھر) سے مراد قلب ہے اور ملائکہ سے مراد انوار غیبیہ اور کلب سے مراد صفات سبعیہ وغیرہا۔ یہ لوگ شرع کا انکار کر کے کافر اور مستحق جہنم ہوئے۔ محققین نے کہا کہ مطلب تو حدیث کا وہی ہے جو اہل ظاہر سمجھے۔ مگر اس میں غور کرنا چاہیئے کہ ملائکہ کو کتے سے کیوں نفرت ہے؟ صرف اس کے صفات ذمیمہ سبعیہ و نجاست و حرص و غضب وغیرہ کی وجہ سے تو معلوم ہوا کہ یہ صفات مذموم ہیں۔ پھر جب ظاہری گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں تو باطنی گھر میں ان صفات کا رکھنا کیسے جائز ہوگا۔ ان محققین نے ظاہراً کتا پالنے کو بھی حرام کہا۔ کیونکہ وہ مدلول مطابقی ہے اور باطناً ان صفات مذمومہ کے ساتھ متصف ہونے کو بھی حرام کہا۔ کیونکہ وہ مدلول التزامی ہے۔

۲:- احادیث کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاطی ہوتی ہے۔ حدیث کی تحقیق علمائے حدیث سے کرنی چاہیئے۔ یہ کسی طرح درست نہیں کہ کسی اردو فارسی کی کتاب یا کسی عربی کی غیر معتبر کتاب میں حدیث کا نام دیکھ لیا اور اس سے استدلال شروع کر دیا۔ بہت سی عجیب و غریب حدیثیں جن کا کہیں پتہ نہیں مشہور ہیں۔ جیسے انا عرب بلا عین اور مثل اس کے جن کے نہ الفاظ کا پتہ نہ معانی کا نشان۔ حدیث شریف میں اس بارے میں سخت وعید آئی ہے۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ	جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ
مقعدہ من النار	باندھا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ بنالے۔

اسی قبیل سے یہ دعویٰ کرنا کہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کئی ہزار کلمات تصوف کے جو شب معراج میں آپؐ لائے تھے، سب سے علیحدہ تلقین فرماتے اور کوئی اس قابل نہ تھا۔ اس دعوے میں کتنے جھوٹ جمع ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ کئی ہزار کلمات تصوف کے معراج میں عطا ہوئے۔ مدعی کو اس کی اطلاع کس طرح ہوئی۔ وہاں تو اس قدر اہتمام ہے کہ فرشتے تک کو اطلاع نہیں ہوئی۔ یہ کہاں کھڑے سنتے تھے۔ جبلا اسے مقام کا راز کس کو معلوم

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

۳ :- دوسرا جھوٹ یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپؐ نے تلقینِ خفیہ فرمائی ۔ خود حضرت علی رضؓ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں بتلائی ہیں ؟ آپ نے نہایت اہتمام سے اس کا انکار فرمایا ۔ اور ارشاد فرمایا کہ ہمارے پاس کوئی خاص چیز نہیں مگر قرآن کا سمجھنا جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوتا ہے سو یہی فہم تفردتھا ۔ اسی نورِ نسبت کا جو بدولت صحبتِ نبوی صلعم آپ کے سینے میں پہنچی تھی اور وہی اب تک سینہ بسینہ منتقل ہوتی آئی ۔ یہی معنی ہیں اس قول کے کہ "تصوف سینہ بسینہ آتا ہے" یہ نہیں کہ حضرت سرورِ عالم سے کچھ پوشیدہ باتیں کانا پھوسی کے ذریعے سے اب تک آرہی ہیں ۔ اگر ایسے بے اصل دعوے کا اعتبار کیا جائے تو تمام کارخانہ ہی درہم برہم ہوا جاتا ہے ۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میاں کتابوں میں گو لکھا ہے کہ حاتم بڑا سخی تھا مگر یہ علمِ سفینہ ہے اور مجھ کو اپنے بزرگوں سے سینہ بسینہ راز پہنچا ہے کہ وہ بڑا کنجوس تھا مگر یہ بات کسی سے کہنا نہیں ورنہ خشک مُلّا تم کو جھٹلائیں گے ۔ اسی طرح جس چیز کو چاہو سینہ بسینہ لے آؤ پھر کس چیز کا اعتبار رہیگا ۔

۴ :- تیسرا جھوٹ یہ کہ سب صحابہ کرام کو نعوذ باللہ ناقابل ٹھہرایا ۔ اور قرآن و حدیث سے صحابہ کے خصوصاً خلیفۂ اوّل کے فضائل دیکھو تو سب اشتباہ جاتا رہے ۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ فاضل ترینِ ہمہ امت حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اند و سید اہلِ تجرید پادشاہ اہلِ تفرید مشائخ ایشاں را مقدم ارباب مشاہدہ میدارند (جواہر غیبی)

۵ :- ایک غلطی یہ کہ جس طرح حق تعالیٰ کا دیدار جنت میں ہوگا اسی طرح دنیا میں دیدار کے قائل ہیں ۔ جاننا چاہئے کہ قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ دنیا میں دیدار کی تمنا کی اور لَن تَرَانِی جواب سنا ۔ حدیث شریف میں موجود ہے انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا ۔ یعنی موت سے پہلے کبھی خداوند کریم کو نہ دیکھو گے ۔ دوسری حدیث میں ہے ۔

حجابہ النور لو کشفہ لا حترقت　　اس کا حجاب نور ہے اگر اسے اٹھادے تو

سبحات وجهه ما انتهی الیه — اس کے انوارِ ذاتیہ حد بصر تک خلقت کو
بصرہ من خلقه . رواہ مسلم — جلا دیں۔ یعنی کل خلقت کو

اب قرآن و حدیث کے بعد اور کونسی چیز ہے جس پر یقین آئے۔

قال الله تعالیٰ فبای حدیث — اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اب اس کے بعد کس
بعدہٗ یؤمنون — بات پر ایمان لاویں گے۔

۶:۔ بعض کا اعتقاد ہے کہ فقیری میں کوئی ایسا درجہ ہے کہ وہاں پہنچ کر احکامِ شرعی ساقط اور معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ اعتقاد صریح کفر ہے جب تک ہوش و حواس قائم ہیں ہرگز احکامِ شرعی معاف نہیں ہو سکتے۔ البتہ بے ہوشی میں معذوری ہے۔ حضرت ابراہیم بن شیبانؒ فرماتے ہیں:۔

علم الفناء والبقاء یدور علی — فناء و بقاء کا علم، واحدانیت کے اخلاص
اخلاص الواحدانية وصحة — اور عبودیت و عبادت کی درستگی پر منحصر
العبودية وما كان غير — ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ اغلاط
هذا فهو المغاليط والزندقة — اور بد دینی ہے۔

بعض جہلاء ایک عجیب دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ ہماری نسبت ایسی قوی ہے کہ گناہ سے بھی اس میں فتور نہیں آتا اور بعضے کہتے ہیں کہ ہم کو لونڈوں، رنڈیوں کے گھورنے سے ترقی ہوتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نسبت جس کو معصیت سے ترقی ہو، شیطانی نسبت ہے اور ایسی ترقی کو مکر و استدراج کہتے ہیں۔

شارحِ گلشنِ راز فرماتے ہیں کہ محض اہلِ کمال کی تقلید سے بدوں غلبۂ حال کے خلافِ شریعت کلمات منہ سے نکال کر کافر مت بنو۔

ترا گر نیست احوالِ مواجید — مشو کافر بنا دانی بہ تقلید

(یعنی اگر وجد کی حالت تجھ میں نہیں ہے تو جہالت سے تقلید کر کے کافر مت ہو۔)

۷:۔ جس طرح اولیاء کے آداب میں تقصیر ممنوع ہے۔ اسی طرح افراط و غلو اور بھی بدتر ہے کہ اس میں اللہ اور رسول کی شان میں تفریط ہوتی ہے۔ مثلاً عالم الغیب سمجھنا اس سے کفر

لازم آتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ لا یعلم من	اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو آسمان اور زمین میں
فی السموٰت والارض	ہیں ۔غیب کی بات نہیں جانتے مگر اللہ
الغیب الاّ اللہ ، وقل لا	اور فرمایا ۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دو کہ
اقول لکم عندی	میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ
خزآئن اللہ ولا اعلم	کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب کی بات
الغیب ۔	جانتا ہوں ۔

یا ان کو کسی چیز کے موجود یا معدوم کر دینے پر یا اولاد ورزق وغیرہ دینے پر یا خدا سے زبردستی دلا دینے پر قادر سمجھنا کفر ہے ۔

قل لا املک لنفسی	اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!
نفعا ولا ضرًّا اِلاّ ما شآء	کہہ دو کہ میں اپنے لیے نفع اور ضرر کا مالک
اللہ ۔	نہیں ہوں مگر جتنا اللہ چاہے ۔

یا ان کے ساتھ عبادت کے طریقوں میں کوئی طریق برتنا مثلاً ان کی منت ماننا ۔ یا ان کا یا ان کی قبر کا طواف کرنا ، یا ان سے دعا مانگنا ، یا ان کے نام کو عبادۃً جپنا ، یہ سب بعض معصیت و بدعت کے اور بعض کفر و شرک کے طریقے ہیں ۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین	ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے
و قال رسول اللہ صلی اللہ	ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
علیہ وسلم طواف البیت	طواف کرنا نماز کے مثل عبادت ہے ۔
صلوٰۃ وقال الدعآء ھو	اور فرمایا ۔ دعا مانگنا بھی بڑی عبادت ہے
العبادۃ ثم تلا قولہ تعالیٰ	پھر اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تلاوت فرمائی
وقال ربکم ادعونی	" اور تمہارے رب نے فرمایا ۔ مجھ سے مانگو میں
استجب لکم ان الذین	قبول کروں گا ۔ بیشک جو لوگ میری عبادت
یستکبرون عن عبادتی	سے تکبر کرتے ہیں ۔ عنقریب جہنم میں ذلیل

سیدخلون جھنم داخرین ہو کر داخل ہوں گے اور فرمایا۔ جن کو تم
وقال والذین تدعون من پکارتے ہو اللہ کے سوائے وہ تمہارے
دون اللہِ عباد امثالکم۔ مثل بندے ہیں؛

مشائخ کی تعظیم و اطاعت میں ایسا غلو کرنا کہ وہ خلافِ شرع بات کا حکم کریں جب بھی ان کی اطاعت کیجائے یہ بھی ارضلِ خلق میں داخل ہے جو ایک مرض ہے۔

۸ :۔ اگر شیخ کی مجلس میں بھی غیبت ہونے لگے تو فوراً اٹھ جاؤ۔ جیسے بارش عمدہ چیز ہے۔ اس میں نہانا مفید بھی ہے۔ مگر اگر اولے پڑنے لگیں تو بھاگنا ہی چاہیئے۔

۹ :۔ فاسق و کافر صاحبِ نسبت نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ غلطی سے نسبت کے معنی خاص کیفیات کو (جو ریاضت و مجاہدہ کا ثمرہ ہوتا ہے) سمجھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہر مرتاض میں ہو سکتی ہے مگر یہ اصطلاح جہلاء کی ہے۔

۱۰ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[۲] کہ کسی شخص کو یہ جائز نہیں کہ وہ (میری نسبت) یوں کہے (میں حضرت یونس بن متی سے اچھا ہوں۔ حضرت یونس علیہ السلام کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ ان کے قصہ میں ظاہراً شبہ توجہ عتاب کا ہوتا ہے جس سے مفضولیت کا حکم کیا جاتا ہے اور اس بنا پر مفضولیت کا حکم کرنا ظاہر ہے کہ موجب یا موہم تحقیر کو ہے۔ اس لیے نہی فرمائی گئی ہے پس حدیث میں اس پر صاف دلالت ہے کہ بعض لوگوں کو جو عادت ہے کہ اپنے سلسلہ کو یا شیخ کو اس طرح بڑھاتے ہیں کہ دوسروں کی تنقیص لازم آتی ہے یا بعض اس کی تصریح کر دیتے ہیں۔ یہ عادت واجب الاصلاح ہے۔ ہاں نفس اعتقادِ فضیلت جائز ہے مگر غیر مورد نص میں ظن کی اجازت ہے یقین جائز نہیں۔ اور اگر صرف محبت یعنی میلان قلب ایک طرف زائد ہے۔ تو بوجہ اس کے امر طبعی ہونے کے خود دائرہ تکلیف سے خارج ہے اور موجب ملامت نہیں۔

۱۱ :۔ اگر کوئی شخص[۳] حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے قصہ سے استدلال کرے کہ انھوں نے باوجود حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کے "کہ دعا کرو" دعا

---

[۱] انفاس عیسیٰ ص ۱۱،۲۷۲۲ [۲] التکشف ص ۳۹۶ [۳] دعوات عبدیت ص ۳۶ ج ۱

نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کرنا، رضا بالقضاء اور تفویض و تسلیم کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قصہ پہلی امت کا ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا نہیں جو ہم پر حجت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ صاحبِ وحی تھے۔ ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس وقت دعا کرنا خلافِ رضا ہے۔ اس وقت غلبۂ حال میں تفویض اور تسلیم کی فضیلت منکشف تھی اور دعا کی فضیلت مستور، اور ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر وقت تفویض و تسلیم اور رضا کو جمع فرمایا۔ اور اکثر بزرگوں سے غلبۂ حال میں اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ جن کی نہ تقلید درست ہے نہ ان کی باتوں میں استدلال کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر انکار درست ہے۔ وہ معذور ہیں۔

۱۲:۔ ایک[1] غلطی یہ ہے کہ زبان اور پیٹ کی احتیاط نہیں کرتے۔ یعنی زبان سے جو کلمہ چاہتے ہیں بے باک ہو کر نکال دیتے ہیں۔ خواہ اس سے کفر ہو جائے یا حق تعالیٰ کی جناب میں بے ادبی اور گستاخی ہو جائے۔ خصوصاً وحدۃ الوجود کے دعویٰ میں تو زبان کو لگام ہی نہیں۔ کبھی خدا کو بندہ بنا دیا۔ کہیں بندے کو خدا ٹھہرا دیا۔ اس مسئلہ کی تو ہوا بھی نہیں لگتی۔ زبانی جمع خرچ سے کیا ہوتا ہے اور شکم کی بے احتیاطی یہ کہ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ سود خوار، زنِ بازاری، جو کوئی بھی ہو، سب کی دعوت و نذرانہ قبول کر لیتے ہیں۔ بزرگوں نے صاف فرما دیا ہے کہ بدوں اکلِ حلال، انوارِ الٰہی نصیب نہیں ہوتے۔

۱۳:۔ (ذکر میں) نفس[2] جہر تو نصوصِ کثیرہ سے ثابت ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ البتہ کلام جہر مفرط میں ہے۔ سو بعضے غالی اس کو قربتِ مقصودہ سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ نفع ذکر کا اسی پر موقوف ہے اور اسی وجہ سے ان کو کسی کی راحت و ایذا کی بھی پرواہ نہیں ہوتی اور بعضے متشدد اس کو مذموم و بدعت سمجھتے ہیں۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ نہ قربت ہے نہ بدعت جبکہ اس کے قربت ہونے کا اعتقاد نہ کرے بلکہ اس کو معالجہ سمجھے۔ کیونکہ اس میں تجربہ سے خاصیت دیکھی گئی ہے کہ قلب میں رقت اور خاطر میں جمعیت حاصل ہوتی ہے۔ پس اس بنا پر یہ مباح

---

[1] تعلیم الدین صـ۱۲۱ [2] التکشف صـ۳۶۱۔

ہے اور مباح کی اباحت ہمیشہ ہمیشہ مشروط ہوتی ہے۔ رفع عوارض کے ساتھ پس اس میں بھی قید ہوگی کہ کسی کو ایذاء و تشویش نہ ہو۔ ورنہ آبادی سے دور جانا چاہیئے۔

۱۴:۔ بعضوں[۱] کو یہ ناز ہوتا ہے کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد میں ہیں۔ یا فلاں خاندان سے بیعت ہیں۔ اور اسی بنا پر اصلاح عقائد و اعمال سے بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اس دعویٰ اور ناز کی حدیث سے جڑ کٹتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو فرمایا۔

یا فاطمۃ انقذی نفسک من	اے فاطمہ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ
النار فانی لا املک لکم من	کیونکہ میں تم کو اللہ تعالیٰ سے بچانیکا کچھ
اللہ شیئا۔ رواہ مسلم	اختیار نہیں رکھتا۔

۱۵:۔ بعضے بیباک صوفی عوام کے سامنے بے تکلف تصوف کے دقائق بیان کر بیٹھتے ہیں۔ بعضے عوام تو ان کو خلاف شریعت سمجھ کر ان کی تکذیب کرتے ہیں اور بعضے باوجود ان کی حقیقت نہ سمجھنے کے ان کو مان کر قواعدِ مشہورہ شرعیہ کے منکر ہو جاتے ہیں۔ سو ہر حال میں اللہ و رسول کی تکذیب کا تحقق ہوا۔ حدیث شریف میں اس عادت کی ممانعت ہے (جیسا کہ بخاری شریف میں) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسی بات کرو۔ جس کو وہ سمجھیں کیا (سمجھ سے باہر باتیں کر کے) تم اس کو پسند کرتے ہو کہ خدا و رسول کی تکذیب کی جاوے (یعنی جب وہ بات قرآن و حدیث سے صراحۃً یا استدلالاً ثابت ہے تو خدا و رسول کی کہی ہوئی ہے اور چونکہ سمجھ سے باہر ہے اس لیے عوام اس کی تکذیب کریں گے۔ پس تم خدا و رسول کی تکذیب کے سبب ہوئے اور چونکہ ضروریاتِ دین میں سے کوئی امر ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے بعض دین کا کتمان لازم آتا ہے)۔

---

[۱] التکشف ص ۲۸، ۳۸۳، ۳۸۲

باب سوم تعلیمات

(۱): علم[۱] شریعت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ شریعت ہی تمہاری وہ کشتی ہے کہ جب اس میں رخنہ پڑ جائے تو تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور جتنے بھی اس میں سوار ہیں وہ سب ہلاک ہوں گے۔

(۲): اللہ تعالیٰ[۲] کے محبوب اور محب بننا چاہو تو اعمال میں ہمت کر کے شریعت کے پابند رہو۔

(۳): کمالِ مقصود یہ ہے کہ اقتضاءات بشریہ سب بدرجۂ کمال موجود ہوں پھر مستقل رہو کہ شریعت سے تجاوز نہ ہو۔

(۴): ظاہری جسم کے (خلافِ شریعت) مقتضیات پر عمل مت کرو۔ تب تم کو عروجِ روحانی ہو گا۔

(۵): جب[۳] کوئی مرض یاد آجائے۔ اس کو فوراً نوٹ کر لیا کرو (اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرو۔) اور ایک ہفتہ تک دیکھو کہ وہ زائل ہوا یا نہیں۔ اگر زائل نہ ہوا ہو تو نفس کو اور مہلت نہ دو۔ بلکہ مصلح کو اطلاع کر دو۔

(۶): اگر[۴] کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو اسے چاہیئے کہ دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے۔ کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ۔ لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو ممکن ہے کہ وہ کامل مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا۔ اسی طرح اگر شیخ کا انتقال قبل حصول مقصود کے ہو جاوے یا ملاقات کی امید نہ ہو۔ جب بھی دوسری جگہ تلاش کرے اور یہ خیال نہ کرے کہ قبر سے فیض لینا کافی ہے دوسرے شیخ کی کیا ضرورت ہے کیونکہ قبر

۱؎ تصوف و سلوک صفحہ ۲۱۳، ۲؎ کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۰، ۱۲، ۱۵ ۳؎ کمالات اشرفیہ صفحہ ۶

۴؎ تعلیم الدین صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰۔

سے فیضِ تعلیم نہیں ہو سکتا۔ البتہ صاحبِ نسبت کو احوال کی ترقی ہوتی ہے سو یہ شخص تو ابھی محتاجِ تعلیم ہے ورنہ کسی کو بھی بیعت کی ضرورت نہ ہوتی لاکھوں قبریں کاملین بلکہ انبیاء کی موجود ہیں۔ اور بلا ضرورت محض ہوسناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے۔ اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے اور نسبت قطع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے۔

(۷):۔ مشہور ہے کہ اپنے پیر کو سب سے افضل سمجھے۔ ظاہراً اس میں اشکال ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وفوق کل ذی علم علیم۔ اتنا سمجھے کہ میری تلاش سے زندہ لوگوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچانے والا شخص مجھ کو نہیں مل سکتا۔

(۸):۔ شیخ سے اگر کوئی فعل قابلِ اعتراض سرزد ہو جائے تو اعتراض نہ کرے۔ یا تو تاویل کرے۔ یا یوں سمجھ لے کہ اولیاء معصوم نہیں ہوتے ہیں اور توبہ سے سب معاف ہو جاتا ہے مگر یہ اس شیخ کیلئے ہے جو شرع کا پابند صاحبِ استقامت ہو اور اتفاقاً اس سے کوئی فعل ہو جائے اور اگر اس نے فسق و فجور کو عادت بنا رکھا ہو وہ ولی نہیں۔ اس کے قول و فعل کی تاویل کچھ ضرور نہیں اس سے علیحدگی اختیار کرئے۔

(۹):۔ ابوبکر وراق کا قول ہے کہ صالحین کی مجالست و مجاورت غنیمت ہے اگرچہ مجالست بھی نہ ہو۔ دیکھئے حق تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے ساتھ ان کے کتے کا کس طرح ذکر فرمایا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے ساتھ تھا۔

(۱۰):۔ جس شخص کے اندر یہ تین باتیں ہوں اس کی صحبت کو غنیمت سمجھو۔ ایک یہ کہ فقیہ ہو۔ دوسرے محدث ہو۔ تیسرے صوفی ہو۔

(۱۱):۔ شیخ کے ماسوا دوسرے شیخ کی خدمت میں دو شرط سے جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ اس کا مذاق اپنے شیخ کے خلاف نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سے تعلیم و تربیت میں سوال نہ کرے۔

لہ مسائل السلوک صہ ج ۲ ؎ کمالات اشرفیہ ؎۳ انفاسِ عیسیٰ صہ ۱۹

(۱۲) پیر[1] بھی فارغ نہ بیٹھ رہے کمالات میں ترقی کرتا رہے۔

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا — اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے محمدؐ! کہہ اے رب بڑھا دے میرا علم۔

دعوائے کمال نہ کرے۔ ہاں اظہار نعمت میں مضائقہ نہیں۔

لَا تُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ۔ — اپنے نفس کو پاکیزہ مت کہو

وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ۔ — اور جو نعمت تمہارے رب کی ہے اس کو بیان کرو۔

اور افشائے طریق پر حریص رہے۔

حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ۔ — اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وہ رسول تمہاری بھلائی پر حریص ہیں۔

مریدوں کے ساتھ شفقت و محبت سے رہے۔

وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ — اور مومنوں پر شفیق اور مہربان ہیں۔

ان کی خطا و قصور سے درگزر کرے

وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ فَاعْفُ عَنْھُمْ۔ — اور اگر تم تند خو، سخت دل ہوتے تو بے شک وہ لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے آپ ان سے درگزر فرمائیں۔

دنیاداروں کی خاطر سے ان کو علیحدہ نہ کرے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ اِلٰی قَوْلِہٖ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ الآیہ۔ — نہ ہٹاؤ اپنے پاس سے ان لوگوں کو جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام اس کی ذات کو چاہتے ہیں۔ تم پر ان کا کچھ حساب نہیں ہے اور نہ ان پر تمہارا کچھ حساب۔

---

[1] تعلیم الدین ص ۱۱۱

جو تم ان کو ہٹا معاور ناانصافوں سے ہو جاؤ۔

مریدوں سے متوقع دنیا و طالب نفع دنیوی کا نہ ہو۔

تُرِیْدُوْنَ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ قَالَ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم دنیا کی زیب و زینت چاہتے ہو اور فرمایا میں اس پر کسی قسم کا بدلہ نہیں مانگتا ہوں۔

اور ایذائے خلق پر صبر کرے۔

بِقَوْلِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ رَحِمَ اللّٰہُ اَخِیْ مُوْسٰی لَقَدْ اُوْذِیَ اَکْثَرَ مِنْ ھٰذَا فَصَبَرَ۔

اللہ رحم فرمائے میرے بھائی موسیٰ پر کہ انھیں اس سے زیادہ تکلیف پہنچائی گئی لیکن انھوں نے صبر کیا۔

اپنے آپ کو متانت و وقار سے رکھے ورنہ مریدوں کی نظر میں بے وقعتی ہونے سے ان کو فیض نہ ہوگا۔

من یراہ من بعید ھابہ و من یراہ من قریب احبہ

جو آپ کو دور سے دیکھتا تھا وہ خوف کھاتا تھا اور جو نزدیک سے دیکھتا تھا محبت کرتا تھا۔

اور ایک مرید کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی

تیور چڑھائے اور منہ موڑا۔

البتہ اگر ایک کو خدا کی طلب زیادہ ہے۔ اس کو ترجیح دینے میں مضائقہ نہیں۔ اور ایسی حرکت نہ کرے جس سے خلقت کو بد اعتقادی ہو کہ اس میں طریق مسدود ہوتا ہے[1]

(۱۳) چار پارا قدر طاقت بار نہ ۔۔۔ بر ضعیفاں قدر قوت کار نہ
طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر ۔۔۔ طفلِ مسکیں را اناں ناں مردہ گیر

---

[1] التکشف ۱۸۰

چونکہ دندانہا بر آید بعد ازاں — ہم بخود گردد دلش جویائے ناں
مرغ پر نارستہ چوں پراں شود — لقمۂ ہر گربۂ دراں شود
چوں بر آرد پر بپر داد بخود — بے تکلف بے صفیر نیک و بد

(چارپایہ پر اس کی طاقت کے مطابق بوجھ رکھو۔ کمزور دل پران کی قوت کے مطابق کام ڈالو۔ بچے کو اگر دودھ کی بجائے روٹی دو گے تو اس بیچارے کو مار ڈالو گے۔ ہاں جب بچے کے دانت نکل آئینگے تو اس کا دل خود روٹی کی طرف مائل ہوگا۔ وہ پرندہ جس کے پر نہ نکلے ہوں وہ اڑے تو پھاڑ کھانے والی بلی کا لقمہ ہو جائے گا اور جب پر نکل آئیں گے تو خود بخود اڑنے لگے گا۔ بغیر کسی تکلف کے۔ بغیر کسی نیک و بد کی آواز کے)

ان تمثیلات کے ضمن میں مشائخ کیلئے ایک دستور العمل ہے کہ طالبوں کو انکی استعداد سے زیادہ تعلیم کرنا یا کوئی معاملہ کرنا یا بلا کمال کے خلافت دینی نہ چاہیئے۔ چنانچہ چارپایہ پر اس کی طاقت کے قدر بوجھ رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح ضعیفوں پران کی قوت کے قدر کام ڈالنا چاہیئے۔ اگر لڑکے کو بجائے دودھ کے روٹی دینے لگو تو اس غریب کو اس روٹی کی بدولت مردہ ہی سمجھو رکھو۔ ہاں جب اس کے دانت نکل آدیں گے اس کے بعد اس کا دل خود روٹی کا خواہاں ہونے لگے گا۔ جس پرندہ کے پر نہ جمے ہوں۔ اگر وہ اڑنا شروع کردے تو یقیناً بلیوں کا لقمہ بنے گا اور جب اس کے پر نکل آدیں تو وہ خود بلا تکلف و بلا احتیاج اس کے کہ کوئی آدمی بھلا برا اس کو آواز دے اڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب مبتدی کے ساتھ منتہی کا سا معاملہ کیا جائے گا یا وہ خود مستقل بننا چاہے گا تو وہ ضرور تباہ و ہلاک ہوگا۔ کیونکہ ابتدا میں اس کو ضرورت صحبت کی ہے جو بجائے شیر کے ہے۔ البتہ جب اس کو بلا واسطہ فیض ہونے لگے اور مقامِ تمکین حاصل ہو جائے جو بجائے دانت نکلنے کے ہے۔ تو اس وقت ترک صحبت کا مضائقہ نہیں ورنہ پنجۂ شیطان میں کہ بجائے گربۂ دراں کے ہے گرفتار ہوگا اور بوجہ ناتجربہ کاری عقباتِ سلوک (سلوک کی گھاٹیوں) سے خدا جانے کس جہالت و ضلالت میں مبتلا ہو جائیگا۔

(۱۴) تصوف کا مقصود اصلی ادائے مامور بہ ہے۔ اور مامور بہ کا اختیاری ہونا ضروری ہے[1]

---

[1] انفاس عیسیٰ ...

اور امرِ اختیاری کا ہر شخص اہل ہے۔

(۱۵): اختیاری امور میں کوتاہی کا علاج بجز ہمت اور استعمالِ اختیار کے کچھ نہیں۔

اس پر تمام اصلاحات کا مدار ہے اور یہی تمام کوتاہیوں کا اصل علاج ہے۔ سارے افعال شرعیہ اختیاری ہیں۔ ورنہ نصوص کی تکذیب لازم آتی ہے۔ پس جب اختیار کو استعمال کرے گا تو کامیابی لازم ہے۔ البتہ اول اول دشواری اور کلفت ضرور ہوگی۔ لیکن اس کا بھی علاج یہی ہے کہ باوجود کلفت کے ہمت سے اور اختیار سے برابر بہ تکلف اور بجبر کام لیتا رہے۔ رفتہ رفتہ وہ کلفت مبدل بسہولت ہو جائے گی۔ سارے مجاہدے بس اسی لئے کئے جاتے ہیں کہ اختیار اوامر اور اجتنابِ نواہی میں سہولت پیدا ہو جائے اور اول اول تو ہر کام مشکل ہوتا ہے مگر کرتے کرتے مشق ہو جاتی ہے اور پھر نہایت سہولت کے ساتھ ہونے لگتا ہے۔ جیسے حفظ کا سبق شروع میں دشوار ہوتا ہے مگر رٹتے رٹتے یاد ہو جاتا ہے۔ اگر شروع کی کلفت اور تعب کو دیکھ کر ہمت ہار دی تو کوئی صورت ہی کامیابی کی نہیں۔

(۱۶): معصیت[1] سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اول خود ہمت کرے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ہمت طلب کرے۔ اور خاصانِ خدا سے بھی دعا کرائے۔ انشاء اللہ گناہوں سے بچنے کی ضرور ہمت ہوگی۔ کامیابی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک اپنی ہمت، دوسرے بزرگوں کی دعا۔ ان دونوں پہیوں سے گاڑی کو چلانا چاہیئے۔ ایک پہیہ کافی نہیں۔

بندہ کو چاہیئے کہ خود ہمت کرے۔ پھر اس کی تکمیل حق تعالیٰ خود کر دیتے ہیں۔ جیسے باپ جب دیکھتا ہے کہ بچہ دس قدم چلا اور گر گیا۔ تو خود ہی رحم کھا کر اس کی مدد کرتا ہے اور اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے تو جیسے باپ چاہتا ہے کہ بچہ اپنی طرف سے کوشش کرے چلنے کی اسیطرح حق تعالیٰ ہماری طلب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

۱۷: محققین[2] مجاہدہ میں غلو کرنے سے منع کرتے ہیں۔ حدیث میں اس کی صریح تعلیم ہے۔ اس غلو میں طبیعت بھی اکتا جاتی ہے اور اصلِ عمل بھی متروک ہو جاتا ہے اور صحت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی سبب تعطل کا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات جنون تک کی نوبت پہنچ

---

[1] [illegible] ص ۲۵۰ [2] التکشف ص [illegible]

جاتی ہے (اسی لیے) ائمہ سلوک نے اتفاق کیا ہے کہ مجاہدہ و ریاضت میں اس قدر افراط و غلو نہ کرے کہ طبیعت تنگ ہو جائے یا صحت میں فتور پڑ جائے اور جن حضرات سے اس کی کثرت اور مبالغہ منقول ہے ان پر شبہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ غلبۂ شوق و قوتِ محبت میں ان کو فتور، سستی و تنگی عارض نہ ہوتی تھی۔

(۱۸): بعض اوقات ذکر اور عبادت میں حلاوت اور لذت محسوس نہ ہونے سے ناواقف تنگدل ہو کر اس کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ یا افسردہ خاطر ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ میرا یہ عمل محض عبث اور بے سود ہے اور اس گمان سے ترقیِ باطنی رک جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا بڑا مدار یقین پر ہے محققین نے تصریحاً فرمایا ہے کہ ذکر مقصود ہے۔ لذت مقصود نہیں۔ بلکہ لذت نہ ہونے پر برابر مشغول رہنا۔ اس میں بوجہ زیادتِ مجاہدہ کے نفع زیادہ ہے۔

بابِ چہارم ۔ توجہات

عن ابی ہریرۃ انہ دخل السوق فقال اراکم ھھنا و میراث محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقسم فی المسجد فذھبوا وانصرفوا وقالوا ما راینا شیئا یقسم راینا قوما یقرءون القرآن قال فذلک میراث نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم

(رواہ رزین[1])

حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ وہ بازار میں تشریف لائے اور لوگوں سے فرمایا کہ میں تم کو یہاں دیکھتا ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث مسجد میں تقسیم ہو رہی ہے یہ سنکر لوگ ادھر چلے اور پھر لوٹ آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے تو کچھ بھی تقسیم ہوتے نہیں دیکھا۔ صرف ایک قوم کو دیکھا کہ قرآن کے پڑھنے میں لگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہی تو تمھارے نبیؐ کی میراث ہے۔

---

[1] التکشف ص ۳۱۹

اکثر بزرگوں کی تقریر و تحریر میں بعض مضامین خلاف ظاہر پائے جاتے ہیں جن کی توجیہ و مراد سننے کے بعد بالکل صحیح و مطابق واقعہ کے ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی ان کا سبب غلبۂ حال ہوتا ہے۔ کبھی قصدِ اخفائے عوام سے، کبھی تشویق و ترغیب طالب کی، کہ ابہام سے شوق تعیین ہوتا ہے اور بعد شوق جو تعیین ہوتی ہے وہ اوقع فی النفس ہوتی ہے۔ اس حدیث میں اس عادت کا اثبات ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مصلحت تشویق کیلئے اول ابہاماً فرمایا۔ جس سے ایہام معنی غیر مقصود کا ہوا حتی کے واپسی کے بعد لوگوں نے تکذیب بھی کی۔ مگر بعد تفسیر معلوم ہوا کہ کلام صادق ہے۔ پس عبارت موہمہ دیکھ کر کسی صاحبِ کمال یا صاحبِ حال پر جرح قدح نہ کرے کہ مثمر حرمان (یعنی باعثِ محرومی) ہے۔

(اسی طرح ایک حدیث بخاری و ترمذی میں حضرت انس رضؓ سے بھی مروی ہے کہ) جنابؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچ کر اس کی نسبت فرمایا کہ یہ انسان ہے اور ایک خط اس کے قریب کھینچ کر فرمایا کہ یہ اس کی موت ہے اور ایک خط اس سے دور کھینچ کر فرمایا کہ یہ انسان کی آرزو اور امنگ ہے پس انسان اسی حالت میں رہتا ہے (کہ آرزو پوری کروں) دفعتہً یہ پاس والی چیز یعنی موت آپہنچتی ہے۔

بہت سے بزرگوں کے کلام میں خصوص نظم میں ذات و صفات حق پر کہیں دریا کا اطلاق آیا ہے کہیں آفتاب و ماہتاب کا۔ اور توجیہ اس کی یہ ہے کہ مقصود تمثیل و تشبیہ ہے نہ اتحاد اور تشبیہ میں کچھ محذور (ممانعت) نہیں کَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (مثل قندیل کے کہ اس میں چراغ ہو) خود قرآن مجید میں ہے۔ غایت مافی الباب (اس باب میں زیادہ سے زیادہ) یہ کہ کوئی کلمہ دال علی التشبیہ (تشبیہ پر دلالت کرنے والا) کلام میں مذکور نہیں لیکن حذف کر دینا اس کا کلام فصحا میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ سو یہ حدیث اس حذف کی تائید و تقویت میں صریح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط کی طرف اشارہ فرما کر ان کو انسان، اجل (موت)، اور امل (آرزو) بتلا دیا۔ کالانسان (مثل انسان) کالاجل (مثل موت) م

ــــه تلخیص ،، ص۳۲۰، ۳۶۲ ء ــــه نفس میں راسخ ہوتا ہے۔

کالامل (مثل آرزو) نہیں فرمایا ۔حالانکہ مقصود یہی ہے ۔پس صحتِ اطلاق یقیناً ثابت ہوئی۔
نیز بخاری و مسلم و ابوداؤد و نسائی میں بہ الفاظِ بخاری و مسلم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے
دعاء نبوی میں منقول ہے کہ اے اللہ مجھ کو میرے گناہوں سے پاک کر دے پانی اور برف اور
اولے سے ۔

اس حدیث سے بھی اس تمثیل کا جواز ثابت ہوتا ہے ۔کیونکہ ماء و ثلج و برد (پانی اور
اولہ) سے مقصود صفتِ رحمت ہے ۔لجامع التطہیر (پاک کرنے میں شامل ہونے کی وجہ سے)
اور چونکہ ذات اور صفات میں تغائر (غیریت) نہیں ۔جب صفات کی تمثیل کا جواز ثابت ہو
گیا تو ذات کی تمثیل کا جواز بھی ثابت ہو گیا۔

اکثر صوفیۂ کرام کے کلام میں بعض آیتوں کے خلاف ظاہر معانی پر محمول ہونا پایا جاتا ہے ۔
ایسے مواقع پر ناظرین کو دو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں ۔بعض لوگ تو یوں اعتقاد کر لیتے ہیں کہ
قرآن مجید کی تفسیر یہی ہے اور علماء ظاہر نے جو تفسیر کی ہے وہ غلط ہے ۔حالانکہ یہ اعتقاد
بالکل باطل اور شعار زنادقہ (زندیقوں) کا ہے اور اس سے تمام شریعت ناقابلِ اعتبار
اور منہدم ہوئی جاتی ہے اور بعض لوگ ان حضرات پر طعن کرنے لگتے ہیں کہ انھوں نے قرآن
میں تحریف کر دی اور تفسیر بالرائے کرتے ہیں ۔اس لیے اس کی تحقیق ضروری ہے ۔اصل
یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر تو وہی ہے جو علمائے مفسرین نے لکھی ہے ۔لیکن کبھی ایسا ہوتا
ہے کہ جو مضمون مدلول و مقصود بالقرآن ہے ۔اس کے مشابہ کوئی دوسرا مضمون ہوتا ہے ۔
تو مدلولِ قرآنی سے ذہن اس مشابہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔جیسا زید اور عمرو میں مناسبت
ہو اور زید کا حال بیان کرتے ہوں اور عمرو یاد آ جائے اور اس انتقالِ ذہنی کی وجہ سے اس
مدلولِ قرآنی پر اس مضمون مشابہ کو قیاس کر کے اس کے لیے بھی وہی حکم جو مدلولِ قرآنی کے متعلق
ہے ثابت کرنے لگتے ہیں تو مقصود ان کا اس نص میں اس مضمون کا داخل کرنا نہیں ہوتا بلکہ
محض قیاس و تمثیل کا قصد ہوتا ہے ۔مثلاً اسی آیت طَهِّرْ بَيْتِيَ کی تفسیر سے کہ تطہیر کعبہ سے
ذہن منتقل ہوا کہ انسان میں بھی ایک چیز مشابہ کعبہ کے ہے اور وہ قلب ہے ۔کیونکہ جس

ؔ التکشف ص۱۰۱

طرح کعبہ پر انوارِ الٰہی نازل ہوتے ہیں قلب پر بھی فائض ہوتے ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا کہ جس طرح تطہیر کعبہ ضروری ہے۔ کیونکہ وہ موردِ تجلیات ہے۔ اسی طرح چونکہ قلب بھی موردِ تجلیات ہے اس کی تطہیر بھی ضروری ہے اور ورودِ تجلیات علتِ مشترکہ ہے اس کو علم اعتبار کہتے ہیں جس کی اجازت فاعتبروا یا اولی الابصار میں موجود ہے اور جمیع فقہاء مجتہدین احکام میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر اس معنیٔ مقیس کو کوئی شخص مجازاً مدلول نص کہہ دے بایں معنی کہ قیاس مظہر ہے نہ مثبت تو اس میں کوئی بات قابلِ مواخذہ نہیں۔ امر محقق اس باب میں یہ ہے۔ امام غزالیؒ نے بعض تصانیف میں اس کی تصریح فرمائی ہے اور بعض نے جو ان توجیہات کی تصحیح کے لیے یہ تکلف کیا ہے کہ ہر آیت کا ایک ظہر اور ایک بطن ہوتا ہے۔ پس علماء ظاہر نے جو کہا ہے وہ ظہر ہے اور صوفیہ نے جو فرمایا ہے وہ بطن ہے یہ تکلف نہایت بعید ہے۔ کیونکہ ظہر اور بطن دونوں کا اس آیت کے وجوہ محتملہ سے تو ہونا ضرور ہے اور ایسے نکات واعتبارات یقیناً آیت میں محتمل نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ماہرینِ قواعد شرعیہ وعربیہ پر مخفی نہیں۔ اس لیے ان کو بطنِ قرآن کہنا نہایت امر مستنکر ہے بلکہ بطن سے مراد وہ معانی دقیقہ و مستنبطاتِ غامضہ ہیں جن کو حضرات مجتہدین سمجھتے ہیں۔ جس کی تفصیل اہل اصول نے وجوہ دلالات میں لکھی ہے اور ان بطون میں مراتب مختلف ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کو علماء راسخین و مجتہدین سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کو صرف حضرات انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں۔ وھکذا فوق کل ذی علم علیم۔

پہلی فصل۔ باطنِ شیخ

حدیث شریف میں ہے۔

اَلْمَرْءُ مع من احب ۔ انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہے۔

گفت[1] جانم از محباں دور نیست لیک بیرون آمدن دستور نیست

وزیر نے جواب دیا کہ گو میرا جسم بظاہر بعید ہے مگر میری جان اہلِ محبت سے دور نہیں۔ یعنی جان اور باطن کے اعتبار سے میں تم سے قریب ہوں لیکن باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ اس میں مولانا رومؒ نے اشارہ کیا ہے کہ اگر پیر سے محبت کامل ہو تو ظاہری دوری مانع فیض نہیں۔ حدیث اس کی مؤید ہے یہی محبت معیتِ روحانی ہے۔ مگر یہ اس شخص کیلئے ہے جس کو تعلیم کی حاجت نہ رہی ہو۔ صرف تقویتِ نسبت میں مشغول ہو۔ ورنہ بدوں قربِ جسمانی کام نہیں چلتا۔ البتہ ثواب اور برکت ضرور ہے۔ اس مضمون کو بعض صوفیہ ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں کہ باطنِ پیر ہر جگہ ہے جس کے معنی سمجھنے میں عوام الناس غلطی کرتے ہیں کہ پیر نعوذ باللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے سو یہ یقیناً غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ گو بطور خرق عادت و کرامت کے گاہ ایسا بھی واقعہ ہوا ہے مگر یہ امر غیر مستمر ہے اور غیر ضروری ہے کہ جب پیر کی شکل نظر آوے تو وہ سچ مچ پیر ہی ہو۔ بعض اوقات کوئی فرشتہ وغیرہ اس شکل میں نظر آجاتا ہے۔ بلکہ معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ باطن اصطلاح میں اس اسمِ الٰہی کو کہتے ہیں جس کا کسی مخلوق میں ظہور ہو۔ پس شیخِ کامل میں اسمِ ہادی کا فیض ظاہر ہے۔ سو باطن شیخ سے مراد اسم ہادی ہوا۔ چونکہ وہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ مکان و زمان سے منزہ ہے اور اس کا نور اور فیض عام اور محیط ہے۔ اس اعتبار سے کہہ دیا جاتا ہے کہ باطن شیخ ہر جگہ موجود ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ صفت ہادی کا فیض کسی زمان و مکان کے ساتھ خاص نہیں اور چونکہ قابلیت اس فیض حاصل کرنے کی شیخ کی صحبت و تعلیم سے نصیب ہوتی ہے اس لیے باطن کو شیخ کی طرف بادنیٰ ملابست مضاف کر دیتے ہیں۔

---

[1] التکشف صنٹ ع جس میں ہمشگرہ نہ ہو۔

دوسری فصل۔ تجلی حق در خلق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اتانی[1] ربی فی احسن صورۃ الحدیث — میرا رب میرے پاس ایک اچھی صورت

اخرجہ الترمذی۔ — میں آیا۔ (ترمذی شریف)

صوفیہ کے کلام میں ان دو مسئلوں کے عنوان تعبیری میں یہ دو اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔ حقیقت اول کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلا حلول اپنی ذات وصفات کا خلق میں ظہور فرماتے ہیں۔ جس طرح کاتب کا ظہور مکتوب میں اور متکلم کا ظہور کلام میں ہوتا ہے۔ پس خلق مظہر اور حق ظاہر ہے اور ثانی کی حقیقت یہ ہے کہ ظاہر ومظہر میں ایسا شدید تعلق ہے کہ مظہر سے انفکاک[2] ظاہر کا محال ہے سو مسئلے دونوں عقلی ہیں۔ مگر عنوانِ تعبیری کسی قدر موحش ہوجاتا ہے لیکن بعد وضوح مراد کے ایسی اصطلاحات کی گنجائش خود حدیث میں تامل کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے چنانچہ فی احسن صورۃ اصطلاحِ اوّل کی نظیر ہے اور آتِ من ربی کو ربی کہہ دینا اصطلاح ثانی کی نظیر ہے اور اگر من تجرید یہ ہو تو خود فی احسن صورۃ اس ثانی کا بھی ماخذ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ صورت مباینہ کے تلبس سے غیر ذی صورت کو ذی صورت کہنا لازم آیا۔ پس ذی صورت اور غیر ذی صورت میں اسی طرح استدلال ہوسکتا ہے۔ البتہ تجلی واتحاد کو معنی عرفی ولغوی پر محمول کرنا جائز نہیں۔ جیسا عوام جہلا اس سے اپنے عقائد خراب کر لیتے ہیں۔

تیسری فصل۔ تشبیہ نفس با فرعون

بزرگوں[3] کو ہر وقت اپنے نفس کی اصلاح کی فکر ہوتی ہے وہ اسی دھن میں رہتے ہیں۔ اس لیے اس طرف ذہن چلا جاتا ہے۔ مثلاً انھوں نے کسی کو پڑھتے ہوئے سنا

---

[1] التکشف ص۴۱۰ [2] علیحدہ ہونا۔ [3] ملفوظات ص۷۳۔

اذهب الی فرعون انه طغیٰ پس فوراً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ یا ایہا الروح اذهب الی النفس انه طغیٰ (ترجمہ: اے روح نفس کی طرف چل کہ وہ سرکش ہوگیا ہے) اور وہ اس کو تفسیر نہیں کہتے۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی دو چیزیں ہیں ایک موسیٰؑ کے مشابہ یعنی روح اور ایک فرعون کے مشابہ یعنی نفس۔ مگر کوئی اس کو قیاس نہ سمجھے۔ صرف صورتِ قیاس ہے۔ بعض ظاہر بینوں نے اس کو قیاس میں داخل کیا ہے اور معنیٔ اعتباری کو نص کا مدلول کہا ہے۔ مگر یہ قیاس نہیں۔ فقط تذکر اور انتقالِ ذہنی ہے کہ ایک کو دیکھ کر دوسرا یاد آجاتا ہے اس لیے اس کو نص کا مدلول نہ کہیں گے۔

چوتھی فصل۔ الصوفی لا مذہب لہٗ

اس[1] کا مطلب یہ نہیں کہ صوفی لا مذہب ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ محتاط ہوتا ہے اور ہر مسئلہ میں احتیاط کی جانب کو اختیار کرتا ہے ورع و تقویٰ اسی کا نام ہے۔ ہمارے فقہاء نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

ورعایة الخلاف والخروج منه اولی مالم یرتکب مکروه مذهبه۔	اختلاف سے نکلنا مستحب ہے جب تک اپنے مذہب کے کسی مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔

پانچویں فصل۔ ہمہ اوست

(توجیہ کے لیے فصل وحدۃ الوجود ملاحظہ ہو۔)

---

[1] الانفاسِ عیسیٰ ص ۲۸۳،

چھٹی فصل۔ دریا و آفتاب وغیرہ گفتن ذات وصفات حق را۔

(توجیہ کے لیے شروع باب توجیہات صفحہ ۴۱۵ ملاحظہ ہو۔)

ساتویں فصل۔ خود را بد دین گفتن

بخاری[1] شریف میں ابو ملیکہ سے روایت ہے کہ میں نے تیس صحابیوں کو دیکھا جو بدر میں شریک ہوئے تھے۔ (جن کی بڑی فضیلت آئی ہے) سب کے سب اپنے متعلق منافق ہونے کا اندیشہ رکھتے تھے۔ اور اپنے دین کے متغیر ہونے سے بے اندیشہ نہ تھے۔

بزرگوں کے کلام میں کثرت سے اس قسم کے کلمات پائے جاتے ہیں۔ سبب اس کا غلبۂ خوف ہے۔ حدیث سے صحابہ کا بھی یہی مذاق ثابت ہوتا ہے اور اگر یخاف (خوف رکھنا) باعتبار مآل کے ہے۔ تب تو نفاق اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے اور اگر باعتبار حال کے ہے تو نفاق سے مراد بعض آثار نفاق ہیں۔ جو من وجہ نفاق کا ایک درجہ ہے۔

باب پنجم۔ متفرقات

نور و ظلمت قلب ذکر[2] و طاعت سے قلب نورانی ہو جاتا ہے اور غفلت و معصیت سے قلب ظلمانی ہو جاتا ہے۔ پس ذکر و طاعت کے آثار، انوار ہیں۔ اور غفلت و معصیت کے آثار، ظلمات ہیں۔ اور یہ نور و ظلمت مثل اجسام منیرہ و مظلمہ کے حسی نہیں ہیں۔ اور جو انوار بعض اوقات محسوس ہوتے ہیں وہ مقصود نہیں۔

---

[1] التکشف ص ۲۳۵۔ [2] التکشف ص ۳۴۳، ۲۵۸، ۲۵۱، ۲۲۶، ۲۲۹، ۳۲۲، ۲۵۲، ۲۴۳، ۳۴۲

خلافت وسجادہ نشینی

اکثر مشائخ کی عادت ہے کہ ابقاء فیض اور اجراء سلسلہ کے لیے اپنے اتباع میں سے کسی کو اپنا خلیفہ وجانشین کر دیتے ہیں۔ ایک کو یا متعدد کو۔ کبھی حیات میں اور کبھی بقید اپنی وفات کے۔ مگر مقصود ان سب ضرورتوں کا مشترک ومتحد ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ شخص اہل ہو۔ حدیث شریف سے اس کی اصل ثابت ہوتی ہے۔ ایک عورت حضور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور کسی امر میں گفتگو کی۔ آپؐ نے اس سے فرمایا کہ پھر آنا۔ اس نے عرض کیا کہ اگر اس وقت آپ کو نہ پاؤں۔ مراد اس کی یہ تھی کہ اگر آپ کی وفات ہو جائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھ کو نہ پائے تو ابوبکرؓ کے پاس چلی جانا۔ اس کو بخاری وترمذی ومسلم نے روایت کیا ہے اور اب جو خلافت وسجادہ نشینی کا طریق متعارف ہو گیا ہے کہ کبھی شیخ کی حیات میں اور کبھی بعد وفات سلسلہ کے لوگ جمع ہو کر شیخ کے اقارب یا خدام میں سے جس کو زیادہ اختصاص دیکھا۔ گو وہ اختصاص دنیوی ہی ہو اور گو اس میں اس کی اہلیت نہ ہو۔ دستار بندی کر دیتے ہیں۔ یہ بالکل طریقہ کا افساد اور طالبین کی رہزنی اور عوام کی اضاعتِ دنیا ودین ہے۔ امام مالکؒ نے روایت کیا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس عہدہ (خلافت) کو ایسے شخص کے حوالہ نہیں کرتا جو اس کا اہل نہ ہو۔ البتہ ایسے شخص کے لیے تجویز کرتا ہوں جس کی رغبت اہلِ اسلام کی توقیر کی طرف ہو۔ سو یہ لوگ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس حدیث سے نااہل کو خلیفہ بنانے کا ابطال ثابت ہوتا ہے۔

تعظیمِ منتسبینِ مشائخ

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے روایت ہے کہ (بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) حضرت فاطمہ رضؓ کی حیات تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وجاہت لوگوں کی نظر میں زیادہ رہی۔ جب ان کا انتقال ہو گیا۔ تو لوگوں کا رخ ذرا بدل گیا۔ اس کو بخاری ومسلم نے روایت کیا۔

اہل طریق کی عادت طبعیہ ہے کہ بزرگوں کے منتسبین کو محض اس انتساب کی وجہ سے معظم سمجھتے ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر حضرات صحابہ کرامؓ میں بھی طبعاً پایا جاتا ہے۔

مہاجرت مرید برائے زجر

اکثر بزرگوں کی حکایتیں سنی گئی ہیں کہ مرید کی کسی خلاف وضع حرکت پر اس کو نکال دیا۔ یا اس سے بولنا چھوڑ دیا یا اور کوئی مناسب سزا دی۔ اور مقصود اس سے محض تنبیہ ہوتی ہے۔ عداوت منشا نہیں ہوتا۔ سو حدیث سے اس عمل کا مستحسن ہونا ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت کعب اور دوسرے دو صحابیوں کے غزوۂ تبوک سے رہ جانے پر) مسلمانوں کو ان تینوں کے ساتھ کلام کرنے سے منع فرما دیا تھا۔

بیعتِ صغیر

بخاری نے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن ہشام رضؓ کو ان کی ماں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی تھیں اور عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ اس کو بیعت کر لیجئے۔ آپ نے فرمایا یہ بچہ ہے پھر آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لیے دعا کی۔

اب بھی بزرگوں کا اصل معمول یہی ہے (کہ بچوں کو بیعت کرنے میں عذر فرماتے ہیں۔) اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ بیعت، احکامِ لازمہ کا التزام ہے اور صغیر پر احکام التزام سے بھی لازم نہیں ہوتے تو بیعت کی حقیقت وہاں متحقق نہیں ہو سکتی۔ اور بعض اوقات جو ایسا کر لیتے ہیں وہ برکت کے لیے محض صورت بیعت ہے۔

اختلافِ تعلیم حسبِ استعداد

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ دار کے لیے عورت سے ملنے کے متعلق دریافت کیا تو اس کو اجازت دے دی۔ پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے پوچھا تو اسکو منع فرمایا۔ اور (دیکھنے سے معلوم ہوا کہ) جس کو اجازت دی وہ بوڑھا تھا اور جس کو منع کیا وہ جوان تھا۔ (ابو داؤد)

اہل ارشاد کی عادت ہے کہ ہر شخص کو اس کی استعداد اور حالت کے مناسب تعلیم و تربیت فرماتے ہیں۔ یہ حدیث اس عادت کی اصل صریح ہے اور اخفار تعلیم کا یہ بھی ایک نکتہ ہے تاکہ دوسرا اس کم ہوس کے مارے وہی نہ کرنے لگے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مخفی تعلیم کی وقعت زیادہ ہوتی ہے اور وقعت سے اہتمام اتباع کا امر طبعی ہے۔

امتحانِ طالب بعنوانِ موحش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو عورتیں (حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک بچہ کے حصول کیلئے) مقدمہ لے گئی تھیں۔ سلیمانؑ نے فرمایا کہ چھری لاؤ میں چیر کر دونوں میں تقسیم کر دوں۔ چھوٹی عورت نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے ایسا نہ کیجئے۔ (میں نے چھوڑا) یہ اسی کا ہے۔ پس آپ نے اس چھوٹی عورت ہی کو بچہ دے دیا۔ بخاری و مسلم و نسائی نے اس کو روایت کیا۔

بعض بزرگوں کی بعض مواقع ضرورت پر عادت ہوتی ہے کہ طالب کی ارادت و اعتقاد کا اس طریق پر امتحان کرتے ہیں کہ کوئی قول یا فعل ایسا کہتے اور کرتے ہیں جس کا ظاہر باطن کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی واقع میں تو وہ شریعت کے موافق ہوتا ہے اور ظاہر میں خلاف ہوتا ہے۔ جیسا شیخ صادق گنگوہیؒ نے ایک طالب کے سامنے کہہ دیا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ صَادِق رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ مقصود تو یہ تھا کہ رسول اللہ صادق ہیں۔ اور ظاہر میں شبہ ہوتا تھا کہ یہ خود مدعی رسالت ہیں۔ اگر طالب کم سمجھ ہوا تو بھاگ جاتا ہے اور اگر سمجھدار ہوا تو اس کو احتمال امتحان کا ہوتا ہے اور وہ دوسرے اقوال و افعال کو بھی دیکھتا ہے۔ اگر علامات سے کمال ثابت ہو تو ایسے امور کی اجمالاً یا تفصیلاً تاویل کر کے طلب میں ثابت رہتا ہے۔ یہ حدیث اس عادت کا ماخذ ہو سکتی ہے کہ باطن میں مقصود چیرنا نہ تھا۔ مگر غیر والدہ کے امتحان کے واسطے ایسا ارادہ موحشہ ظاہر فرمایا۔

تیز مزاجی

مسند دیلمی میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ تیزی (جو لطافتِ طبیعت کی وجہ سے ہو) صرف میری امت کے صلحاء و ابرار میں ہوتی ہے۔ اور اسی سند سے بایں لفظ بھی روایت ہے کہ کوئی شخص (ایسی مذکورہ) تیزی کا صاحب ..ن سے زیادہ شایاں نہیں۔ بسبب عزت قرآن کے جو اس کے جوف میں ہے۔

بعض بزرگ زیادہ لطیف المزاج ہوتے ہیں اور اس لطافت کے سبب ان کو

لہ التکشف صفحہ ۳۹۷، ۴۵۹، ۳۵۱، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۳۳، ۴۵۹

نامناسب امور زیادہ ناگوار ہوتے ہیں اور یہ ناگواری ان کے بشرہ یا گفتگو سے ظاہر ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ تغیر مزاج حدِ غضب تک پہنچ جاتا ہے جس سے بعض تنگ نظروں کو ان پر بد خلقی کا شبہ ہوتا ہے۔ سو بد خلقی وہ ہے کہ حدِ شرع سے متجاوز ہو جاوے ورنہ نفسِ حدت (یعنی تیزی) کا حدیث مذکور سے خلافِ صلاح نہ ہونا ظاہر ہے اور صحاح میں ایسی روایات ہیں کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے موقع بات پوچھنے تک پر غضبناک ہوئے ہیں۔ سو بزرگوں پر اعتراض کرنے میں مبادرت (سبقت) نہ چاہیئے۔

ترکِ مباحثہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ناحق پر ہو اور بحث مباحثہ چھوڑ دے۔ (اور حق کو قبول کرلے) اس کے لیے جنت کے کنارے پر ایک گھر بنایا جائے گا۔ اور جو شخص حق پر ہو اور پھر بھی بحث و مباحثہ چھوڑ دے (یہ سمجھ کر کہ مخاطب مانتا نہیں فضول وقت برباد ہوتا ہے اور احتمال ہے کہ شاید اپنے اندر کوئی سے نفسانیت پیدا ہو جاوے) اس کے لیے وسط جنت میں گھر بنایا جائے گا (جو کہ کنارۂ جنت والے سے اچھا ہے) اور جس کے اخلاق اچھے ہوں گے۔ اس کے لیے اعلیٰ جنت میں گھر بنایا جاویگا اسکو ترمذی نے روایت کیا۔

اکثر بزرگوں کو دیکھا گیا ہے کہ مکالمات و مخاطبات میں جب کوئی ان سے الجھتا ہے تو باوجود اپنے حق پر ہونے کے طرح دے کر سکوت فرماتے ہیں۔ جس میں وہی مصلحت ہوتی ہے۔ جس کی طرف ترجمۂ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے اس کا پسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

تمام لباس رنگین پہننا

ترمذی و ابوداؤد و نسائی نے روایت کیا کہ حضرت ابو رمثہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو سبز کپڑے (لنگی اور چادر) دیکھے ہیں۔

بعض بزرگوں کی عادت ہے کہ سر سے پاؤں تک رنگین کپڑے پہنتے ہیں۔ سو اگر یہ ریاءً ہو تب تو ظاہر ہے کہ مذموم ہے اور اگر کسی مصلحت سے ہو۔ مثلاً یہ کہ رنگین کپڑے میلے کم ہوتے ہیں۔ اور بار بار دھلوانا بھی مشغولی الی غیر المطلوب ہے تو مضائقہ نہیں۔ اس حدیث

میں بھی پورے کپڑوں کا رنگین ہونا مذکور ہے۔ گو طائی یہاں دوسرا ہو۔ مگر مصلحت پر مبنی ہونا تو امر مشترک ہے اور قیاس کیلئے اسی قدر کافی ہے۔

صوف پہننا بخاری و مسلم و ترمذی و ابو داؤد نے روایت کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے ایک کمبل بہت دبیز اور ایک لنگی موٹے کپڑے کی نکال کر دکھلائی اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی دو کپڑوں میں وفات پائی۔

بعض درویش اکثر حالات میں کمبل وغیرہ اوڑھتے رہتے ہیں اور احقر کے نزدیک عجب نہیں کہ صوفی کا لقب اسی سے ہوا ہو۔ گو اس میں دوسرے اقوال بھی ہیں اگر یہ براہ تصنع در یا نہ ہو تو یہ حدیث اس کی اصل ہے۔

چلہ حضرت ابن عباس رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص چالیس روز تک اللہ کے لیے خلوص (کے ساتھ عبادت) اختیار کرے علم کے چشمے اس کے قلب سے (جوش زن ہوکر) اس کی زبان سے ظاہر ہوتے ہیں روایت کیا اس کو رزین نے۔

اکثر بزرگوں سے چلہ نشینی کا اہتمام منقول ہے۔ یہ حدیث اس کی اصل ہے۔

ضبط اوقات و اہتمام مجلس خاص در خلوت اور دربان کا مقرر کرنا

۱:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ سے فرمایا کہ تمھارے لئے آنے کی یہی اجازت ہے کہ تم پردہ اٹھا دیا کرو اور میری مخفی بات سن لیا کرو۔ جب تک میں منع نہ کروں۔ ابن ماجہ۔

۲:- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اپنے اندر آنے کے حصہ کو تین حصے فرماتے۔ ایک حصہ وقت کا اللہ کے کام کے لئے (مثل نوافل وغیرہ) اور ایک حصہ اپنے گھر والوں (سے بولنے چالنے) کیلئے اور ایک حصہ اپنے نفس کے (آرام کے) لیے۔ اور پھر اپنے حصہ کو اپنے (ضروری کاموں) اور لوگوں کے (نفع پہنچانے کے) درمیان تقسیم فرمادیتے

(یعنی کچھ وقت اپنے لیے صرف کرتے اور کچھ لوگوں کے کام میں) سو اس حصہ کو (جو لوگوں کے لئے نکالتے تھے) خواص کے ذریعہ سے عام لوگوں پر صرف فرماتے اور لوگوں سے کوئی چیز (کام کی) اٹھا نہ رکھتے اور آپ کی عادت شریف امت کے حصہ میں (جو باہر صرف ہوتا تھا) یہ تھی۔ اہل فضیلت کو ترجیح دینا وغیرہ وغیرہ جو حدیث میں مذکور ہے۔ (شمائل ترمذی ص۲۶)

۳:۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے ایک باغ میں تھا۔ ایک شخص آیا اور دروازہ کھلوایا۔ آپ نے فرمایا کہ دروازہ کھول دو۔ اور اس شخص کو جنت کی بشارت دے دو۔ میں نے دروازہ کھولا تو حضرت ابو بکر رضؓ تھے۔ میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی خوشخبری دے دی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔ اسی طرح حدیث میں حضرت عمر رضؓ و حضرت عثمان رضؓ کا تشریف لانا مذکور ہے اسکو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔

بزرگوں کا عموماً معمول ہے کہ اپنے اوقات منضبط رکھتے ہیں۔ جن میں کچھ وقت خلوت کا بھی ہوتا ہے۔ جس میں عوام سے نہیں ملتے۔ اور کبھی کسی خادم کو بھی بٹھلا دیتے ہیں کہ عوام کو ہجوم سے روکے۔ اور کبھی اسی وقت میں خواص کو کسی خصوصیت سے اجازت دے دیتے ہیں۔

اہلِ بطالت ان معمولات پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اور بزرگوں پر شبہ، ترفع کا یا ترجیح بلا مرجح کا، اور مثل اس کے، کرتے ہیں۔ بعضے خاص خادموں کو جاتا ہوا دیکھ کر خود بھی جا گھستے ہیں۔ اور اس کے ماذون ہونے سے اپنے ماذون ہونے پر استدلال کرتے ہیں یہ حدیثیں ان سب امور کا صاف صاف فیصلہ کرتی ہیں۔ حدیث ثانی سے ضبطِ اوقات و اہتمام خلوت اور صرف خواص کو آنے دینا۔ اور حدیثِ اوّل سے خادم کے ماذون ہونے کا عام کے ماذون ہونے کو مستلزم نہ ہونا۔ اور حدیث ثالث سے بواب (دربان) کا بٹھلانا صاف معلوم ہوتا ہے۔ البتہ کسی کی ضرورت شدیدہ فوریہ کے وقت ملاقات سے عذر کرنا برا ہے۔ ورنہ علاوہ حدیث کے خود قرآن مجید کی آیت وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا (اگر تم سے کہا جائے واپس چلے جاؤ تو واپس آجاؤ) اس کی اجازت دیتی ہے کہ کسی وقت ملاقات سے عذر کر دینا بھی جائز ہے۔ اسی طرح حدیث اَنزِلوا النّاس منازلھم خواص کی ترجیح کو عوام پر جائز بتلاتی ہے

یہ تمام شبہات ناواقفی سے ہوتے ہیں۔

شیطان سے عدمِ امن

حضرت ابو درداء رضؓ سے روایت ہے کہ جناب[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اور اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ دشمنِ خدا اللعین ابلیس آگ کا ایک شعلہ لایا۔ تاکہ اس کو میرے منہ میں لگائے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔ اسی حدیث میں ہے کہ اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا کامل کیوں نہ ہوجائے مگر اس کو شیطان سے بیفکر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ ہوشیار و بیدار رہے کہ کسی موقع پر اس کو لغزش ہی نہ ڈال دے۔ اس خبیث کی جرأت دیکھیئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ عالی تک پہنچنے کا اس کو حوصلہ ہوا۔ مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام سے گناہ نہیں کرا سکتا۔ اس لیے اضرارِ جسمانی ہی کی ہوس ہوئی۔

توریہ بوقتِ خوفِ فتنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن صیاد (دجال) سے مدینہ کے کسی رستہ میں ملے آپ نے اس سے فرمایا۔ کیا تو میری رسالت کی شہادت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ کیا آپ میری رسالت کی شہادت دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاتا ہوں۔ (پس جو رسول نہیں۔ اس کی رسالت کی شہادت نہیں دیتا۔ مگر آپ نے دفعِ فتنہ کی مصلحت سے مبہم فرمایا۔) اچھا یہ تبلا کہ تجھ کو کیا نظر آتا ہے۔ کہنے لگا کہ ایک تخت پانی پر نظر آتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تجھ کو شیطان کا تخت پانی پر نظر آتا ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔

بعض بزرگ کسی حاکم یا جاہل کے فساد سے بچنے کے لیے بعض باتیں مبہم فرما دیتے ہیں۔ جس سے ظاہر پرستوں کو اخفاءِ حق کا شبہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی مصلحت معتد بہا عند الشرع سے ہو تو وہ بالکل اسی حدیث کے موافق ہے۔

---

[1] التکشف صفحہ ۴۳۰، ۴۴۹، ۴۴۲، ۴۶۵، ۴۶۶

کشف خلافِ شرع

حدیث (مندرجہ بالا) سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ باطل کو بھی کشف ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر کشف مقبول و محمود نہیں۔ چنانچہ عرش ابلیس کے انکشاف کو معرضِ مذمت میں فرمایا گیا ہے پس جو لوگ کشف کو ولایت کی علامت سمجھے ہیں۔ یا ہر کشف پر اعتماد کرتے ہیں۔ ان پر یہ حدیث دیکھ کر دونوں امر کی اصلاح واجب ہے۔

ادبِ مردہ مثل زندہ

حضرت عائشہ رضہ سے روایت ہے کہ میں اپنے اس حجرہ میں (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ مدفون ہیں بے تکلف) چلی جایا کرتی تھی۔ جب حضرت عمرؓ دفن کیے گئے۔ پھر میں وہاں بدوں اس کے کہ میرے کپڑے مجھ پر خوب لپٹے ہوں (یعنی بلا پردہ) حضرت عمرؓ سے شرم آنیکی وجہ سے کبھی نہیں گئی۔ احمد نے اس کو روایت کیا (مشکوٰۃ شریف)۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ ہر مردہ کی قبر پر حاضر ہو کر اس کا اتنا ادب کرے جتنا حالت حیات میں کرتا تھا۔ بشرط عدم تجاوز عن الشرع۔ مثلاً قبر سے اتنے فاصلہ پر بیٹھے جتنے فاصلہ سے حیات میں اس کے پاس بیٹھتا تھا۔ ونحو ذلک۔ اس حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے دیکھو حضرت عائشہ رضؓ اگر حضرت عمرؓ کے پاس ان کی حالتِ حیات میں کسی ضرورت سے تشریف لے جاتیں تو خوب پردے میں لپٹ کر جاتیں۔ اسی طرز کی رعایت ان کی قبر پر جانے کے وقت بھی کی یہ وجہ تھی اس طرح جانے کی اور یہ معنی ہیں حیاءً من عمر کے۔

فکرِ اصلاحِ خود

حضرت ابو امامہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تیز گرمی کے دن میں بقیع کی طرف چلے اور لوگ آپ کے پیچھے چلتے تھے۔ جب آپ نے جوتیوں کی آواز سنی تو آپ کے قلب پر یہ امر گراں گزرا۔ پس آپ بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو اپنے آگے کر دیا۔ تاکہ کوئی اثر برائی کا آپ کے قلب میں نہ واقع ہو جائے۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا۔

اس حدیث میں غور کرنے سے ناقص تو ناقص کاملین کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے۔ جو زعم کمال کے بعد اپنی نگرانیِ حال سے بےفکر ہو جاتے ہیں خوب

سمجھ لینا چاہیئے کہ اکابر کو فارغ ہو کر نہ بیٹھنا چاہیئے۔ مثل مبتدی کے اہتمام اصلاحِ اعمال اور اندیشۂ تغیرِ حال میں لگا رہنا چاہیئے۔ اور اسی میں خیریت ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا)

فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ خدا کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بیفکر نہیں ہوتا۔

ولنعم ما قیل (کیا خوب کہا گیا ہے) ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را | در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش | ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل کہ بڑے بڑے شہسواروں کے گھوڑوں کے پاؤں سنگلاخ وادیوں میں قلم کر دیئے گئے ہیں۔ اور ناامید بھی نہ ہو کہ کبھی رند بادہ نوش ایک ہی نالہ میں منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنی ہمت اور عبادت پر زیادہ ناز نہ کر کہ کبھی بڑے بڑے عابدین بھی اس ناز کے باعث راندۂ درگاہ ہو گئے ہیں۔ اور بالکل ناامید بھی نہ ہو کہ بعض دفعہ بے حد گنہگار بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ایک ہی آہ میں منزلِ مقصود کو پالیتے ہیں مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت خوف[1] اور امید کے بین بین رہنا چاہیئے۔)

اسی مضمون پر (اصل) کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ خاتمہ تنبیہ ہی کے مضمون پر مناسب ہے۔ تاکہ (یہ کتاب) جن علوم و اعمال کو متضمن ہے۔ یہ تخویف[2] ان کی موافقت و امتثال کے لیے بیدار کر دے۔ نیز اس میں تاسی و اقتدا ر قرآن مجید کا بھی ہے کہ سب سے آخر آیت اس کی یہ ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی پیشی میں لائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہو گا۔

---

[1] خوف کا بیان صـ ۱۳۱ پر اور رجار کا صـ ۱۴۱ پر ملاحظہ ہو۔

[2] مشتق ہے ڈرانا سے اتباع۔

۱۱۔ وصایائے جامعہ

پہلی فصل۔ وصایائے غوثیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : یہ قطبِ ربانی، غوثِ صمدانی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کی وصیتیں ہیں جو آپؒ نے اپنے صاحبزادہ کو فرمائیں۔

بیٹا! میں تجھے وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے اور خائف رہنے کی اور اپنے والدین اور جملہ مشائخ کا حق سمجھنے کی۔ کہ اس سے اللہ اپنے بندہ سے راضی ہوتا ہے۔ چھپے اور کھلے ہر حال حق کی حفاظت کر۔ اور قرآن مجید کی تلاوت مت چھوڑ۔ زبان سے اور دل سے۔ پوشیدہ اور علانیہ۔ فکر و تدبر اور حزن و بکاء کے ساتھ۔ اور سب احکام میں آیات محکمہ کی طرف رجوع کر۔ کہ قرآن مخلوق پر خدا کی حجت ہے۔ اور علمِ شریعت سے قدم نہ ہٹا۔ علمِ فقہ پڑھ۔ اور عامی اور جاہل صوفیوں میں نہ بن۔ ان بازاریوں سے بھاگ کہ وہ مسلمانوں کے حق میں دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔ اہلِ توحید و سنت کے عقائد کو لازم پکڑ اور نئی باتوں سے بچ کہ ہر نئی بات بدعت اور گمراہی ہے۔ امردوں، عورتوں، بدعتیوں، دولتمندوں اور عام آدمیوں کے ساتھ صحبت نہ رکھ کہ اس سے تیرا دین جاتا رہے گا۔ قلیل دنیا پر قناعت کر اور خلوت نشینی اختیار کر۔ اور خوف سے رویا کر۔ حلال غذا کھا کہ وہ خوبیوں کی کنجی ہے اور حرام کو ہاتھ نہ لگا۔ ورنہ قیامت کے دن تجھ کو آگ لگے گی۔ حلال کپڑا پہن کہ ایمان اور عبادت کی حلاوت پائے گا۔ ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہ اور اللہ کی پیشی میں کھڑا ہونا مت بھول۔ شب میں نماز اور دن میں روزوں کی کثرت رکھ۔ جماعت نہ چھوڑ۔ حکومت کا طالب مت ہو کہ جو شخص حکومت کو پسند کرتا ہے وہ فلاح نہیں پاتا۔ دستاویز پر دستخط نہ کر۔ حکام و سلاطین سے میل جول مت رکھ اور وصیتوں کے قصہ میں دخل نہ دے اور لوگوں سے بھاگ جیسے تو شیر سے بھاگتا ہے اور یکسوئی اختیار کر تاکہ تیرا

لہ ستونات غوثیہ مترجم مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ صہ ۵۱۔

دین برباد نہ ہو۔ سفر کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، سفر کیا کرو۔ تندرست رہو گے اور مالِ غنیمت ہاتھ آوے گا۔ مشائخ کے قلوب کا محافظ بن اور اپنی تعریفوں پر پھولو مت۔ اور جو تیری مذمت کرے اس کی بات پر رنجیدہ نہ ہو۔ مدح اور ذم تیرے نزدیک برابر رہے۔ ساری مخلوق کے ساتھ خوش خلقی اور تواضع برت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو جھکتا ہے اللہ اسے اونچا کرتے ہیں اور جو بڑا بنتا ہے اللہ اسے نیچا دکھاتے ہیں۔ ہر حالت میں نیک و بد کے ساتھ مہذب برتاؤ کر اور ساری مخلوق کو خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اپنے سے افضل سمجھ اور ان کو بنگاہِ شفقت دیکھ۔ ہنسو مت کہ ہنسنا غفلت کا اثر ہے اور اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اگر تم کو معلوم ہوتا جو مجھے معلوم ہے تو یقیناً تم کم ہنستے اور زیادہ روتے۔ اللہ کے مکر اور تدبیر سے مطمئن نہ ہو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور خوف اور امید کے درمیان زندگی گزار۔

بیٹا! دنیا چھوڑ کہ اس کی طلب میں تیرے دین کی بربادی ہے اور نماز روزہ کا پابند رہ۔ اور جس دن روزہ نہ ہو اس دن صاف ستھرا، پاکدامن مائل بحق، مہذب، خدا رسیدہ، دانشمند، صاحبِ علم، جاہل صوفیوں سے دور اور مال وجسم اور قدر ومنزلت سے مشائخ کا خادم بن اور ان کے قلوب، اوقات اور عادات کا لحاظ رکھ اور ان کی کسی بات پر اعتراض نہ کر۔ ہاں اگر وہ خلاف شریعت ہو تو ان میں ان کا اتباع مت کر۔ اگر ان پر اعتراض کریگا تو کبھی فلاح نہ پائے گا۔ لوگوں سے سوال نہ کر اور نہ ان کا مقابلہ کر۔ کل کے لیے بچا کر نہ رکھ۔ کیونکہ رزق جتنا قسمت میں ہے اللہ دے گا اور جو تجھے اللہ نے دیا ہے اس میں نفس اور دل کا سخی بن۔ بخل اور حسد سے دور رہ کہ بخیل اور حاسد دوزخ میں جائیں گے۔ اپنی حالت کسی مخلوق پر نہ کھول اور اپنا ظاہر زیادہ نہ سنوار کہ یہ باطن کی ویرانی کا اثر ہے۔ رزق کے متعلق اللہ کے وعدوں پر اعتماد رکھ کہ ہر جاندار کے رزق کا اللہ ضامن ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور کوئی زمین میں چلنے والا نہیں مگر اس کی روزی اللہ پر ہے۔ ساری مخلوق سے ناامید بن جا اور ان سے دل نہ لگا۔ حق بات کہہ اگرچہ تلخ ہو۔ ہر ایک معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر۔ اور مخلوق میں کسی کا آسرا نہ لے۔ ورنہ اللہ تجھے اپنے آستانہ سے دھکے دے گا۔ اپنے نفس سے محارب ہو

ضروری سمجھ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ آدمی کے سلام کی خوبی اس چیز کا چھوڑنا ہے جو اس کو فائدہ نہ پہنچائے۔ ساری مخلوق کا خیر خواہ بن۔ اور کھانا، پینا، سونا اور بولنا کم کر۔ بلا احتیاج نہ کھا اور بلا ضرورت نہ بول اور نہ سو۔ مگر غلبۂ نیند کے وقت۔ شب کی نماز دن اور دن کے روزوں کی کثرت رکھ۔ اور اللہ واسطے کے سماع میں بھی زیادہ نہ بیٹھ۔ کہ یہ نفاق پیدا کرتا ہے اور پھر قلب کو مار دیتا ہے اور سماع کا انکار نہ کر کہ بعض لوگ اس کے اہل بھی ہیں سماع صرف اس کو درست ہے جس کا دل زندہ اور نفس اس کا مردہ ہو۔ پھر جس کی یہ حالت ہو اس کا بھی روزہ نماز اور وظیفوں میں مشغول ہونا افضل ہے۔ چاہئے کہ تیرا دل غمگین ہو۔ تیرا بدن بیمار ہو۔ تیری آنکھ اشکبار ہو۔ تیرا عمل خالص ہو۔ تیری دعا کوشش ہو۔ تیرے کپڑے پرانے ہوں تیرے رفیق فقراء ہوں۔ تیرا گھر مسجد ہو۔ تیری جاگیر علم ہو۔ تیرا سنگھار زہد ہو اور تیرا مونس رب کریم ہو۔ کسی کو دینی بھائی نہ بنا جب تک اس کی پانچ خصلتیں تجھے متحقق نہ ہو جائیں۔ فقر کو تونگری پر ترجیح دیتا ہو۔ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہو۔ ذلت کو عزت پر ترجیح دیتا ہو۔ باطنی اور ظاہری اعمال کی نگرانی کرتا ہو اور موت کیلئے مستعد اور تیار ہو۔

بیٹا! دنیا اور اس کی آرائشوں سے دھوکہ نہ کھا۔ کہ دنیا ہریالی، آبدار اور مٹھائی ہے جو اس سے چپٹا وہ اس سے چپٹی۔ اور جو اس سے الگ ہوا وہ اس سے الگ ہوئی۔ نیز اس لئے کہ اس میں بقا نہیں ہے دن رات دنیا سے بسوئے آخرت کوچ کرنے کو تیار رہ۔

بیٹا! خلوت اختیار کر۔ بن اکیلا تنہا۔ خوف خدا سے دل میں فکر مند ہو۔ دنیا میں اپنی زندگی گزار گویا تو مسافر ہے اور اس سے باہر نکل جیسا تو اس کے اندر آیا تھا کیونکہ تجھے پتہ نہیں تیرا قیامت میں کیا نام ہوگا۔ فقط

دوسری فصل امام قشیری رح کے وصایا کا خلاصہ

اوّل عقائد موافق اہل سنت وجماعت کے درست کرے۔ پھر ضرورت کے موافق علم دین حاصل کرے۔ خواہ درس سے خواہ صحبت علماء سے۔ اور اختلافی مسائل میں احتیاط پر عمل کرے

لہ تعلیم الدین ص ۱۲۹ تا ۱۳۱۔

اور سب معاصی سے توبۂ خالص کرے۔ اہلِ حقوق کو راضی کرے۔ مال وجاہ کے تعلقات کو قطع کرے۔ اپنے شیخ کی مخالفت نہ کرے۔ نہ اس پر کوئی اعتراض کرے۔ اپنے باطنی حالات شیخ سے پوشیدہ نہ کرے۔ اور کسی سے ظاہر نہ کرے۔ اگر کچھ تصورِ شیخ کا ہو جاوے۔ فوراً معذرت کرے اور اقرار خطا کا کرے۔ تاویل نہ کرے۔ بلا ضرورتِ شدیدہ سفر نہ کرے۔ بہت ہنسے نہیں کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ اپنے پیر بھائیوں پر حسد نہ کرے۔ لڑکوں اور عورتوں کی صحبت سے بچے بلکہ ان سے زیادہ گھل مل کر باتیں بھی نہ کرے۔ جب تک صاحبِ نسبت نہ ہو جاوے کسی کو مرید نہ کرے۔ آدابِ شرع کا بہت پاس کرے مجاہدہ وعبادت میں سستی نہ کرے۔ تنہائی میں رہے اور اگر مجمع میں رہنے کا اتفاق ہو تو ان کی خدمت کرے۔ اپنے کو ان سے کم سمجھ کر برتاؤ کرے۔ دنیاداروں کی صحبت سے پرہیز رکھے۔

تیسری فصل حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وصایا کا خلاصہ

بلا ضرورت و مصلحتِ دینی اغنیاء سے صحبت نہ رکھے۔ صوفیانِ جاہل اور جاہلان عابد اور علماءِ زاہدانِ خشک اور جو محدثین اہل فقہ سے عداوت رکھیں اور جو لوگ کلام میں انہماک رکھتے ہیں، ان سب کی صحبت سے بچے اور ایسے شخص کے پاس بیٹھے جو عالم صوفی ہو دنیا کا تارک، ذکر اللہ اور اتباعِ سنت کا عاشق ہو اور مذاہب میں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دے کہ حنفیوں کا مذہب سب سے اچھا ہے یا شافعیہ کا سب سے بڑھ کر ہے۔ اپنے مذہب پر عمل کرتا رہے۔ نہ صوفیوں کے طرق میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے کہ چشتیہ کی نسبت بڑے زور کی ہے۔ دوسرا کہے نقشبندیوں میں اتباعِ سنت زیادہ ہے اور اسی قسم کے خرافات سے بچے جو لوگ مغلوب الحال ہیں یا کسی تاویل سے کوئی امر کرتے ہیں جو اس شخص کے نزدیک خلافِ سنت ہے ان کو برا بھلا نہ کہے اور خود وہی کرے جو قواعدِ شرعیہ کے موافق ہے۔

چوتھی فصل حضرت سیدنا و مرشدنا شیخ العرب والعجم الشیخ الحافظ الحاج محمد امداد اللہ صاحب (مہاجر مکی) کی وصایا کا خلاصہ

طالب حق پر لازم ہے کہ اول مسائلِ ضروری و عقائد اہلِ سنت والجماعت کے حاصل کرے۔ پھر ان رذائل سے تزکیہ کرے۔ حرص، آمل، غضب، جھوٹ، غیبت، بخل، حسد، ریا، کبر اور کینہ اور یہ اخلاق پیدا کرے۔ صبر، شکر، قناعت، علم، یقین، تفویض، توکل، رضا، تسلیم اور شرع کا پابند رہے اور اگر گناہ ہو جائے۔ جلدی کر کے نیک عمل سے تدارک کرے۔ نماز باجماعت وقت پر پڑھے۔ کسی وقت یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو۔ لذتِ ذکر پر شکر بجالائے۔ کشف و کرامات کا طالب نہ ہو۔ اپنا حال یا سخن تصوف غیر توم سے نہ کہے۔ دنیا و ما فیہا کو دل سے ترک کرے۔ خلافِ شرع فقرا کی صحبت سے بچے۔ لوگوں سے بقدر ضرورت خُلق کے ساتھ ملے۔ اپنے آپ کو سب سے کمتر جانے۔ کسی پر اعتراض نہ کرے۔ بات نرمی سے کرے، سکوت و خلوت کو محبوب رکھے۔ اوقات منضبط رکھے۔ تشویش دل میں نہ آنے دے جو کچھ پیش آوے حق کی طرف سے سمجھے۔ غیر اللہ کا خطرہ نہ آنے دے۔ دینی کاموں میں نفع پہنچاتا رہے۔ نیت خالص رکھے۔ خورد و نوش میں اعتدال رہے۔ نہ اتنا زیادہ کھائے کہ کسل ہو۔ اور نہ اس قدر کم کہ عبادت سے ضعف ہو جائے۔ کسبِ حلال افضل ہے۔ اگر توکل کرے تو بھی مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ کسی سے طمع نہ رکھے۔ نہ کسی سے امید و خوف کرے۔ حق تعالیٰ کی طلب میں بے چین رہے۔ نعمت پر شکر بجالاوے۔ فقر و فاقے سے تنگ دل نہ ہو۔ اپنے متعلقین سے نرمی برتے۔ ان کی خطا و قصور سے درگزر کرے۔ ان کا عذر قبول کرے۔ کسی کی غیبت و عیب جوئی نہ کرے۔ عیب پوشی کرے۔ اپنے عیوب کو پیشِ نظر رکھے۔ کسی سے تکرار نہ کرے۔ مہمان نواز و مسافر پرور رہے۔ غربائے و مساکین و علما و صلحا کی صحبت اختیار کرے۔ قناعت و ایثار کی عادت رکھے۔ بھوک پیاس کو محبوب سمجھے۔ کم ہنسے، زیادہ روئے۔ عذابِ الٰہی اور اس کی بے نیازی

سے لرزاں رہے۔ موت کا ہر وقت خیال رکھے روزانہ اپنے اعمال کا محاسبہ کر لیا کرے۔ نیکی پر شکر، بدی پر توبہ کرے۔ صدقِ مقال واکلِ حلال اپنا شعار کرے۔ غیر مشروع مجلس میں نہ جائے رسوم جہالت سے بچے۔ شرمگین، کم گو، کم رنج، صلاح جو، نیکو کار، نیکو رفتار، باوقار، بردبار رہے۔ ان صفات پر مغرور نہ ہو۔ اولیاء کے مزارات سے مستفید ہوتا رہے۔ گاہ گاہ عوام مسلمین کی قبور پر جا کر ایصالِ ثواب کرے۔ مرشد کا ادب و فرمانبرداری کامل طور پر بجا لاوے۔ اور ہمیشہ استقامت کی دعا کرتا رہے۔

مجددِ ملت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی چند وصیتیں اور مشورے

۱: میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علمِ دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرضِ عین ہے۔ خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت۔ بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتنِ دینیہ سے حفاظت ہو سکے جن کی آج کل بیحد کثرت ہے۔ اس میں ہرگز غفلت و کوتاہی نہ کریں۔

۲: طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ درس و تدریس پر مغرور نہ ہوں اس کا کار آمد ہونا موقوف ہے۔ اہل اللہ کی خدمت و صحبت و نظرِ عنایت پر اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں۔

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

۳: دینی یا دنیوی مضرتوں پر نظر کر کے ان امور سے خصوصیت کے ساتھ احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں (۱) شہوت و غضب کے مقتضا پر عمل نہ کریں۔ (۲) تعجیل نہایت بری چیز ہے (۳) بے مشورہ کوئی کام نہ کریں۔ (۴) غیبت قطعاً چھوڑ دیں۔ (۵) کثرتِ کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہو۔ اور کثرتِ اختلاطِ خلق بلا ضرورت شدیدہ و بلا مصلحت مطلوبہ خصوصاً

جبکہ ہر کس و ناکس کو راز دار بھی بنا لیا جائے۔ نہایت مضر چیز ہے (۶) بدول پوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھائیں۔ (۷) بدوں سخت تقاضہ کے ہمبستر نہ ہوں۔ (۸) بدوں سخت حاجت کے قرض نہ لیں۔ (۹) فضول خرچی کے پاس نہ جائیں (۱۰) غیر ضروری سامان جمع نہ کریں۔ (۱۱) سخت مزاجی و تندخوئی کی عادت نہ ڈالیں۔ رفق اور ضبط و تحمل کو اپنا شعار بنائیں۔ (۱۲) زیادہ تکلف سے بہت بچیں۔ اقوال و افعال میں بھی۔ طعام و لباس میں بھی۔ (۱۳) مقتدا کو چاہیئے کہ امراء سے بدخلقی نہ کرے۔ اور نہ زیادہ اختلاط کرے اور نہ ان کو حتی الامکان مقصود بنائے بالخصوص دینوی نفع حاصل کرنے کیلئے (۱۴) معاملات کی صفائی کو دیانات سے زیادہ مہتم بالشان سمجھیں۔ (۱۵) روایات و حکایات میں بے انتہا احتیاط کریں۔ اس میں بڑے بڑے دیندار اور فہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں۔ خواہ سمجھنے میں یا نقل کرنے میں۔ (۱۶) بلا ضرورت بالکلیہ اور ضرورت میں بلا اجازت و تجویز طبیب حاذقِ شفیق کے، کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں۔ (۱۷) زبان کی غایت درجہ ہر قسم کی معصیت و لایعنی سے احتیاط رکھیں۔ (۱۸) حق پرست رہیں اپنے قول پر جمود نہ کریں (۱۹) تعلقات نہ بڑھائیں۔ (۲۰) کسی کے دینوی معاملہ میں دخل نہ دیں۔

۴: میں اپنے تمام منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص، اپنی عمر بھر یاد کر کے، ہر روز سورۂ یٰسین شریف، یا تین بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخشدیا کرے مگر کوئی امر خلافِ سنّت، بدعات، عوام و خواص میں سے نہ کریں۔

۵: حتی الامکان دنیا و مافیہا سے جی نہ لگادیں اور کسی وقت فکرِ آخرت سے غافل نہ ہوں۔ ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اسی وقت پیامِ اجل آجائے تو کوئی فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو۔ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ اور ہر وقت یہ سمجھیں۔ ؎

"شاید ہمیں نفس نفسِ واپسیں بود"

اور علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے اور رات کے گناہوں سے قبل دن کے گناہوں سے استغفار کرتے رہیں۔ اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

۶: خاتمہ بالخیر ہونے کو تمام نعمتوں سے افضل و اکمل اعتقاد رکھیں اور ہمیشہ خصوصًا بعد پانچوں نمازوں کے نہایت لجاجت و تضرع سے اس کی دعا کیا کریں اور ایمان حاصل پر شکر کیا کریں۔ کہ حسب وعدہ لئن شکرتم لازیدنکم یہ بھی اعظم اسباب ختم بالخیر سے ہے اور اسی کے ساتھ میں اپنے لیے بھی اس دعا کیلئے درخواست کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی ایمان پر خاتمہ فرمادے۔

(از اشرف السوانح جلد سوم ملخصًا)

نوٹ

قارئین کرام سے عاجزانہ التماس ہے کہ وہ کتاب کے مرتب اور ناشر کے لیے بھی دعائے خیر کردیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا بھی خاتمہ بالخیر فرمائیں اور دارین میں سلامتی اور صلاح و فلاح سے نوازیں۔

آمین ثم آمین:

۱۲ درود شریف نعتیہ منظوم

مع ترجمہ

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رح

صلِّ یارب علیٰ رأس فریق الناس	منہ للخلق امان من بأس الباس

رحمت بھیج اے پروردگار آدمیوں کے گروہ کے سردار پر جن سے خلقت کو امن ہے زمانہ شدت میں

صل یارب علیٰ من هو فی حر غد	کل من یظمأ یسقیہ رحیق الکاس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر کہ قیامت کی گرمی میں جو پیاسا ہوگا وہ اس کو شراب طہور کا پیالہ پلائیں گے

صل یارب علی مونس کل البشر	مبدل الوحشة فی القبر باستیناس

رحمت بھیج اے پروردگار تمام لوگوں کے مونس پر جو وحشت کو قبر میں مبدل بہ انس کرنے والے ہیں۔

صل یارب علیٰ من برجاء الکرم	خص من جاء الیہ بعموم الناس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جنہوں نے امید کرم کیساتھ خاص فرمایا ہر شخص کو جو آپ کے پاس حاضر ہوا عام لوگوں کیلئے

صل یارب علیٰ روح رئیس الرسل	نقتدی نحن علیٰ ارجلہ بالرأس

رحمت بھیج اے پروردگار رئیس الرسل کی روح پر جن کے قدموں پر ہم چلتے ہیں سر کے بل

صل یارب علیٰ ذی نعم دائمة	انعم الیوم علی الخیر بلا مقیاس

رحمت بھیج اے پروردگار دائمی نعمتوں والے پر جنہوں نے انعام فرمایا خیر پر بے حساب۔

صل یارب علی صاحب شرع حسن	فرق الناس متی جاء من النسناس

رحمت بھیج اے پروردگار اچھی شریعت والے پر جنہوں نے بھلے آدمیوں کو برے آدمیوں سے ممیز کر دیا۔

صل یارب علیٰ ذی کرم امتہ	تدخل الجنة فی الحشر بلا وسواس

رحمت بھیج اے پروردگار صاحب کرم پر جن کی امت داخل جنت ہوگی حشر میں بلا وسواس۔

صل یارب علیٰ من ھو لولاہ لما ‏ ‏ لیشمل النامیۃ الکون مع الحساس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر کہ اگر وہ نہ ہوتے تو نہ شامل ہوتی قوتِ نامیہ عالم کو مع قوتِ حساسہ کے

صل یارب علیٰ من ھو من عصمتہ ‏ ‏ یعصم الحق محبّیہ من الخناس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جن کے معصوم ہونے کی برکت سے بچا لیتے ہیں حق تعالیٰ انکے محبین کو خناس سے

صل یارب علیٰ من ھو من عاذ بہ ‏ ‏ لم تصل قط الیہ یدی الوسواس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر کہ جو شخص ان کی پناہ لیتے ہیں نہیں پہنچ سکتے اس تک ہاتھ شیطان کے

صل یارب علیٰ من ھو من بارقۃ السیف قد اذھب قطعا بصر الشماس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جنہوں نے تلوار کی چمک سے بیکار کردی بالکلیہ آنکھ آفتاب پرست کی

صل یارب علیٰ صاحب نوع الشرف ‏ ‏ میز الناس بہ الفصل من الاجناس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جن کو شرف کی ایسی نوع حاصل ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے فصل کرا اجناس سے

صل یارب علیٰ من لنخیل الکرم ‏ ‏ فی ریاض الامم الیوم لنا الغراس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جو درخت کرم باغ امت میں آج ہمارے لئے لگانے والے ہیں۔

صل یارب علیٰ من بغناء الکرم ‏ ‏ من بیوت الفقراء یذھب بالافلاس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر جو کہ کرم کی تونگری سے فقراء کے گھر سے افلاس کو دور کرنے والے ہیں

صل یارب علیٰ عترتہ الطاھرۃ ‏ ‏ وعلی الصحب مع الحمزۃ والعباس

رحمت بھیج اے پروردگار آپ کی آلِ پاک پر اور اصحاب پر مع حضرت حمزہ رضؓ و حضرت عباس رضؓ کے

صل یارب علیٰ من لاویس منہ ‏ ‏ طھر القالب والقلب من الادناس

رحمت بھیج اے پروردگار اس ذات پر کہ اویس کا ان سے جسم اور قلب سب میل کچیل سے صاف ہوگیا۔

۱۳۔ شجرۂ طیبۂ چشتیۂ صابریۂ

نظمہا مولانا ذوالفقار علی الدیوبندی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللهم صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آل سیدنا ومولانا محمد وبارك وسلم

یا ذا الکرم الانعام والاحسان ارحم علی العبد الفقیر الجانی

بالشیخ فاضل عصرہ اشرف علی داعی طریقك حامل القرآن

فبمرشدی غوث الوری شمس الهدی مقدام اهل العشق والهیمان

الشیخ امداد الله القطب العلی الجاہ ذی التمکین والعرفان

وبکاشف الظلمات نور محمد وبسیدی عبد الرحیم الفانی

وبعبد باری ذاك شیخ شیوخنا وبعبد هادی للزمان امان

وبحق عضد الدین حق محمد ومحمدی ظاهر البرهان

وبحق مولانا محب الله من اعیت مدائحه وسیع بیان

بابی سعید ماجد متورع بنظام دین عارف ربانی

بجلال دین ذی المکارم والعلی وبعبد قدوس عظیم الشان

بمحمد قطب الوری وبعارف هم للوری کالماء للظمآن

وبحق عبد الحق قدس سرہ بجلال دین ذاکبیر اوان

بالشیخ شمس الدین قدوۃ عصرہ بعلاء دین صابر حقانی

؎ یہ شعر جناب مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری رح نے اضافہ کیا ہے ۔ ۱۲

؎ منصوب بنزع الخافض ۱۲

بفرید دین الحق عم فیوضه ‏ ‏ ‏ وبقطب دین ذاك قطب زمان
بمعین دین الله صاحب سره ‏ ‏ ‏ غوث الوری و بسیدی عثمان
وبحرمة الحاجی الشریف امامنا ‏ ‏ ‏ بالخواجه مودود وحید زمان
و بسیدی کهف الوری علم الهدی ‏ ‏ ‏ بو یوسف فی الفیض كالهتان
بمحمد ذی المجد والعلیاء من ‏ ‏ ‏ قد فاق عرفانا علی الاقران
وبحرمة الشیخ الکریم المقتدی ‏ ‏ ‏ بواحمد فی السر و الاعلان
وبحق بو اسحاق مرشد دهره ‏ ‏ ‏ وبحق ممشاد عدیم الثانی
بابی هبیرة ذی المقام العالی ‏ ‏ ‏ بحذیفة هو نخبة الاعیان
وبحق ابراهیم سلطان الوری ‏ ‏ ‏ بفضیل الهادی الی الاحسان
وبحق عبد الواحد الفرد الذی ‏ ‏ ‏ هو فی الغرام کطافح سکران
وبحق خیر الاصفیاء امامهم ‏ ‏ ‏ حسن و لم یر مثله العینان
وبحق مولی المؤمنین امیرهم ‏ ‏ ‏ وامام اهل الدین و الایمان
اعنی علیا خیر من وطی الثری ‏ ‏ ‏ ماوی الضعاف مجلی الاحزان
وبحق سیدنا النبی محمد ‏ ‏ ‏ هو للخلائق رحمة الرحمان
من فاق کل الخلق فضلا باذخا ‏ ‏ ‏ من ساد مجده أعالم الامکان
وبفضلك الجم العمیم الهنا ‏ ‏ ‏ یا غافرا للذنب و العصیان
قد جاء عبدك باکیا مستصرخا ‏ ‏ ‏ متوسلا باولئك الاعیان
فاغفر خطایاه و طهر قلبه ‏ ‏ ‏ عن ما سواك ایا رجاء العانی
سلط علیه العشق حتی لا یری ‏ ‏ ‏ مولای غیرك كائنا بمكان
ثم السلام علی النبی المصطفی ‏ ‏ ‏ خیر الوری و رسولك العدنانی

له عالیا ۱۲

شجرہ مختصرہ منظومہ حضرت شاہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکہ قدس سرہٗ

حمد ہے سب تیری ذاتِ کبریا کیواسطے
اور درود و نعت ختم الانبیاؑ کیواسطے

اور سب اصحاب وآلِ مجتبیٰ کیواسطے
رحم کر مجھ پر الٰہی اولیاء کے واسطے

بالخصوص[۱] ان اولیاء باصفا کے واسطے
مولوی اشرف[۱] علی شمس الہدیٰ کے واسطے

حاجی امداد اللہ[۲] ذوالعطا کے واسطے
حضرت نور محمد[۳] پر ضیا کے واسطے

حاجی عبد الرحیم[۴] اہلِ غزا کے واسطے
شیخ عبد الباری[۵] شہ بے ریا کے واسطے

شاہ عبد الہادی[۶] پیر ہُدیٰ کے واسطے
شاہ عضد الدین[۷] عزیز دوسرا کے واسطے

شہ محمد[۸] اور محمدی[۹] اتقیا کے واسطے
شہ محب اللہ[۱۰] شیخِ باصفا کے واسطے

بوسعید[۱۱] اسد اہلِ ورا کے واسطے
شہ نظام الدین[۱۲] ملجیٰ مقتدا کے واسطے

شہ جلال الدین[۱۳] جلیل اصفیا کیواسطے
عبد قدوس[۱۴] شہ صدق وصفا کیواسطے

---

[۱] : یہ شعر ایک معتقد سلسلہ نے منتسبین حضرت حکیم الامت مجدد الملت قبلہ وکعبہ ام مولانا شاہ اشرف علی صاحبؒ کے پڑھنے کے لیے بڑھا دیا ہے۔ ۱۲ شبیر علی عفی عنہ

اے خدا شیخ[15] محمد راہنما کے واسطے
شیخ احمد[16] عارفِ صاحب عطا کے واسطے[17]

احمد عبد الحق شہ ملکِ بقا کے واسطے
شہ جلال الدین[18] کبیر اولیا کے واسطے

شیخ شمس الدین[19] ترک باصفا کیواسطے
شیخ علاؤ الدین[20] صابر بارضا کیواسطے

شہ فرید الدین[21] شکر گنج بقا کے واسطے
خواجہ قطب[22] الدین مقتولِ ولا کے واسطے

شہ معین الدین[23] حبیب کبریا کے واسطے
خواجۂ عثمان[24] باشرم و حیا کے واسطے

شہ شریف[25] زندنی بااتقا کے واسطے
خواجۂ مودود[26] چشتی پارسا کے واسطے

شاہ بو یوسف[27] شہ شاہ و گدا کیواسطے
بو محمد[28] محترم شاہِ ولا کے واسطے

احمد[29] ابدال چشتی باسخا کے واسطے
شیخ ابو اسحاق[30] شامی خوش ادا کے واسطے

خواجہ ممشاد[31] علوی بو العلا کیواسطے
بو ہبیرہ[32] شاہ بصری پیشوا کے واسطے

شیخ حذیفہ[33] مرعشی شاہِ صفا کے واسطے
شیخ ابراہیم[34] ادہم بادشاہ کے واسطے

شہ فضیل[35] بن عیاض اہل دعا کیواسطے
خواجہ عبد الواحد[36] بن زید شا کے واسطے

۳۷ شیخ حسن بصری امام اولیاء کے واسطے
۳۸ ہادی عالم علی شیر خدا کے واسطے

۴ سرور عالم محمد مصطفیٰ کے واسطے
یا الٰہی اپنی ذاتِ کبریا کے واسطے

یا حق اپنے عاشقانِ باوفا کے واسطے
یا رب اپنے رحم و احسان و عطا کے واسطے

کر رہائی کا سبب اس مبتلا کے واسطے
کون ہے تیرے سوا مجھ بے نوا کے واسطے

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے
ہے عصائے آہ مجھ بے دست و پا کے واسطے

بخش وہ نعمت جو کام آوے سدا کے واسطے
اپنے لطف و رحمتِ بے انتہا کے واسطے

شجرۂ امدادیہ ختم شد

شجرۂ منظومہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ

یاالٰہی[۱] بہرِ جاہ ہر نبی و ہر ولی — بہرِ حضرت مرشدی اشرف علی تھانوی[۲]
بہر امداد و بنور حضرت عبدالرحیم — عبد باری، عبد ہادی عضد دین مکی ولی
ہم محمدی و محب اللہ و شاہِ بوسعید — ہم نظام الدین جلال و عبد قدوس احمدی
ہم محمد عارف و ہم عبدِ حق شیخِ جلال — شمس دیں ترک و علاء الدین فرید و جودہنی
قطب دین و ہم معین الدین عثمان و شریف — ہم مودود و ابو یوسف محمد احمدی
بو سحاق و ہم ممشاد و ہبیرہ نامور — ہم حذیفہ و ابنِ ادہم ہم فضیل مرشدی
عبد واحد ہم حسن بصری علی فخر دین — سید الکونین فخر العالمین بشریٰ نبی[۲]

پاک کن قلب مرا تو از خیالِ غیرِ خویش
بہرِ ذاتِ خود شفایم دہ ز امراضِ دلی

---

[۱] یہ شعر ایک معتقد نے منتسبین حضرت مجدد الملت مولانا الشاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پڑھنے کیلئے بڑھا دیا ہے۔ ۱۲۔ محمد دین چشتی اشرفی